ماہنامہ
کرن
فروری 2020

حمد — حکیم خان حکیم — 9
نعت — تنویر پھول — 9

انٹرویو

آغا مصطفیٰ احسن سے ملاقات — شاہین رشید — 10
میری بھی سنیے — مریم نور — 15
آواز کی دنیا سے — حماد حسین — 19
مقابل ہے آئینہ — شہلا گل سحر — 24

ناول

میرے ہم نفس میرے ہم نوا — آسیہ مرزا — 26
ہوائیں رخ بدل گئیں — نگہت عبداللہ — 156

تکمل ناول

پھر اسی راہ گزر پر — منعم ملک — 52
کچھ لمحے ہم پر قرض — سدرہ حیات — 176
ساگر کنارے — ام طیفور — 110

ناولٹ

نازک آبگینہ ہوں میں — نظیر فاطمہ — 86

افسانے

آسان — نعیمہ ناز — 47
صفائی پسند — عندلیب زہرا — 83
اک نئی کہانی — اُم ہانی — 107
پھل فروش — سندس جبیں — 153
نظریں چرانا — نرمین سرمد — 172
میرے مہربان — ثمینہ مشتاق — 223

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور اداروں خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

آسیہ مرزا

میرے ہم نفس میرے ہم نوا

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ راحیلہ بیگم کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت۔ اولاد کی تربیت میں کہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابر و شاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا دردِ سر تو ارسلہ تھی۔

نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا ہے لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔

مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں، رومی اور آبص۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بے زار ہے۔

چوتھی قسط

"اجنبی لوگ ہیں، زیادہ تو کیا کچھ بھی نہیں جانتے ان کے بارے میں۔ چند دنوں کی دوستی میں بیٹی تو الو کر نہیں دے دیں گے۔ میرا دل تو ہولا جا رہا ہے۔" اماں رات ابا سے ذکر کر رہی تھیں ارسلہ کے آئے رشتہ کا ساتھ ہی ساتھ اپنی رائے کا اظہار بھی کر رہی تھیں۔

"غیروں سے اپنے ہی اچھے۔ بھلے سے لڑکی کم کھائے، کم اچھا پہنے مگر تسلی تو رہتی ہے۔"

اماں کے نادر خیالات پر ابا سر ہلا رہے تھے۔ ادھر ارسلہ کا خون خشک ہو رہا تھا۔ اماں کی باتیں آگ میں لپٹی گولیاں تھیں جو تڑا تڑ اس کے سینے میں پیوست ہو رہی تھیں۔ وہ دروازے کے باہر کھڑی اماں کے نادر خیالات سے سلگ رہی تھی۔

"مانو تھوڑا بہت انٹیلیکٹ کا فرق ہو تو سمجھ میں آتا ہے۔ یہاں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"یہ تو ہے، خیر..... ابھی ہم نے کون سا جواب دینا ہے۔ سوچیں گے۔" ابا مسہری پر لیٹ گئے۔

"مجھے تو سوچنا بھی نہیں ہے۔ جب دل ہی راضی نہ ہو تو..... سوچ رہی ہوں نیلو سے فون کروا کے انہیں انکار کہلوا دیتی ہوں۔ بے وجہ گھر آئیں گے، چلیں آپ آرام کریں۔"

اماں لائٹیں بند کرنے لگیں۔ ابا کی آنکھیں تھکن اور نیند کے غلبے سے بند ہو رہی تھیں۔

"ارے واہ، ایسے کیسے انکار کر دیں گی اماں!" ارسلہ دانت پیستی، جلبلاتی وہاں سے پلٹ کر اپنے مشترکہ روم میں چلی آئی۔ جہاں اریبہ اپنی مسہری پر گہری نیند میں غرق تھی اور نیلو حسب عادت بچن کا پھیلاوا سمیٹ رہی تھی۔ وہ اپنی مسہری پر بیٹھ گئی مگر دماغ میں کھونگن سی ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا ہر چیز الٹ پلٹ کر دے۔

"لو ایک خوشی کا در کھلا ہے تو اماں ظالم سماج بن کر کھڑی ہو گئی ہیں۔ ان کے وہموں، اندیشوں پر نیلو قربان ہوتی رہے، ارسلہ حیات نہیں ہوتی۔ ارے واہ، زندگی میری ہے، فیصلہ بھی میرا ہوگا۔" اس کی سوچوں میں بغاوت کے بگولے اٹھنے لگے۔

رات مشکل سے گزری۔ دوسرے دن ہی وہ نیلوفر سے الجھ پڑی۔ جانتی تھی اماں نیلوفر کے ذریعے ہی موہٹ جیلانی کو انکار کہلوائیں گی۔ اس نے بھی نیلو کو ہی ذریعہ بنایا۔

"بات سنو۔ اماں سے ذرا کہہ دینا، اپنے نادر خیالات اپنے تک ہی رکھیں اور اپنے وسوسے، اندیشے میرے لیے زیادہ نہ پالا کریں۔ شادی مجھے کرنی ہے تو مرضی بھی میری ہوگی۔ ایویں گھر آئی خوشی کو لوٹا دیں۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ اماں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی ہیں۔ بھلا ہم ان لوگوں کو کتنا جانتے ہیں۔" نیلوفر نے چائے کا مگ ہونٹوں سے ہٹا کر اس کی طرف اچنبھے سے دیکھا۔

"جاننے کے لیے سالوں اور صدیوں کا سفر طے کرنا ضروری نہیں ہے۔" اس نے چاول پلیٹ میں نکالے اور آرام سے تخت پر بیٹھ کر کھانے لگی۔

"تم احمر کو بھلا کتنا جانتی ہو۔ عمر بھر کا رشتہ جوڑ بیٹھی ہو۔"

"کیا بکواس ہے؟" اس نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا۔ "میں نہ سہی، اماں تو جانتی تھیں۔ اماں کی چچی کے جان پہچان والے لوگ تھے۔"

"چلو، تم راضی تھیں نا۔ تم سے اماں نے تمہاری رضامندی معلوم کی تھی نا۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ اس رشتے پر راضی ہو۔" نیلوفر اسے یک ٹک دیکھنے لگی۔

ارسلہ نے پلیٹ خالی کر کے ایک طرف رکھی اور اٹھ کر بیسن میں ہاتھ دھونے لگی۔

"وہ بالکل اجنبی ہیں ہمارے لیے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے، جب رشتہ جڑ جائے گا تو اجنبیت ختم ہو جائے گی۔ رشتے داری میں بدل جائے گی۔

ہمیں اور ہم انہیں جاننے لگیں گے۔'' اس کا لہجہ بے لچک تھا۔ اس کے چہرے پر بھی اپنی بات منوا لینے کا عزم جھلکورے لے رہا تھا۔

نیلوفر کے چہرے پر اضطراب پھیلنے لگا۔

''اس کا مطلب ہے، تم آنکھیں بند کر کے کود جانا چاہتی ہو۔''

نیلوفر سے مزید چائے نہ پی جا رہی تھی، اس نے مگ ایک طرف رکھ دیا۔

''ہاں بالکل، اس لیے کہ کھلی آنکھوں سے میں نے سوائے غربت، تنگ دستی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ہی دیکھے ہیں اب تک۔ اب جبکہ بند آنکھوں کے پار اتنے حسین روپہلے نظارے دکھائی دے رہے ہیں تو کون احمق آنکھیں کھولے گا۔ کود ہی جاؤں گی اور دیکھنا پار بھی لگ جاؤں گی۔''

''میرے خدا۔'' نیلوفر اس کی باتوں پر شدید ذہنی دباؤ کا شکار نظر آنے لگی۔

''غربت کوئی طعنہ نہیں ہے نہ عیب ہے یہ تو بس ایک امتحان ہے اور اس میں ثابت قدم رہنے والوں کے لیے انعام بھی ہے، جو خدا نے رکھا ہے۔''

''تو یہ انعام بھی ہو سکتا ہے میرا..... میرے صبر جمیل کا۔ میری محرومیوں کا۔'' وہ انتہائی مسکین صورت بنا کر بولی۔

نیلوفر نے چبھتی نظروں سے دیکھا۔

''ابھی ہم جیسے صبر کے مقام سے گزرے ہی کہاں ہیں۔ محرومیاں دیکھی ہی کب ہیں..... خیر، میرا مقصد تمہیں سمجھانا ہے۔ تم بہن ہو، مجھے عزیز ہو۔ تمہاری خوشیاں، ہماری خوشیاں ہیں۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے نا، خوشیاں بھی بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتیں اور میں ناشکری، ناقدری نہیں ہوں کہ گھر آئی خوشیوں کو اماں ابا کے فیصلوں کے ہاتھوں لوٹا دوں گی۔'' وہ اپنے ارادوں میں ڈٹی ہوئی تھی، پھر انتہائی بدتمیزی سے بولی۔ ''اماں ابا آج تک خود تو ہمارے لیے کچھ اچھا کر نہیں سکے، نہ کر سکیں گے۔ آپ کی طرح مجھے بھی ایک کنگلے سے بیاہ دیں گے۔ خاندانی نام، عزت و نمود کے ہاتھوں..... اور میں کم از کم آپ کی طرح خوار ہونا پسند نہیں کروں گی۔ ان کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنوں گی۔ یہ بات آپ اماں کو بھی سمجھا دیں تو اچھا ہے۔''

وہ اس چہار دیواری اور حالات سے متنفر تو پہلے ہی تھی، اب تو مکمل باغی نظر آ رہی تھی۔

جب سیلاب کا زور ہو تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کے راستے میں آنے والے طاقت ور درخت بھی اکھڑ جاتے ہیں، کیا سکندر..... جو اس سیلاب کے آگے ننھے پودے کی مانند ہی تو تھا۔

نیلوفر کو اپنے اعصاب اس کی باتوں سے شدید تناؤ میں محسوس ہونے لگے۔ سکندر کا خیال بجلی کی طرح کوندا۔

''سکندر کا کیا ہوگا ارسلہ! اس کا نہیں سوچو گی۔'' وہ اسی ذہنی دباؤ میں بولی۔

''سکندر کے نام پر ارسلہ گویا ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔ اس کے چہرے پر جہاں بھر کی بے زاری برسنے لگی۔

''سکندر..... یہ سکندر کہاں سے آ گیا بیچ میں۔''

''وہ ہمیشہ سے ہی ہے بیچ میں..... بلکہ تمہارے سامنے، تمہارے آگے پیچھے۔ یہ بات تم نظر انداز کر رہی ہو۔'' نیلوفر کا لہجہ جتانے والا تھا۔

''سکندر..... سکندر..... آخر یہ دو ٹکے کا شخص..... میرا طلب گار کیوں بنا پھرتا ہے۔'' وہ کرسی دھکیل کر جھٹکے سے اٹھی۔ ''میری اس سے کوئی کمٹمنٹ تو نہیں ہے، نہ میں اس کی قیدی ہوں۔ میری اپنی زندگی ہے، مرضی جس کے ساتھ اور جس طرح چاہوں گزاروں۔''

وہ چیخی اور جیسے ہی پلٹی اماں کو دروازے کے ایک طرف کھڑے دیکھ کر اس کی زبان رک گئی۔ ادھر نیلوفر کی

حالت پتلی ہوگئی۔ وہ یوں گھبرا گئی جیسے یہ زہر وہ خود اگل رہی ہو۔ اچانک اس کے اعصاب پر شدید جھٹکا لگا۔ نے آگے بڑھ کر ارسلہ کے منہ پر زور دار تمانچا لگا دیا تھا۔ یہ تمانچا اتنا بھرپور اور اچانک تھا کہ وہ سنبھل نہ پائی اور گھما کر دیوار سے جا لگی۔

"بے حیا..... بدزبان..... یہ تربیت کی ہے میں نے تمہاری۔ یہ سکھایا ہے میں نے تمہیں..... جو منہ آتا ہے بکے چلی جاتی ہو۔ نہ لحاظ ہے نہ تمیز۔ نہ اخلاق نہ رکھ رکھاؤ۔" اماں کا جلال قابل دید تھا۔

نیلوفر کا سناٹا ٹوٹا تو وہ دوڑ کر اماں کو بلانے لگیں۔

"کیا نہیں ملا تمہیں اس گھر میں..... عزت، محبت، تحفظ..... اور کیا چاہیے تھا۔ جب دیکھو غربت کا رونا روتی رہتی ہو۔ پیسے کے لالچ نے اندھا کر دیا ہے تمہیں۔ عورت کے لیے عزت اور تحفظ سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ مگر یہ بات تمہاری موٹی عقل میں آئے تب ناں۔"

"اچھا بس کریں اماں۔" نیلوفر نے انہیں تھام کر وہاں سے ہٹا کر تخت پر بٹھا دیا اور پانی کا گلاس بھرنے لگی۔

"بس کریں اماں! عزت..... تحفظ....." تمانچے کی تکلیف کا احساس کم ہوا تو وہ دوبارہ میدان میں آ پڑی۔ "ان چیزوں کو آپ نے بس زندگی کی ضرورتیں سمجھ لیا تھا۔ ساری عمر گھٹ گھٹ کر، ترس ترس کر زندگی گزاری جانی مجھ سے۔ عزت..... روٹی ہے نہ چھت، نہ ہی زندگی کی تمام آسائش کا نام۔" وہ زخمی پن کی انتہائی بے رحمی سے کہتی اماں کے سینے میں تیر چلا گئی۔ وہ اس بل انتہائی منہ پھٹ، بدگو اور بدزبان دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حقارت، نفرت، بے زاری لپک رہی تھی۔

اماں کو شدید صدمے کے دھچکے نے کچھ دیر تک کسی بھی ردعمل سے باز رکھا۔ نیلوفر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے اسے دوسرے کمرے میں لے جانا چاہا۔

"بس چپ کر جاؤ۔ خدا کے لیے، اماں کا لحاظ کر کے ہی چپ کر جاؤ۔" اس کا لہجہ التجائی تھا۔

"کیوں..... کیوں چپ کر جاؤں....." وہ اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے بے مروت لہجے میں چیخی۔ "مجھے بھی حق ہے پر آسائش زندگی گزارنے کا، اپنی مرضی سے جینے کا۔ عزت، محبت، یہ سب آپ کے خوابوں کی دنیا اور آپ کا معیار اور ترجیح ہوگی، میری نہیں۔ میری ترجیح صرف پیسہ ہے، دولت..... ڈھیر ساری دولت..... اور دولت مند ہونا۔ میں چھوٹی چھوٹی خواہشات پر ساری زندگی ترسنا نہیں چاہتی۔" وہ نیلوفر کو ایک طرف دھکیل کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ساتھ ساتھ دل فگار جملے پھینکتی گئی تھی۔

"اونہہ..... دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے دے کر یہ والدین سمجھ رہے ہیں، اولاد کا حق ادا کر دیا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے، ہماری تو بنیادی ضروریات ہی پوری نہیں ہو پا رہی ہیں۔ آسائش کا سوال ہی کہاں پیدا ہوگا اس گھر میں۔" اس نے دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا۔

نیلوفر نے دل گرفتگی سے بند دروازے کو دیکھا پھر پلٹ کر اماں کو۔ جن کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا، جیسے کسی ناقابل برداشت درد کو ضبط کر رہی ہوں۔ نیلوفر نظریں چرائے اور صحن میں بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ الٹی پڑی کرسی اٹھا کر جگہ پر رکھی۔ کشن اٹھا کر تخت پر رکھے۔ اس وقت اماں اور اس کے دل پر ایک ہی رنج ہلکورے لے رہا تھا، فضا میں بوجھل پن سا چھایا ہوا تھا۔

☆☆☆

ارسلہ کے گھر تک کا راستہ کاٹتے ہوئے سکندر کا دل ہزار وہموں، اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ کوئی جوش، امنگ، کوئی ولولہ نہ تھا..... بس ایک امید پردہ امی کو لے کر آ رہا تھا شاید بخت آزمانے۔ نیلوفر کے جملوں نے کی ساری امنگ چھین لی تھی۔ بڑا گہرا زخم ڈال دیا تھا اس امید نے جس پر وہ تکیہ کیے بیٹھا تھا۔

ہاں..... امید۔ اسے اب یہ بات سچ ہی لگ رہی تھی کہ امید بھی کانچ کی کوئی چوڑی ہی ہے کم بخت اور جو ذرا سی کوتاہی سے ٹوٹ گئی تو زخم ڈال دیتی ہے اور اسے بھی اپنی روح کی کلائی میں یہ ٹوٹی ہوئی چوڑی گڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں ایک بار پھر دولت کو محبت پر سچ پاتے دیکھ رہی ہوں سکندر۔ یہ بازی تمہارے ہاتھ سے نکل چکی ہے، تاہم چلو بخت آزما کر دیکھ لو۔''

اور وہ بخت آزمانے سچ مچ چلا آیا تھا۔

ادھر وہ دو دن سے کمرے میں بند تھی۔ کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔ اباتذبذب کا شکار تھے۔ اماں نالاں تھیں۔ فون پر عقیلہ نے سکندر کے رشتے کی بات کی تھی۔ اماں نے انہیں جب آبص کے رشتے کا بتایا تھا، وہ تڑپ گئی تھیں۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے راحیلہ! ارسلہ تو میرے سکندر کی ہی دلہن بنے گی۔ میری بہو۔''

اماں سخی ہاری بہن کو ساری روداد بتانے لگیں۔ وہ گھر آئیں تو انہیں ارسلہ کی ہٹ دھرمی، اس کی ضد اور اس کے اونچے آدرش کا بتانے لگیں۔

''بس ضد پکڑ لی ہے، اونچے گھرانے میں ہی شادی کروں گی۔ ورنہ خودکشی کر لوں گی، بھاگ جاؤں گی یا عمر بھر شادی نہیں کروں گی۔ ایسے ایسے الفاظ اٹھاتی ہے کہ دل دہل جاتا ہے۔'' اماں آب دیدہ ہو گئیں۔

سکندر وہاں سے اٹھ کر نیلوفر کے پاس چلا آیا جو مشین پر قمیص سی رہی تھی مگر سی نہ پا رہی تھی۔ دل مضمحل سا ہو رہا تھا۔ دوسری بار اسے ادھیڑنا پڑا تھا۔

''اسے ایسا کرنے سے روک لو نیلو!'' سکندر کے لہجے میں سارے جہاں کی لجاجت تھی، منت سماجت تھی۔ جیسے نیلوفر کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی ہو اور وہ اس کے کہنے پر گھما دے گی۔

''وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ میری محبت سے وہ لاعلم تو نہیں ہے۔ سب جانتی ہے وہ کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔''

جواباً نیلو مجروح انداز میں مسکرا دی۔

''محبت.....'' اس نے بے بسی سے قمیص کو مشین سے کھینچ کر، گولا سا بنا کر ایک طرف ڈال دی۔

''سکندر! یا تو تم دولت کا ڈھیر لگا دیتے یا پھر اپنی محبت کو اتنا مضبوط کرتے کہ وہ اسے گرا نہ سکتی۔'' وہ طنز نہیں کر رہی تھی، اس کی محبت کا مذاق نہیں اڑا رہی تھی۔ بس اس کی بے بسی، بے اختیاری پر جھلس سی رہی تھی۔

''کیا مطلب..... تم کہنا چاہتی ہو کہ میری محبت کمزور ہے۔'' سکندر کے دل کو دھچکا سا لگا۔

''نہیں، اس کے خواب بہت اونچے..... اس کی خواہشات کی دیواریں بہت بلند اور مضبوط ہیں۔ تمہاری محبت کا کوئی وار بھی اسے نہ ہلا سکا۔'' وہ مجروح انداز میں ہنس دی۔

''اب ایسے تو مت کہو نیلو!'' وہ اس کی سفاکی پر کٹ کر رہ گیا۔ ''میں بخت آزمانے آیا ہوں۔ تم دیکھنا میں اسے منا لوں گا۔'' سکندر کے لہجے میں پست سی امید تھی، جیسے بجھتا ہوا دیا یک دم بھڑک کر لو دے اٹھا ہو۔

''اب بخت آزمانے کا وقت ختم ہوا سکندر اعظم! اب نصیب کے فیصلوں کو قبول کرنے کا وقت ہے۔'' وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی اور دل گرفتگی سے سکندر کے دھواں ہوتے چہرے کو دیکھا۔

''یہ تو اس وقت آزماتے جب کوئی آپشن نہیں تھا۔ اب تو اس کے سامنے اس کے خوابوں کی تعبیر کسی گلستان کی طرح پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی ہے اسے۔ وہ پلٹ کر تمہاری طرف کیوں دیکھے گی۔'' اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ حالانکہ وہ کبھی اتنی سخت گیر، کڑوی نہ تھی، ہمیشہ نرم مخمل مزاج اور بااخلاق تھی مگر آج وہ سکندر کی کم بختی پر افسردہ تھی۔

''گلستان سامنے ہو تو چولستان کا سفر کون کرتا ہے۔''

"کیا..... تم..... میری محبت کو دولت کے سامنے اتنا پست سمجھ رہی ہو۔" سکندر تڑپ کر رہ گیا۔

"مسئلہ یہ ہے سکندر! کہ محبت کبھی اس کے نزدیک اہم نہیں رہی۔ وہ محبت کے بغیر بھی بہت اچھی طرح زندگی رہ سکتی ہے۔ وہ مچھلی نہیں ہے کہ اسے محبت کے پانی کی ضرورت ہو..... وہ مگر مچھ ہے، خشکی پر بھی سو جاتی ہے بہت گہری اور آرام دہ نیند لے سکتی ہے۔" نیلوفر جیسے کسی اذیت کی اتھاہ میں ڈوب کر بولی تھی۔ اسے سکندر غمزدگی ضرب کی طرح لگ رہی تھی۔

سکندر ریک دم لکڑی کے اسٹول سے کھڑا ہو گیا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر آپ لوگوں کو اس کی بات مان لینی چاہیے۔ جیلانی ہاؤس سے اس کے خوابوں کی تعبیر مل سکتی ہے۔ اسے وہ ساری خوشیاں مل سکتی ہیں جس کی اس نے تمنا کی ہے تو پھر اس کی راہ میں رکاوٹ بننا سراسر ہے۔ اسے جینے دینا چاہیے، اس کی مرضی اور منشاء سے۔"

وہ بظاہر خود کو سنبھال رہا تھا مگر اس کے دل ٹوٹنے، بکھرنے کا عمل تو اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔ وہ رکا اور پلٹ کر باہر نکل گیا۔

اس کا دل ٹوٹا ہی نہیں تھا، اجڑ بھی گیا تھا۔ کتنا پاگل تھا وہ بھی۔ سمجھتا رہا کہ محبت تو وہ طاقت ور جذبہ ہے دنیا کو تسخیر کر لیتا ہے لیکن وہ تو اپنی بے لوث محبت سے دنیا تو کیا، ایک دل کو بھی نہ جیت پایا تھا۔

ہاں شاید دولت ہی سب کچھ ہے۔

ٹھیک ہی کہا ہے کسی کہنے والے نے..... "جوش وحشت میں کوہ و بیاباں طے کرنا سودائے زلف میں گریباں تار کرنا، الفت سیم براں میں اشک بار رہنا۔ سب بے سود ہے۔ زور زر سے ماہرویاں غلام باوام اور آہوان دیدہ بھی رام ہو جاتے ہیں۔

زور زر سے ہو گیا وہ یار شعلہ بار سرد
کسی قدر تاثیر میں ہے شربت "دینار" سرد

اس کے دل میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ گلی میں بکھرے چپاکے سوکھے پتے اس کے قدموں تلے چرچرا کر اس کے ہمراہ گویا بین کرنے لگے۔

☆☆☆

"ارسلا! تمہیں اپنے دل کی ہر خواہش پوری کرنے اور اپنے لیے اپنی پسند کا راستہ چننے کا پورا حق حاصل ہے۔ یہ حق تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میری محبت بھی نہیں۔ دولت کی خوشبو بڑی طاقت ور ہوتی ہے۔ خدا کرے اس خوشبو سے تم اپنی روح کو شاد کر سکو....." سکندر نے ارسلہ کے موبائل پر میسج بھیجا تھا، جسے پڑھ کر وہ ہنس دی۔ شکر "ایسا ہی ہو گا سکندر! میری روح یقیناً شاد رہے گی اور میری دعا ہے تمہیں بھی تمہاری محبت کی قدر دان مل جائے۔"

جواباً اس نے بھی لکھ دیا اور موبائل ایک طرف ڈال دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ بے حد طمانیت کا ساتھ جبکہ دوسری مسہری پر لیٹی نیلوفر کروٹیں بدل رہی تھی اور سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ "ایک محبت بھرا دل توڑ کر وہ کیسے اتنی مطمئن ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں کو ناراض، غم زدہ کر کے وہ کتنی آسودہ تھی۔ ایک اجنبی شخص جس ابھی تک دیکھا تک نہ تھا، اس سے ملی تک نہ تھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی سوائے اس کے کہ وہ ایک امیر زادہ ہے وہ عمر بھر زندگی گزارنے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔

اس نے اس کے پرسکون وجود پر ایک نظر ڈال کر آنکھیں زور سے میچ لیں۔ بند آنکھوں کے اندر تیرتا ہوا باہر نکل آیا۔

☆☆☆

آبس کے کوٹھی میں لوٹ آنے پر پوری کوٹھی میں رونق سی پیدا ہوگئی تھی۔ مہوش کے تو پیر مارے خوشی کے زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ وہ آبس کو یہاں تک لانے کا سہرا نصیر کاکا کے سر دے رہی تھیں۔

وہ آ تو گیا تھا مگر اس کا رویہ ابھی بے مہر سا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی کوئی رمق نہ تھی۔ مگر مہوش کے لیے یہی غنیمت تھا۔ وہ آ گیا تھا، لوٹ آیا تھا۔ ان کی ہر بات بے چوں وچرا مان رہا تھا۔

رومی نے اسے ارسلہ کی بہت سی تصویریں دکھائیں، وہ حیران ہوا۔ اتنی خوب صورت اور مکمل لڑکی ایک معذور آدمی سے شادی پر کیسے راضی ہوگئی۔ اس حیرانی کا اس نے برملا اظہار بھی کیا۔

''وہ میری بہت اچھی فرینڈ ہے آبس بھائی! بہت اچھی فیملی ہے ان کی۔'' رومی کے لہجے میں ارسلہ کے لیے حقیقی توصیف تھی۔

''اسی لیے تو حیران ہوں، وہ مجھ سے شادی پر راضی کیسے ہوئی۔ کون سے سبز خواب دکھائے ہیں، اسے تم نے اور مام نے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

اس کی آنکھوں میں بددلی اور بدگمانی جھلک رہی تھی۔ اس نے موبائل ایک طرف ڈال دیا۔

''اول تو مجھے حسن اور محبت دونوں میں سے کسی کی بھی طلب نہیں۔ ہاں، کچھ اور کوالٹیز ہیں، اس کے اندر تو بتاؤ۔'' وہ رومی کو چھیڑنے لگا جبکہ رومی دل برداشتہ نظر آنے لگی۔

''ایک تجربہ کر کے دیکھ لیں، برت لیں۔'' وہ قائل کرتے ہوئے بولی۔

''اور ناکام ہوگیا پھر.....''

''پلیز گاڈ سیک۔ اب اتنے بے رحم تو نہ بنیں۔ اپنے لیے۔'' رومی یکلخت رو پڑی اور خفا ہو کر کرسی سے اٹھنے لگی تو آبس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور نرمی سے دوبارہ اسے کرسی پر بٹھا دیا۔

''پگلی! یقین کرو، فقط تمہارے لیے پلٹ کر آیا ہوں۔ اور تمہارا خیال نہ ہوتا تو کبھی پلٹ کر نہ آتا یہاں۔'' وہ اس کے سر پر پیار سے تھپکی دینے لگا۔

''تو پھر ایسی باتیں کر کے مجھے ہرٹ کیوں کرتے ہیں۔'' رومی نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہرٹ نہیں کرنا چاہتا اور سچ تو یہ ہے رومی! میرا دل بالکل اچاٹ ہوگیا ہے۔ تم زندگی کی طرف کھینچنا چاہتی ہو مجھے۔ جبکہ زندگی میرے لیے بے کار سی شے ہو کر رہ گئی۔ بے معنی اور میں اس کا بے کار عضو ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر صوفے کی پشت پر سر ٹکا لیا۔

''ایسا نہیں ہے آبس بھائی!'' رومی ان کے ہاتھ پر بے اختیار اپنے لب رکھ کر آنسو بہانے لگی۔ ''بے شک مام کا یہ فیصلہ آپ کو ایک انتہا پسند اور ظالمانہ فیصلہ لگ رہا ہے مگر ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ بلیوی، میں نے آپ کے لیے ایک ہیرا چنا ہے، ایسا ہیرا جسے پا کر آپ کی زندگی چمک اٹھے گی۔ اسے پا کر آپ سب کچھ، ہر دکھ بھول جائیں گے۔'' وہ کہنا چاہتی تھی۔ نادیہ شاہ کو بھی بھول جائیں گے مگر وہ دانستہ رک گئی۔ وہ نادیہ شاہ کا تذکرہ کر کے آبس کے دل کو ماضی کی کسی یاد میں دھکیلنا نہیں چاہتی تھی۔

آبس اس کی معصومانہ محبت، اس کی غم گساری اور دل داری پر شفقت سے مسکرا دیا۔

''سچ کہوں رومی! تمہاری محبت، تمہارا پیار، سر آنکھوں پر..... مگر میں اندر سے بہت خالی ہوں۔ میرے پاس آنے والی اس لڑکی کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ اسٹک پر دباؤ ڈال کر صوفے سے اٹھ گیا اور چلتا ہوا بیڈ تک آیا۔ رومی بھی کرسی سے اٹھ گئی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور سلیپر سے پیر آزاد کرتے ہوئے بولا۔

''خالی دل..... خالی مکان کی طرح ہوتا ہے۔ بے آباد مکان..... جس پر چاہے جتنے بھی رنگ پھیرو۔ اس

کا سناٹا دور نہیں ہوتا۔ گونجتا رہتا ہے، چیختا رہتا ہے۔ بہت شور مچاتا ہے یہ سناٹا۔"

وہ دھیرے سے لیٹ گیا۔ روی جلدی سے لحاف کھول کر اس کے پیروں پر ڈالنے لگی اور بھیگی بھیگی پلکیں جھپک کر مسکرا دی۔

"جاؤ، سو جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ ہم صبح باتیں کریں گے۔" اس نے پیار سے روی سے کہا۔ اس کچھ کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولا۔ "آئی پرامس۔ تمہاری ساری باتیں کل ضرور سنوں گا اور مان بھی لوں گا۔"

روی نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور بس مسکرا دی اور گڈ نائٹ کہہ کر روم سے باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے وہ اس کے سرہانے ارسلہ کی ایک تصویر رکھ گئی تھی۔ مگر وہ تو آنکھیں بند کر کے، کسی اور کے ہی تصور میں کھو چکا تھا۔

☆☆☆

میرے ہم نفس! میرے ہم نوا! مجھے دوست بن کے دغا نہ دے
میں ہوں درد عشق سے جاں بلب، مجھے زندگی کی دعا نہ دے
میں غم جہاں سے نڈھال ہوں کہ سراپا حزن و ملال ہوں
جو لکھے ہیں میرے نصیب میں، وہ الم کسی کو خدا نہ دے
نہ یہ زندگی میری زندگی، نہ یہ داستان میری داستاں
میں خیال و وہم سے دور ہوں، مجھے آج کوئی صدا نہ دے

وہ دونوں ایک درمیانی درجے کے کیفے میں بیٹھے تھے جو نادیہ شاہ کے کالج سے نزدیک ہی تھا۔ اس نے بصد اصرار سے آج بلایا تھا اور وہ بھی آج آ تو گئی تھی مگر یہ سوچ کر کہ آبص کو سمجھا دے گی، آئندہ وہ اس سے ملنے پر اصرار نہ کرے گا۔ وہ فون پر بات کر لیا کرے گی۔ وہ برگر کا آرڈر دے کر آیا تو وہ غزل کے بولوں میں گم تھی۔ ہلکی آواز میں بجتی یہ غزل کسی کی توجہ کا مرکز بنی ہو نہ بنی ہو، نادیہ شاہ پوری طرح گم تھی۔

مجھے چھوڑ دے میرے حال پر، تیرا کیا بھروسا اے چارہ گر
یہ تیری نوازش مختصر میرا درد اور بڑھا نہ دیں

"خیریت۔" اس نے اس کے آگے بڑھتے ہوئے میز پر ہلکے سے انگلیاں بجائیں۔ "تم تو بالکل ڈوب گئی ہو۔"

وہ چونکی اور سر اٹھا کر آبص کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ پھر ہلکی سانس کھینچ کر کرسی کی بے آ پشت سے ٹیک لگا لی۔

میرے داغ دل سے ہے روشنی، یہی روشنی میری زندگی
مجھے ڈر ہے، اے میرے چارہ گر، یہ چراغ تو ہی بجھا نہ دے

وہ مغنیہ کے ساتھ خود بھی دھیرے سے گنگنائی۔ آبص نے بہت غور سے اسے دیکھا اور محسوس کیا وہ بے بجھی بجھی سی تھی۔ اس کی ستارہ آنکھوں کی روشنی ماند تھی۔ اس کے لبوں پر قاتل مسکراہٹ نہ تھی۔ اس کی ستواں جا ناک کی لونگ کا نگ بھی آج دمکتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بجھا بجھا سا تھا۔

وہ مضمحل سی دکھائی دے رہی تھی۔

"لگتا ہے مجھ سے بدگمان ہو رہی ہو۔" اس نے آہستگی سے اس کے میز پر دھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ تسلی لیے رکھنا چاہا وہ غیر محسوس طریقے سے ہاتھ کھینچ گئی اور گود میں رکھ لیا۔

"خفا ہو، بے بھروسا ہو رہی ہو۔" وہ اس کے گریز پر پریشان دکھائی دینے لگا۔ "تم سمجھ رہی ہو، میں تمہیں چھو بھاگ رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے یہ محض بزنس ٹرپ ہے۔" وہ اپنے ہی طور پر اخذ کر رہا تھا۔ نادیہ شاہ حیران ہوئی۔

''ارے، ایسا خیال تمہیں کیوں آیا کہ میں تم سے بدگمان ہوں یا بھروسا نہیں رہا۔''
''میرے جاپان جانے پر۔''
''نہیں مجھے معلوم ہے تم مشینوں کے سلسلے میں جارہے ہو اپنے پاپا کے ساتھ..... بلکہ مجھے تو خوشی ہوئی کہ تم نے عملی میدان میں قدم رکھ دیا ہے۔ اپنے پاپا کے ساتھ بزنس سنبھال رہے ہو۔''
''تو پھر میرے جانے پر اداس ہو۔''
''ہاں یہ کہہ سکتے ہو۔'' وہ مسکرادی۔ وہ بھی ہنس دیا۔
''تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے آج، خبر ہے کچھ۔'' وہ ایک پل رکا۔
ویٹران دونوں کے درمیان رکھی ٹیبل پر اسٹینکس کی پلیٹ اور برگر رکھ کر پلٹ گیا۔ اس نے ایک پلیٹ نادیہ شاہ کی جانب کھسکائی اور بولا۔
''ایک اچھی خبر ہے بلکہ بے حد اچھی۔'' نادیہ شاہ نے اس کی طرف اشتیاق سے دیکھا۔ ''مام ہماری شادی پر مان گئی ہیں، آئی مین وہ اس رشتے پر اگری (راضی) ہیں۔'' یہ بتاتے ہوئے اس کی آواز میں بے پایاں خوشی کھنک رہی تھی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا، مام بہت محبت کرتی ہیں، مجھے اور میری محبت کو وہ نظر انداز کر ہی نہیں سکتیں۔ وہ جلد ہی تمہاری مام سے ملنے آئیں گی۔''
نادیہ شاہ آبص کی باتوں پر بجائے دلی مسرت محسوس کرنے کے مضطرب نظر آنے لگی۔
''آبص کہیں تمہارا آؤٹ آف کنٹری (ملک سے باہر) جانا دھمکی تو نہیں ہے۔ تم اپنی ماں کو پریشرائز تو نہیں کررہے (دباؤ میں تو نہیں لے رہے) ہو۔'' وہ خدشہ جو وہ کب سے سنبھالے بیٹھی تھی بالآخر کہہ گئی۔ جب سے آبص نے اسے بتایا تھا، وہ ایک ماہ کے لیے ملک سے باہر جارہا ہے، اس کے دل میں ہزار واہمے، اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ گو کہ وہم کرنے کی معقول بنیاد نہیں تھی مگر وہ کیا ہے کہ جب دل محبت کی آبیاری کرنے لگتا ہے تو واہموں اور خدشوں کی جھاڑیاں خود بخود چاروں طرف سے اگنے لگتی ہیں۔
آبص نے یک لخت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔''
''اسے تم میرا وہم سمجھ لو۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔
''تم نے یہی بتایا تھا کہ تمہارے پیرنٹس (والدین) ہمارے مابین اسٹیٹس (حیثیت) کے اس فرق کو قبول نہیں کرپا رہے ہیں۔ میرے نزدیک ان کی خفگی کا ریزن بھی معقول ہی ہے۔ ہر کوئی اپنی معیار کی بہو اور بیوی تلاش کرتا ہے۔ سو واٹ کہ وہ بھی۔'' پھر رک کر آبص کی حیرانی سے گھورتی آنکھوں سے نظریں ملاتے ہوئے مسکرادی۔ ''اب یکا یک اتنی بڑی تبدیلی پر حیران تو ہونا بنتا ہے۔''
''ارے ایسا کچھ نہیں ہے جو تم سوچ رہی ہو مام کو میری محبت کی شدت کا اندازہ نہیں تھا اور اب ہوگیا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کے بیٹے کے لیے نادیہ شاہ کتنی امپارٹنٹ (اہم) ہے۔'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا پھر مسکرایا۔ ''اب خوش ہونا تو بنتا ہے۔'' وہ ذرا سا اس کی جانب جھکا۔
وہ چائے کا مگ آہستگی سے پرچ پر رکھ کر اس کی والہانہ نظروں سے گھبرا کر پلکیں جھکا گئی۔
''اب تو کوئی وہم نہیں ستا رہا۔''
''نہیں، یہ بتاؤ واپسی کب ہے۔''
''سرپرائز۔''
''کیا مطلب؟''

یہ نہیں بتاؤں گا۔ بالکل اچانک آؤں گا۔"
"بچے نہ ہو تو....." وہ ہنس دی۔
"آبص میں سوچ رہی ہوں، تمہاری مدر تمہاری موجودگی میں ہی ہمارے گھر آتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔"
اس کے ہمراہ کیفے سے باہر آتے ہوئے بولی۔
"یعنی ایک ماہ کے طویل انتظار کے بعد میں آؤں، تب یہ سب کارروائی ہو، ہرگز نہیں۔ میں آؤں گا تو یہ خبر
خبری مجھے یہاں کی ہواؤں سے ملے گی کہ نادیہ شاہ میرے نام لکھ دی جا چکی ہے۔" وہ شاعرانہ انداز میں بولا۔
"ارے واہ۔ ایسے کیسے لکھ دی جائے گی۔" وہ چھیڑنے لگی۔
"بتاؤں کیسے لکھ دی جائے گی۔" وہ اس کی جانب گھوما۔
"کیسے؟"
"ایسے....." وہ یک دم ہی اس کے بے حد نزدیک چلا آیا۔
وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی مگر راہیں مسدود تھیں۔ پشت پر دیوار تھی، وہ جا کر دیوار سے جا لگی۔ ایک پل اس
آنکھوں میں خوف سمایا تھا۔ آبص کی والہانہ نگاہیں اسے اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ اسے
وہ ابھی اس کے چہرے پر جھکے گا..... اور آگے اس سے سوچا ہی نہ گیا، وہ جھٹکا دے کر ایک طرف ہوئی۔
"پیچھے ہٹو۔"
"بس، ڈر گئیں۔" وہ ہنستا ہوا چابی لہرا کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ وہ ایک پل وہیں رک کر اتھل پتھل
سانس کو بحال کرنے لگی پھر دھیرے سے پیشانی پر ہاتھ پھیرا جو خفت سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔
"آج کی بعد میں تم سے ہرگز نہیں ملوں گی، باہر کہیں بھی۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ وارننگ دیتے ہوئے بولی۔
"اب کہیں ملنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اب ہم جیلانی ہاؤس میں ملیں گے۔"
"تم پیچھو رے ہو۔" وہ اس کے لبوں پر لہرائی مسکراہٹ سے جل کر بولی۔
"اگر پیچھو را ہوتا تو اب تک پیچھو را پن دکھا چکا ہوتا۔" اس نے گاڑی ہلکی اسپیڈ پر چھوڑ دی۔
"بہر حال، یہ آخری ملاقات بھی ہماری۔" وہ برا مان کر، نگاہوں کو جھکا کر، ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر چہر
پر پھیرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔
آبص نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اتر آئی۔
"سچی محبت عہد روشنی کی مانند ہوتی ہے جو محبت کرنے والوں کو راستہ سجھاتی ہے، راہ سے بھٹکاتی نہیں ہے۔ محبت
محبوب کو سوا کرنے کا نام نہیں ہے۔ اس کی پاکیزگی مجروح کرنے کا نام تو نہیں ہے بلکہ تحفظ کا نام ہے جو اپنا حصار
کر چاہنے والوں کو تحفظ دیتی ہے۔ آئی ایم سوری نادیہ! میں تمہارا خطا کار ہوں۔ مجھے تمہیں یوں پبلک پلیس میں لے
نہیں آنا چاہیے۔ پر کیا کروں راستہ ہی نہیں تھا۔ سو یہ خطا کر گیا۔ آئی ہوپ، تمہیں عزت بنا کر اپنے گھر لے جانے
وقت قریب ہے۔" وہ اس کے جھکے سر پر ایک نگاہ ڈال کر بولا۔ نادیہ شاہ کا جھکا ہوا سر کچھ اور جھک سا گیا۔
آبص جیلانی نہیں جانتا تھا۔ یہ ملاقات سچ مچ آخری ملاقات ثابت ہوگی نادیہ شاہ سے۔ جب وہ پر
ٹرپ سے لوٹے گا تو وہ اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہوگی۔ اس کے لیے کوئی گزری ہوئی یاد بن کر رہ جا
گی۔ عمر بھر کا روگ بن کر رہ جائے گی۔

☆☆☆

ابھی کچھ دن لگیں گے
دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے
جہاں رنگ کے سارے خس و خاشاک
سب سرد و صنوبر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر
کہیں امید کا چھوٹا سا اک گھر بنتے بنتے رہ گیا ہے
وہ اک گھر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
مگر اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں
بس ایک دن دل کی لوح منتظر پر اچانک رات اترے گی
میری بے نور آنکھوں کے خزانے میں چھپے
ہر خواب کی تکمیل کر دے گی
مجھے بھی خواب میں تبدیل کر دے گی
ایک ایسا خواب جسے دیکھنا ممکن نہیں تھا
اک ایسا خواب جس کے دامن صد چاک میں
کوئی مبارک کوئی روشن دن نہیں تھا
ابھی کچھ دن لگیں گے

اتنی تھکن تو اسے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج تو جیسے پیر بھی ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اس نے بائیک سڑک کے ایک طرف کھڑی کر دی اور ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے دھیرے دھیرے اس آئس کریم پارلر کی طرف چلنے لگا جہاں اس بے رحم ظالم لڑکی کو لے کر اکثر آیا کرتا تھا۔

کتنی بے رحمی سے جیسے کسی پتھریلی زمین پر پٹخ کر رکھ دیا تھا اس نے۔ سکندر کو لگ رہا تھا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہو۔

آئس کریم پارلر میں داخل ہوتے ہی نزدیکی کرسی پر ہی بیٹھ گیا، جیسے آگے چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔ خود کو سنبھالے رکھنے کا مکمل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

آئس کریم پارلر کا چھوٹا بھاگ کر آیا تھا۔

"بڑے دنوں بعد آئے ہیں سر! وہ بھی اکیلے۔" چھوٹا اس کے آگے پلاسٹک کی میز مستعدی سے لگا کر اس پر کپڑا پھیرنے لگا۔

"باجی نہیں ہیں ساتھ۔" ارسلہ کی بابت پوچھ رہا تھا۔

"نہیں، میں آفس سے آ رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ کون سا فلیور لاؤں؟"

"جو باجی کھاتی ہیں۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ حالانکہ اسے آئس کریم کی طلب بالکل نہ تھی۔ اس نے سوچا تھا کڑک چائے پیے گا۔ ڈھیر ساری سگریٹ پھونکیں گے اور ناکام عاشقوں کی طرح سینہ جلاتا رہے گا۔

چھوٹا حکم کی تعمیل کے لیے چھلاوے کی طرح وہاں سے نکل گیا۔

سکندر نے سگریٹ سلگائی اور کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر کے دھیرے دھیرے کش لگانے لگا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ رات اترنے میں چند لمحات ہی باقی تھے مگر اس کے دل کے آنگن میں اس کی تھ میں اس کے اردگرد ہر جگہ رات ہی رات تھی۔

آئس کریم پارلر ہمیشہ کی طرح کھلکھلاتے خوش باش انسانوں سے بھرا پڑا تھا اور مخصوص گانا بج رہا تھا جس ارسلہ ہمیشہ چڑ جایا کرتی تھی۔

"آخر اسے کوئی اور گانا کیوں نہیں ملتا۔" ایک بار تو وہ غصے کے مالک سے الجھنے کی نیت سے کرسی دھکیل اٹھنے لگی تھی کہ سکندر نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا تھا۔

ہوسکتا ہے اس بے چارے کے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہوئی ہو، وہ خود کو اس طرح بہلا رہا ہو۔

"تم بھی نا سکندر۔" وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی پھر ہنس دی۔ "یہ اچھی رہی، اپنا غم بہلانے کے لیے ہمارے سر پر چٹ کر رہ جائے۔"

"ارے بھئی، میں تو یوں ہی اندازہ لگا رہا ہوں۔ تم آئس کریم کھاؤ، دل بہلاؤ۔ بس مجھے دیکھو اور تصور میں کوئی رومانٹک قسم کا گانا چلا لو۔" وہ اسے چھیڑنے لگا۔

یک دم وہ چونکا۔ سگریٹ کی پ پر جمنے والی راکھ کا پہاڑ اس کے کپڑوں پر گرا تھا، وہ جلدی سے جھٹکنے لگا

"ایک شخص کے بدل جانے سے پوری کائنات بدل سی جاتی ہے۔" اس نے عجیب بے زاری محسوس کرتے ہوئے سگریٹ نزدیکی کیاری میں پھینک دی۔

وہیں زندگی کی حسین خواب ٹوٹے
میرے ہم سفر تم جہاں ہم سے چھوٹے
ستاروں نے دیکھا
بہاروں نے دیکھا
کبھی ہم ملے تھے، نظاروں نے دیکھا
خبر کیا تھی ہم کو، یہ وعدے ہیں جھوٹے

آج یہ گانا اپنے حسب حال لگ رہا تھا۔ اذیت کا احساس کچھ اور بڑھنے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، آج اس مالک سے الجھ پڑے۔ اس کا دماغ ٹھکانے لگا دے۔

اس نے والٹ سے پیسے نکال کر میز پر رکھ دیے اور آئس کریم یوں ہی کرسٹل کی پلیٹ میں پگھلتی چھوڑ کر آئس کریم پارلر سے نکل گیا۔

☆☆☆

"لگتا ہے آج تیز بارش ہوگی۔" آبص نے کتاب سے سر اٹھا کر آسمان پر ایک نظر ڈالی۔

"نہیں ہوگی۔" رومی موبائل سے سر اٹھا کر بولی۔

"ارے — وہ کیوں؟ اتنے تو بادل آرہے ہیں۔"

"آپ مری کے مزے لوٹ کر آرہے ہیں نا، شاید کراچی کی ویدر (موسم) کو بھول گئے ہیں۔ کراچی کے بادل بڑے بے مروت سے ہوتے ہیں برادر! ابھی ہو دکھ رہا ہے ایک گھنٹے کے بعد موسم بالکل صاف ہوگا۔"

"بے مروت — ہوں۔" وہ ہلکے سے بڑبڑایا پھر محظوظ ہو کر چہرے سے مسکرا دیا۔ "مگر آج تو ان بے مروت سا کرنے کو دل چاہتا ہے۔" اس نے کتاب میز پر رکھ کر ایک ہلکی سانس کھینچی۔

"تو پھر کیا خیال ہے، آؤ ٹہلنے پر نکلتے ہیں۔ میری بوریت بھی ختم ہو جائے گی اور آپ بھی اس بے مروت موسم کا مزا اٹھا سکیں گے۔"

''بہت بولنے لگی ہو روی!'' وہ اسے پیار بھری مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''نصیر کاکا سے کہو اسٹرونگ سی چائے پلائیں پھر نکلتے ہیں۔''

''رئیلی۔'' روی خوش ہوئی۔ آبس کا موڈ دیکھ کر۔

نصیر کاکا نے چائے کے ساتھ موسم کی مناسبت سے خاصا اہتمام کرڈالا تھا۔ چائے پینے کے بعد ان دونوں بہن بھائی کا آؤٹنگ کا پروگرام تھا جو ملتوی ہوگیا۔ مہوش بہت خوب صورت انجمف رنگ (سنگھنی کی انگوٹھی) لے کر آبس اور روی کے پاس چلی آئیں۔ بے حد خوب صورت اسٹینڈ گلاس باکس میں دلکش ڈائمنڈ کی رنگ روی کی نگاہوں کو خیرہ ہی کرگئی۔

''واؤ..... سو بیوٹی فل۔ مام فینٹاس۔'' اس کے لہجے میں توصیف تھی جبکہ آبس کا انداز نارمل ہی تھا، اس نے سرسری ایک نظر رنگ پر ڈالی پھر دھیرے دھیرے چائے کی چسکیاں بھرنے لگا تھا۔

''پوچھو گے نہیں، کس کے لیے ہے۔'' مہوش نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''جانتا ہوں۔'' اس نے ابرو اچکائے۔ ''مجھے مری سے بلانے سے لے کر اس انگوٹھی تک کا مقصد۔ سب جانتا ہوں۔'' اس کا لہجہ بڑا سرد سا تھا۔ ''اب بڑا ہوگیا ہوں مام! اب ان پہیلیوں سے نکل گیا ہوں۔'' اس نے ٹیبل پر رکھتے ہوئے مہوش کی طرف دیکھا۔

مہوش کے لبوں سے بے ساختہ ایک خفیف سی سانس آزاد ہوگئی، ان کی سرپرائز دینے کی امنگ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

''ہاں، جانتی ہوں۔ اب تم بہت بڑے ہوگئے ہو۔ فقط ایک سال میں اتنے بڑے کہ میں خود کو تمہارے سامنے چھوٹا سمجھنے لگی ہوں۔ ایٹی ویز، چلو سرپرائز رہا ایک طرف، یہ بتاؤ رنگ کیسی لگ رہی ہے۔'' مہوش لہجے میں بشاشت سمونے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

''ہوں، اچھی ہے۔ بیوٹی فل۔''

''ایکسپینسو (قیمتی) بھی تو ہے۔ بیوٹی فل تو ہوگی نا۔'' مہوش رنگ پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے بولیں اور باکس بند کردیا۔

''ایکسپینسو ہے اس لیے نہیں بلکہ دل سے خریدی ہے، اس لیے خوب صورت ہے۔'' وہ مگ اٹھا کر ایک ہلکی سی چسکی بھرتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں چھپی کاٹ مہوش اور روی دونوں نے ہی محسوس کی تھی۔

''چلو ایسے ہی سہی۔'' مہوش نے بات بڑھانے کے بجائے اسے ختم کرتے ہوئے کندھے اچکائے اور چائے کا مگ اٹھالیا۔

''جو دل کو بھا جائے۔ قیمت اسی کی ہوتی ہے، وہی انمول ہوتی ہے۔ خوب صورتی شے میں نہیں آنکھ میں ہوتی ہے اور نگاہوں کا تعلق دل سے براہ راست ہوتا ہے۔'' اس کا انداز سادہ سا تھا مگر جتانے والا تاثر واضح تھا۔ وہ اسٹک پر ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر اٹھنے لگا کہ روی ماحول میں پھیلے اضمحلال کو جھٹکنے کی غرض سے شگفتگی سے بولی۔

''ارے، یہ کیا۔ کہاں جارہے ہیں۔ ابھی ہمیں آؤٹنگ پر جانا ہے۔''

''پھر کبھی سہی، ابھی موڈ نہیں ہے۔'' وہ نرمی سے بولا پھر یوں ہی آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اب تو موسم بھی بدل گیا ہے، ٹھیک کہا تم نے۔ یہاں کا موسم بے بھروسا ہے۔''

''آبس.....'' مہوش اسے اٹھتے دیکھ کر پرسوچ انداز میں اسے روکتے ہوئے بولیں۔ ''میں ایک دو دن میں ارسلہ کو یہ رنگ پہنا کر آؤں گی۔''

آبس نے استہزائیہ انداز میں ابرو اچکا کر مہوش کی طرف دیکھا۔

''مجھ سے ملے بغیر، مجھے جانے دیکھے بنا وہ پہن لے گی۔ یہ تو بہت بڑا رسک ہوگا مام!''

''اگر پہن لے تو تمہیں تو آبجیکشن (اعتراض) نہیں ہوگا ناں۔ ساری کارروائی میں ایک فرماں بردار بیٹے کا رول پلے کرو گے نا۔'' مہوش نے آس مندانہ نظروں سے دیکھا۔

''پہلے بھی تو فرماں برداری کے سارے ریکارڈ توڑ چکا ہوں۔'' وہ طنز سے ہنسا۔ ''اب بھی کرلوں گا، ہاں مگر اب کے ساری ذمہ داری آپ کی ہوگی۔ میری نہیں، مجھے فقط رول پلے کرنا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر اسٹک پر سختی سے گرفت رکھے لنگڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے انداز میں بے رخی اب بھی دکھائی دے رہی تھی۔

یہ لمحہ فکریہ تھا مہوش کے لیے۔ وہ آنے والے دنوں کی پلاننگ کر رہی تھیں، ایک امید کے ساتھ اتنا بڑا کام اٹھانے جا رہی تھیں۔ مگر آبص کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہ تھی۔ وہ انکاری نہیں تھا مگر اقرار بھی نہیں کیا تھا۔ وہ چپ تھا مگر بے زاری اور بددلی کے حال سے آزاد ہونے کی خواہش بھی شاید اب اس میں نہ رہی تھی۔ مہوش کی نظریں تڑپ کر دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ اس کا شہزادے جیسا بیٹا کیسا داغ لے کر جی رہا تھا۔ ان کا دل اندر ہی اندر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

انہوں نے طول سی سانس بھر کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

☆☆☆

نیلوفر کی شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ اریبہ اور ارسلہ اکثر ہی محلے کی لڑکیوں کو اکٹھا کر کے ڈھولکی رکھتیں۔ آج بھی اریبہ شام سے تیاری میں لگی تھی۔ شادی بیاہ کے سارے نئے پرانے گانے لگا کر پورے ماحول کو پررونق بنایا ہوا تھا۔ مگر ادھر نیلوفر کو لگ رہا تھا، سر پھٹ جائے گا۔

''یہ تم کیوں منہ سوجا کر بیٹھی ہو۔ لگتا ہے مایوں کا جوڑا پسند نہیں آیا۔'' ارسلہ اس کے سر پر سوار ہوگئی۔ وہ مسہری پر پھیلے کپڑے سمیٹ رہی تھی۔ اتفاق سے اس کے مایوں کا جوڑا بھی مسہری پر کھلا پڑا تھا، جو کل ہی اس کے سسرال والے دے گئے تھے اور جس کو دیکھ کر ارسلہ نے خوب ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''جیسا سسرال، ویسا ہی جوڑا۔ اب ان سے کتنی اچھی توقع کر سکتے ہیں۔'' اس نے جوڑا اٹھا کر اس پر ایک استہزائیہ نظر ڈالی اور پھر زور سے ہنس پڑی۔ ''اب مجبوراً پہننا تو پڑے گا۔''

''فضول مت بکو۔'' نیلوفر نے جھنجلا کر جوڑا اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ ''تم جانتی ہو میں ان چیزوں پر دل نہیں رکھتی۔'' وہ جوڑا تہ کر کے الماری میں رکھنے لگی۔

''رکھنا بھی مت، ورنہ قدم قدم پر دل ٹوٹے گا۔'' وہ قہقہہ لگانے لگی پھر یاد آنے پر بولی۔ ''وہ ہیرو کہاں ہے؟ آ نہیں رہا ہے، بہت دنوں سے۔''

نیلوفر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور سوچا۔ ''چلو کمی محسوس تو ہوئی۔''

''ارے وہی کمینہ سکندر اعظم! لگتا ہے مطلب پورا نہیں ہوا تو منہ دکھانے بھی نہیں آئے گا۔ ہنہ! بھائی پھرتا ہے تمہارا اور اس گھر کا بڑا۔ اب وقت آیا ہے بڑا بننے کا تو غائب ہوگیا۔''

''نوکر نہیں ہے وہ ہمارے گھر کا۔'' نیلوفر جل کر بولی۔ دل تو چاہا ساتھ تھپڑ بھی جڑ دے۔

''میں نے اسے نوکر کب کہا ہے۔ میں نے ہیرو کہا ہے۔'' یہ کہہ کر آنکھ مار کر ہنسی۔ نیلوفر کا دل اس کی حسی پر کٹ کر رہ گیا۔ سکندر کی ذہنی حالت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

دل ٹوٹا تھا۔ خواب ٹوٹے تھے۔ برسوں کا بنایا خواہش کا محل دھڑام سے گرا تھا۔

''ذرا فون تو کروں، آج ڈھولکی میں اس کے بنا مزا نہیں آئے گا۔''

''چھوڑو اسے۔'' نیلوفر نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔ ''کوئی ضرورت نہیں۔ جا کر عقیلہ خالہ

ساتھ لے آؤ۔"

"کیا..... میں لے آؤں؟" وہ متعجب ہوئی۔

"ہاں تم..... خرچ نہیں ہو جاؤ گی۔ یوں تو پچاسوں چکر کاٹتی ہو، ادھر اُدھر کے۔ ایک وہاں کا بھی لگا لو، تمہارے انکار نے دل دکھایا ہے ان کا۔ پیار سے منا بھی لو۔" نیلوفر نے ایک اور کوشش کرنی چاہی۔ مبادا اس کا دل نرم پڑ جائے، اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا ہی سوچ لے۔

"یاد نہیں، بچپن میں کتنے لاڈ اٹھایا کرتی تھیں تمہارے اور تمہیں ہمیشہ بہو کے روپ میں دیکھا ہے۔ اب مان توڑ ڈالا ہے تو ذرا سا دل ہی رکھ لو۔ سگی خالہ ہیں تمہاری۔"

"ہوں....." ارسلہ نے چند لمحے توقف کے بعد ہلکے سے سانس کھینچی۔ اس "ہوں" میں رضامندی جھلک رہی تھی پھر یک دم مسہری سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "خالہ تک تو ٹھیک ہے مگر اس کو نہیں مناؤں گی۔ تمہارے اس عظیم بھائی سکندر اعظم کو۔ بہن کی شادی کی ذمہ داری محسوس کرے گا تو خود ہی آئے گا۔" وہ کمرے سے کہتی نکل گئی۔

نیلوفر نے یہی غنیمت جانا کہ وہ خالی کی طرف جانے کو راضی تو ہوئی تھی۔

وہ اپنی بات کی تو پکی تھی ہی، عقیلہ خالہ کے یہاں جا پہنچی۔ پہلی مڈبھیڑ سکندر سے ہی ہو گئی۔ اسے دیکھ کر لمحہ بھر سکندر کے دل خوش فہم نے امید ہی باندھ لی۔ وہ اسے منانے آئی ہے، ہو سکتا ہے اقرار کرنے بھی آئی ہو۔ اس کو دل میں کوئی کرن پھوٹتی محسوس ہونے لگی۔

"لگتا ہے نیلوفر کی جگہ تم مایوں بیٹھ رہے ہو۔" وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "آئے نہیں بہت دنوں سے۔"

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ لیپ ٹاپ بند کر کے کرسی دھکیل کر اٹھ گیا۔

"مجھے فرق پڑے نہ پڑے، تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس تو ہونا چاہیے۔ آخر نیلو کے ذمہ دار بھائی ہونے کا دعوا کرتے ہو۔"

وہ جھلس کر رہ گیا۔ مگر اتنی اداسی اور افسردگی روح پر طاری تھی کہ اس سے الجھنے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ابھی تو یہ عالم تھا کہ "کہیں بھی کسی کے ساتھ بھی، نظر تو آئی ہی ہے۔ اتنے دنوں کے بعد اسے دیکھ رہا تھا، ترسی آنکھوں کی جلتی پتلیوں پر ٹھنڈا چھینٹا سا پڑا تھا۔

"یہ بتاؤ، تم یہاں کیسے آ گئیں۔"

"منانے آئی ہوں خالہ کو۔ آج ڈھوکلی رکھی ہے میں نے۔ خالہ کے بنا مزا نہیں آئے گا۔" وہ یہ کہہ کر مڑ کر جانے لگی۔

سکندر نے اس کا راستہ روکتے ہوئے اسے گھورا۔

"آئی نہیں ہو، بھیجی گئی ہو۔" وہ جیسے چٹخا تھا۔ اسے دیوار پر دھکیل کر دیوار پر ایک ہاتھ جما کر اس پر جھکا۔

"نیلوفر نے بھیجا ہے اور اس نے یہ بھی کہا ہو گا جا کر خالہ کو منا لو اور یہ بھی کہا ہو گا تھوڑا سا دل ہی رکھ لو۔"

وہ اس کا منہ دیکھنے لگی، پھر یک دم ہنس پڑی۔

"واہ۔ تم تو پکے بھائی ہو اس کے۔ دعوا ٹھیک ہی کرتے ہو۔ ساری فیلنگز سے باخبر ہو۔" وہ طنز کر رہی تھی یا شاباشی دے رہی تھی، بہر حال سکندر کھول کر رہ گیا۔

"کاش تم بھی کسی کی فیلنگز کو تھوڑا بہت انکرج (حوصلہ افزائی) کرنا سیکھ لیتیں۔" وہ جھٹکے سے ہاتھ دیوار سے اٹھا کر، پیچھے ہٹا پھر پلٹ کر کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

وہ عقیلہ خالہ کو منا کر لے آئی تھی۔ رات ڈھوکلی میں کچھ زیادہ ہی خوش اور مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ نظریں

بار بار گھڑی پر پڑتیں، جانے کس کا انتظار تھا۔ ایک بار تو اریبہ نے چوری پکڑ لی۔
"کوئی آنے والا ہے کیا۔ ایسا لگتا ہے آپ کو کسی کا انتظار ہے۔"
اس نے سبز گوٹا لگا دوپٹا کندھے سے ہٹا کر کمرے پر باندھتے ہوئے نارمل انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔
"ہیں..... کس کا؟" اریبہ چونکی۔ "سکندر بھائی کا؟"
ارسلہ ہنس دی۔
"نہیں....." پھر اس کے سر پر چپت مارتے ہوئے بولی۔ "چلو لڈی ڈالتے ہیں۔" وہ گھوم کر دوسری طرف چلی گئی۔
لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر بڑے خوب صورت گیت گا رہی تھیں۔ نیلوفر کو بھی زبردستی پکڑ کر اپنے درمیان بٹھا رکھا تھا۔

ذرا ڈھولکی بجاؤ گوریوں
میرے سنگ سنگ گاؤ گوریوں
شرماؤ نا لگا کے مہندی
ذرا تالیاں بجاؤ گوریوں
یہ گھڑی ہے ملن کی
اک جنم سے جنم کی

اماں بہن (خالہ) کے ساتھ تخت پر بیٹھی تھیں۔ باتوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے گانے پر انجوائے بھی کر رہی تھیں۔ اماں کے ہاتھ میں سوئی دھاگا جس سے وہ اریبہ کے دوپٹے کی بیل ٹانک رہی تھیں۔

کس نام سے پکاروں
کیا نام ہے تمہارا
کیوں تم کو دیکھتے ہی
دل کھو گیا ہمارا

اب لڑکیاں تالیاں پیٹ رہی تھیں اور ارسلہ اس گانے پر خوب صورت ڈانس کر رہی تھی۔

تم خواب زندگی کی تعبیر بن کے آئے
میرے تصوروں کی تصویر بن کے آئے
آ ہی چکے ہو جب تم
جانا نہیں دوبارہ
کس نام سے پکاروں
کیا نام ہے تمہارا

سبز اور سرخ کنٹراس شلوار قمیص میں بڑا سا سرخ چنری کا دوپٹا اوڑھے جو کندھے سے ہوتا فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی شرارت آمیز نظریں نیلوفر پر تھیں۔ لبوں پر گلابوں جیسی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ سکندر اندر داخل ہوتے ہی ازخود رفتہ سا رہ گیا تھا۔

دیکھو حسین کتنے چاہت کے سلسلے ہیں
محسوس یہ ہوا ہے
پہلے بھی ہم ملے ہیں

وہ اس پر کیف لمحے میں جکڑ سا گیا تھا۔ ایک طلسم میں قید ہو گیا۔ دلی تمناؤں کے سیل شوق میں بہتا وہ یک دم چونکا اور جیسے خود سے ہی خفیف سی ہو کر سر جھکا۔ جذبات کی لو نیچے کر لی۔ نگاہیں بھی جھکا لیں۔

اسے خبر نہ تھی ارسلہ کی آنکھوں میں سب کچھ پا لینے کا نشہ ہلکورے لے رہا تھا۔ یہ انوکھی مسرت جو اس کے سراپے کا احاطہ کیے، اسے حسین بنا رہی تھی، وہ تو کسی کی مرہونِ منت تھی۔

سکندر ابا کے کمرے میں چلا گیا اور ان کی خالی مسہری پر جا کر لیٹ گیا۔

ارسلہ کا رقص ختم ہوا اور جیسے انتظار بھی.....

مہوش جیلانی، روی اور شہرا کبر جیلانی کے ہمراہ اندر داخل ہوئی تھیں۔ ایک امنگ، امید اور جیت کا یقین لے کر۔ ابا اماں تو بے چارے بوکھلا کر رہ گئے تھے۔ اتنے بڑے لوگ یوں آ گئے تھے، کوئی خاطر مدارت بھی ان کے شایانِ شان نہ ہو پا رہی تھی۔

''ارے..... یہیں بیٹھ جاتے ہیں نا۔ تکلف رہنے دیجیے بھائی صاحب!'' مہوش ابا کو پریشان دیکھ کر جلدی سے بولیں۔ ''ہمیں تو یہ رونق بڑی اچھی لگ رہی ہے۔'' وہ لڑکیوں کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اکبر جیلانی ابا کے ہمراہ، سادہ سے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ روی، اریبہ کے ہمراہ قالین پر بیٹھ گئی۔

''ماشاء اللہ! بہت پیاری ہیں آپ کی بیٹیاں۔ اللہ خوش رکھے۔'' مہوش نے نیلوفر کو دیکھا، پھر ارسلہ پر نگاہ ڈال کر مسکرا کر بولیں۔ ''بس اب ہماری کوٹھی میں بھی ایسی ہی رونق اتر جائے۔'' وہ اصل مقصد پر آنے لگیں۔

ادھر ارسلہ جو بظاہر روی سے علیک سلیک میں لگی تھی، اس کا دھیان مہوش کی طرف ہی تھا۔ دل بے نام سی خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ روی نے اسے فون کر کے کہا تھا، مما اور پاپا آ رہے تھے اور آبس بھائی تو بہت ہی بے صبرے ہوئے جا رہے ہیں۔ آپ کو اپنے نام کرنے کے لیے اور آپ کے ہو جانے کے لیے۔

''یہ روی بھی نا بس۔'' وہ موبائل ایک طرف ڈال کر اپنے دھڑکتے، مچلتے دل کو سنبھالتی رہی تھی۔ تب سے اس کی نگاہیں گاہے بگاہے دروازے کی جانب جا اٹھتیں اور یہ اتنا اہتمام بھی تو اسی وجہ سے کیا تھا..... مہوش کچھ دیر یہاں بیٹھ کر پھر اماں اور عقیلہ خالہ کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

اسے بے چینی ہونے لگی۔

(جانے کیا باتیں ہو رہی ہوں گی۔ اماں ابا انکار تو نہیں کر دیں گے کہیں) اس کا دل انجانے خدشے سے دھڑکنے لگا۔

''تو جناب ان کا انتظار تھا آپ کو۔'' اریبہ نے اسے جا لیا۔ جب وہ باورچی خانے میں کھڑی کولڈ رنکس گلاس میں بھر رہی تھی۔ ''یہ روی بھی بڑی چھپی رستم نکلی۔''

''اچھا سنو۔ یہ جا کر ڈرائنگ روم میں دے آؤ، اس بہانے وہاں کا چکر لگا کر کچھ سن گن لی آؤ۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں، کچھ معلوم تو ہو۔''

''سب باتیں سن کر آ رہی ہوں، تب ہی تو کہہ رہی ہوں۔'' اریبہ نے اس کے کانوں میں دھماکا کیا۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے لرز سی گئی۔ اس نے جلدی سے ٹرے ماربل کی سلیب پر رکھ دی۔

''کیا..... کیا سنا ہے، جلدی سے بتاؤ۔''

''اب ایسی بھی کیا بے صبری ہے۔''

''اوہو..... اب بتاؤ نا۔''

''بس آبص بھائی کے نام کی انگوٹھی پہننے کی تیاری کر لیجیے۔ مہوش آنٹی ہار ماننے والوں میں سے نہیں لگتیں۔'' اریبہ یہ دھماکا اس کی سماعت پر کرتی، ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔ وہ اپنی حیرانی سمیٹ کر اب بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کا شور سننے لگی، پھر نزدیکی موڑھے پر دھپ سے بیٹھ کر ایک مسحور کن سانس کھینچی۔

''ہائے ربا۔ یہ سچ مچ میرے ساتھ ہو گیا ہے۔ میں محلوں کی رانی بننے جا رہی ہوں۔''

دل ہو گیا ہے میرا دیوانہ
اب کوئی بچتا نہیں
ناداں ہے سمجھتا نہیں
بن تیرے رہتا نہیں

اس کا دل لہک لہک کر گانے لگا۔ ساتھ وہ بھی زور سے گانا چاہ رہی تھی کہ یک دم منہ پر ہاتھ رکھ کر اس بے پایاں مسرت کو عیاں ہونے سے روکا۔ اس کی نگاہوں میں مہوش جیلانی کی کوٹھی گھومنے لگی۔ آبص کی خواب گاہ کا ہلکا ہلکا ہوش رُبا تصور اس کے دماغ پر طاری ہونے لگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے جیسے اس کی خواب گاہ میں جا پہنچی۔

''ہائے۔ خواب یوں بھی پورے ہوتے ہیں۔ تمنائیں ایسے ہو جاتی ہیں پوری۔ یا اللہ! میں نے مصلے پر بیٹھ کر دعائیں بھی نہیں مانگی تھیں ابھی تو..... اور تو مجھے اتنا نواز گیا۔ ہائے ربا..... میرے ربا.....!''

وہ موڑھے سے اٹھ کر گھوم گھوم کر چکر کاٹنے لگی۔ پھر لہرا کر سلیب سے ٹکرا کر وہیں تھم گئی۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ انتہائی معصوم سی شکل بنائے، سر پر دوپٹا جمائے ڈرائنگ روم کے اکلوتے تھری سیٹر صوفے پر مہوش کے برابر بیٹھی تھی۔ مہوش اپنے پرس سے بے حد خوب صورت ڈائمنڈ رنگ نکال رہی تھیں اور ساتھ اماں ابا کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''ارے، آپ فکر مند کیوں ہو رہے ہیں۔ میں کون سا اسے لے کر ابھی جا رہی ہوں۔ ارے بھئی، آپ جی بھر کر تسلی کر لیجیے گا، آبص سے مل لیجیے گا بلکہ کہیں تو ابھی اس سے بات کرا دیتی ہوں بلکہ رومی ڈیئر! ویڈیو کال پر بات کرا لیتے ہیں نا۔''

''ارے نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔'' ابا بے چارہ شرمندہ سے ہو گئے۔

''بس بھائی صاحب! میں تو انگوٹھی پہنا کر دل کو تسلی دینا چاہتی ہوں کہ آپ کے آنگن کا یہ ہیرا اب ہمارا ہوا۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے بس ذرا، آپس میں صلح مشورہ کر لیتے۔'' اماں بے چاری بوکھلا سی رہی تھیں۔

''لیجیے، اتنے دنوں سے مشورہ بھی نہیں کیا آپ نے؟'' پھر ہنس کر بولیں۔ ''چلو خیر ہے، میں تو بس امانت کے طور پر یہ انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال رہی ہوں اور میرا مشورہ یہ ہے کہ نیلوفر کی شادی کے روز ہی ہم اسے بھی اپنے آبص کے نام پکا کر لیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے مہوش نے ارسلہ پر ایک محبت بھری نظر ڈالی۔ وہ رومی کے پاس بیٹھی شرما گئی۔ رومی نے اس کے گرد اپنا بازو پھیلا لیا۔

''آپ کی اجازت ہو تو یہ پہنا دوں بھائی صاحب!'' مہوش نے ابا پھر اماں کی طرف دیکھا اور ارسلہ کا نرم گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

اماں نے ابا کی طرف دیکھا۔ ابا، اماں کے بجائے اکبر جیلانی کی طرف دیکھ رہے تھے پھر انگوٹھی کو دیکھا اور ہلکی سانس بھر کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

''بسم اللہ کیجیے۔''

مہوش نے جھٹ سے یہ چمکتی رنگ ارسلہ کی انگلی میں پہنا دی۔ ابا نے اماں اور عقیلہ خالہ سے نظریں چراتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''ہمیں کچھ نہیں چاہیے حیات بھائی! بس آپ کی بیٹی چاہیے۔ ہمیں ایسی ہی لڑکی اور ایسے ہی نیک، اچھے گھرانے کی تلاش تھی۔ اب پلیز منہ میٹھا تو کرادیں۔ دل کو تسلی سی ہو جائے کہ آپ لوگوں نے ہمیں اس قابل جانا۔'' مہوش نے بڑی آس مندانہ نظروں سے اماں اور ابا کو دیکھا اور مسکرانے لگیں۔

''ضرور ضرور..... کیوں نہیں۔'' اماں جیسے ٹرانس سے باہر آئی تھیں اور یوں سانس بھری جیسے کب سے روکی ہوئی سانس کو باہر نکلنے کا رستہ اب ملا ہو۔ ارسلہ کی طرف دیکھا جہاں انوکھی رونق دکھائی دی۔ اس کا چہرہ ایسا چمک رہا تھا گویا چودویں کا چاند۔

عقیلہ خالہ چپکے سے ڈرائنگ روم سے باہر آ گئیں۔ ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھی، آنسو نکلنے کو مچل رہے تھے جنہیں وہ پلکوں کو جھپک جھپک کر روک رہی تھیں۔

نیلوفر اپنے روم میں مسہری پر چپ چاپ سی بیٹھی تھی۔ پھر عقیلہ خالہ کو ڈرائنگ روم سے نکل کر صحن میں آتے دیکھا تو کمرے سے باہر آئی۔ کونے میں کھڑی پلو سے آنکھیں رگڑ کر عقیلہ خالہ نے پلٹ کر نیلوفر کو دیکھا اور مسکرانے لگیں۔ عجیب خالی خالی بے روح مسکراہٹ تھی۔ نیلوفر کا دل انجانے خدشے سے لرزا۔

''ارے تم یہاں کیوں بیٹھی ہو، اندر جاؤ نا۔ بہن کو مبارک نہیں دو گی کیا؟''

''مبارک..... کس بات کی؟'' نیلوفر کے اعصاب پر عقیلہ خالہ کے یہ آنسو اور اب یہ الفاظ بھاری پتھر کی طرح لگ رہے تھے۔

''ہاں مبارک..... بہت خوش ہے وہ۔'' انہوں نے ایک خفیف سی سانس بھری۔ ''خدا اسے سدا خوش رکھے، آباد رکھے۔''

''خالہ آپ..... آپ نے اسے روکا نہیں؟'' اس نے تڑپ کر خالہ کے کندھے کو تھاما۔

''کس بات پر روکتی۔''

''خالہ..... سکندر کے لیے اسے منا لیتیں۔ خالہ آپ..... آپ تو سکندر سے بھی کم ہمت نکلیں۔'' اس نے دل گرفتگی سے انہیں دیکھا۔

''پگلی! بات کم ہمت یا باہمت کی نہیں ہے، نہ سکندر کی۔ بزدلی کی ہے۔ منزل خواہش سے نہیں ملتی، نصیب سے ملتی ہے۔ جوڑے ہم انسان تو نہیں بناتے نا۔''

''پر خالہ..... کہا تو ہوتا ایک بار، اصرار تو کیا ہوتا۔ حق تو جتایا ہوتا۔ اس نے انگوٹھی پہن لی ایک بار بھی سکندر کا نہیں سوچا۔ اور اماں..... اماں نے بھی نہیں سوچا۔'' وہ دکھ، حیرت اور بے یقین کے عالم میں تھی۔

سچ ہی کہتے ہیں خوشی اور غم کا کلیہ ہر ایک کے لیے الگ ہے۔ کہاں نیلوفر کے لیے بات تکلیف دہ تھی، محبت ہار گئی تھی۔ ایک مخلص انسان تہی نا کام، نامراد ہو گیا تھا۔ ایک اجنبی غیر، جیت گیا تھا۔ ارسلہ کے لیے یہ بے پناہ خوشی کی بات تھی شاید یہ سوچوں سے جنم لینے والی کیفیات ہیں۔

''جاؤ دیکھو ذرا، اس کی انگلی میں ڈائمنڈ کی انگوٹھی کیسی جگمگا رہی ہے۔'' عقیلہ خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''خالہ.....'' وہ تڑپی۔

''نہیں نیلو!'' انہوں نے جلدی سے اسے بولنے سے روک دیا۔ ''بات انگوٹھی کی نہیں، نہ اس کے جگمگاتے قیمتی ہیرے کی ہے۔ بات تو اس کی آنکھوں کے ہیروں کی ہے جو اس ڈائمنڈ سے کہیں زیادہ جگمگا رہے ہیں اور سچ پوچھو تو اس جگمگاہٹ کو نوچنے کا یارا نہیں تھا مجھ میں۔ یہ ظلم ہے نیلو! وہ خوش ہے، بہت خوش..... رشتے دل کی رضا سے مشروط ہوتے ہیں پگلی! اور اس کی خوشی میں رکاوٹ ڈالنا ظلم ہے، جرم ہے۔'' عقیلہ خالہ نے اسے ہی نہیں خود کو سنبھال لیا تھا۔ یوں بھی وہ ارسلہ سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ اس کی خوشی ہر حال میں انہیں عزیز تھی۔

"چلو آؤ، مٹھائی کھاؤ۔ بہن کی خوشی کی۔ اس کا رشتہ طے ہو جانے کی۔" انہوں نے نیلوفر کا ہاتھ پکڑا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دیں۔ یہ دیکھا ہی نہیں کہ ابا کے روم کے دروازے پر کھڑا سکندر کیسے کانچ کی طرح ٹوٹ کے بکھرا تھا۔ اسی دم ارسلہ شرمانے کی بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکلی اور باہر نکل کر گہری سانس کھینچ کر سر سے دوپٹا کھینچ کر اتارا اور اپنے کمرے کی جانب دوڑ لگائی مگر دروازے پر کھڑے سکندر کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔ ایک لمحے دل پر کوئی بوجھ سا گرا، یوں نظریں چرالیں جیسے کوئی نوآموز چور یک دم پکڑا گیا ہو۔ مگر دوسرے پل اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے یک دم اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"مبارک باد نہیں دو گے؟"

وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس سنجیدگی میں یاسیت ایک اضمحلال جھلک رہا تھا۔ اسے اسی پل وہ ایک بے رحم قاتلہ دکھائی دے رہی تھی۔

"خبر دو گی تو مبارک باد بھی دوں گا نا۔" وہ سنبھل کر مسکرایا مگر مسکراہٹ میں بشاشت پیدا نہ کر سکا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ انگلی میں انگوٹھی جگمگا رہی تھی، جسے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے ہلکے سے گھمانے لگی۔ "کیسی ہے؟"

فوری ردعمل کے طور پر سکندر فقط اسے سلگتی نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ ایک پل تو اسے خود پر سے اختیار اٹھتا محسوس بھی ہوا۔ سارے طوفان بند توڑ کر بہہ جانے کو مچل اٹھے، اپنے سامنے کھڑی اس بے رحم حسین قاتلہ کا منہ نوچ لینے کو چاہا۔

"اچھی ہے نا۔" وہ انگوٹھی پر نظریں جما کر بولی۔ "بہت قیمتی بھی ہے۔"

"ہاں، دکھائی دے رہی ہے۔ بہت قیمتی، کسی کے جذبوں سے بھی زیادہ قیمتی۔" وہ فقط سر کو اثباتی جنبش دے کر رہ گیا۔ اس کھلی سچائی کو قبول کرنے کے لیے بڑے مضبوط اعصاب کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں وہ کتنا کامیاب ہو رہا تھا۔ "ایسی ہی ہے جیسی تم چاہتی تھیں۔ جیسا تمہارا خواب تھا۔"

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"ارے..... اب ایسا بھی نہیں ہے۔" وہ کھسیا کر ہنس پڑی۔ "اب انگوٹھی کا ایسا خواب بھی نہیں تھا۔"

"چلو، ابتدا تو ہوئی نا۔ یہ تو پہلا مرحلہ ہے۔ خوابوں کی تعبیر کا پہلا سفر۔" اس نے یک دم پلٹ کر ابا کی مسہری پر پڑی اپنی واسکٹ اٹھا کر کندھے پر ڈالی اور اس کے نزدیک سے ہو کر گزرتے ہوئے ذرا سا رک کر بولا۔

"خوشی ہوئی تمہیں خوش دیکھ کر۔ جو چاہا پا لیا۔ کہاں ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

ارسلہ نے ذرا سا گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی سکندر اگر کیا کروں۔ مجھے خود سے زیادہ پیار ہے، اپنا دل کیسے مار کر جی لیتی۔ سوری سکندر اعظم اویری سوری۔"

وہ انگوٹھی کی طرف دیکھنے لگی تو دل سے روح تک میں جیسے انوکھی مسرت مچلنے لگی۔ وہ اپنے اور نیلو کے مشترکہ روم میں چلی آئی اور مسہری پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آسمان

"میکا تو بس ماں کے دم سے ہوتا ہے، جب سے امی گئی ہیں ہمارا آنا تو ایسا ہو گیا ہے۔ مہمانوں کی طرح، ایک دن کے لیے آتے ہیں۔ چلے جاتے ہیں۔ امی تھیں تو ہفتہ بھر کے لیے بھی بلا لیتی تھیں۔ اب تو کوئی بلانے والا بھی نہیں، خود ہی ڈھیٹ بن کر چلے آتے ہیں۔"

کنول پھوپھی اماں کے ساتھ بچپن ان کے آگے اپنے دکھڑے روتی تھی اور پھوپھی اماں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ بھئی، تمہاری بھاوج بالکل اپنی ساس کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ اللہ بخشے بھاوج اس معاملے میں کون سی کم تھیں؟ ہمارے آنے پر ہمیشہ منہ ہی بنا رہتا تھا، کبھی خوش دلی سے استقبال نہ کیا۔ نہ دل سے پکا کر کھلایا۔ الٹا سیدھا بھگتایا مگر خیر..... اب تو دنیا سے چلی گئیں۔ چلو، اللہ ان کے گناہ معاف کرے۔

پھوپھی اماں ماضی کی باتیں سوچتے سوچتے ایک بار پھر بھتیجی کی طرف متوجہ ہو گئیں جو اپنی رام کہانی ابھی جاری رکھے ہوئے تھی۔

"اللہ رکھے، ابھی تو ہمارے ابو موجود ہیں، کمارہے ہیں۔ ان کی کمائی پر ہمارا کوئی حق نہیں؟ ان لوگوں پر بھی تو خرچ کرتے ہیں۔"

کنول نے وہی گھسا پٹا جملہ اچھالا، جو وہ اکثر اچھالتی رہتی تھی۔ پھوپھی اماں سے تو جو کہنا تھا کہہ دیا۔ اصل مدعا تو جسے سنانا تھا، وہ کچن میں کام کرتی ہوئی سن رہی تھی۔ یہ کمائی کھانے کا طعنہ پہلے بھی کئی بار سن چکی تھی اور اس بار اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کنول کو منہ توڑ جواب دے کر ہی رہے گی۔

سسرالی رشتوں میں کھٹ پٹ معاشرے میں معمول کی بات ہے۔ جہاں چار برتن ہوں کھڑکتے ہی ہیں مگر کنول اور امبرین کے معاملے میں لفظ برتن بھی زور دار کھڑکتے تھے۔ کنول کو طعنے کی عادتی تھی۔ امبرین کو جواب دینے کی عادت تھی۔ صاف گوئی قدرت نے دی تھی۔ امبرین کے اور ایک اس کنول کے بارے میں کہتے ہیں۔ امبرین کا مقدر اچھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کنول پر کہ اللہ تعالیٰ نے دکھائے ہیں اور کیسے ان انسان نما ان سے اس نے اپنے آپ کو بچایا ہے اور امبرین اف اللہ کرتی جب کنول کی زبان تھی اور چلتا ہوا تیر سے بھی

سننا پڑتا مگر باز وہ پھر بھی نہیں آتی تھی۔ اپنی عادت سے مجبور تھی اور ادھار رکھنا امبرین کو بھی نہیں آتا تھا لیکن یہ تو تو میں میں تھوڑی دیر کی ہی ہوتی تھی۔ جب دونوں اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتیں تو کچھ دیر بعد ماحول ایسا ہو جاتا، جیسے گرج چمک، بارش کے بعد مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ کھانا لگاتے اور کھاتے وقت دونوں کی باتیں اور ہنسی مذاق بھی چلتا۔ ان دونوں کا وہ حال تھا، جیسے نام اینڈ جیری، کانا مچھے بھائے نہیں، کانا بن سہائے نہیں۔

کچن میں قورمہ بھونتی امبرین ذرا سا لیے اور ک لہسن کا چھینٹا دے کر آنچ ہلکی کر کے لاؤنج میں آ گئی۔

"پھوپھی اماں ہمارا کمائی کھانا نظر آتا ہے۔ خدمتیں نظر نہیں آتیں؟" امبرین نے پھوپھی کو مخاطب کر کے شکوہ کیا۔

"ٹھیک کہا بھئی، ہم ہو یا کوئی اور مرد۔ کسی کی کمائی کھانا آسان نہیں ہوتا۔" پھوپھی اماں کے اپنے تلخ تجربے تھے یا مشاہدات۔ انہوں نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

"ویسے بھی میرا شوہر خود کماتا ہے، مجھے کیا ضرورت ہے کسی کی کمائی کھانے کی۔" امبرین نے مزید لقمہ دیا۔

"ٹھیک کہا بیٹا! اللہ جیتا رکھے بچے کو۔ ہاتھ پاؤں سلامت رکھے، کمائی میں برکت دے۔" وہ دعائیہ دینے لگیں اور امبرین ہر دعا پر آمین کہتی رہی۔

"ویسے بھی ابو اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہیں۔ نے کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہوئی۔" ایک تیکھی نظر کنول ڈال کر وہ واپس کچن میں چلی گئی۔

امبرین جس موقع کی تلاش میں تھی، قدرت نے موقع بہت جلد اسے فراہم کر دیا۔ ملتان میں مقیم بڑی بھ اپنے دو بچوں کی شادیاں کر رہی تھیں۔ بیٹے کا رشتہ تو پہ سے طے تھا، بیٹی کا بھی رشتہ طے ہوا تو اس جھٹ پٹ شادی کا غلغلہ اٹھ گیا۔ بھانجے اور بھانجی کی شادی خوشی موقع تو تھا ہی، ایک بہترین بہانہ بھی تھا۔ گھر کو ایک کے لیے کنول کے اوپر چھوڑنے کا۔ سسر اور شوہر کے ہاتھ شوروں سے طے ہو گیا کہ امبرین بچوں کو لے کر جائے گی تو کنول اپنی فیملی سمیت یہاں رک جائے گی ویسے بھی وہ کون سا کہیں دور جا رہی تھی، ایک اسٹاپ سے

فاصلہ تھا۔ دو بچے اسکول جاتے تھے، وہ یہاں سے بھی جا سکتے تھے۔ ایک بیٹا ابھی چھوٹا تھا۔ وہ امبرین کی چھوٹی بیٹی کا ہم عمر تھا۔ کنول سے بات ہوئی تو وہ خوشی خوشی راضی ہوگئی۔

''ہاں، رک جاؤں گی میں۔ کتنے دنوں میں آ جائیں گی؟'' کنول نے آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ایک ماہ تو لگ ہی جائے گا۔ بارات لاہور جائے گی۔ وہاں سے واپس آئیں گے۔ پھر بھانجی کی بارات حافظ آباد سے آئے گی۔ وہاں ولیمہ اٹینڈ کرنے جائیں گے۔ ہر تقریب میں دو چار دن کا گیپ ہے سفر کی وجہ سے، تو اس لیے تین سے چار ہفتے لگیں گے۔'' امبرین نے تفصیل سے اسے سمجھایا۔

☆☆☆

امبرین کی روانگی شام میں تھی۔ کنول اپنے بچوں اور تھوڑے سے ضروری کپڑوں اور اسباب کے ساتھ دوپہر میں آ گئی تھی۔ کچھ اور اشیاء رات میں شوہر صاحب لے آئے تھے۔ رات میں اس نے قیمہ آلو مٹر پکائے تھے۔ ابو کے لیے پرہیزی کھانا پکتا تھا۔ ہلکے نمک مرچ اور تیل میں پکا ہوا مٹن یا کوئی بھی سبزی۔ فریج میں بھنڈیاں رکھی تھیں۔ کنول نے وہی فرائی کر دی تھیں ان کے لیے۔ سات، ساڑھے سات کے درمیان ابو گھر آ جاتے تھے اور آتے ہی ان کو کھانا چاہیے ہوتا تھا۔ مغرب کے بعد جیسے ہی ابو آئے، کپڑے بدل کر فریش ہو کر بیٹھے، کنول آئی۔

''کھانا لگا دوں ابو؟''

''کیا پکایا ہے؟''

''بھنڈی بنائی ہے آپ کے لیے۔''

''لیس والی چیزیں کیا میں کھاتا ہوں؟ معلوم نہیں ہے تمہیں۔'' وہ مزاج کے تیز تھے۔ بھنڈی کا نام سن کر ان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''اف۔'' کنول نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ نہ جانے کیوں وہ بالکل بھول گئی تھی کہ ابو لیس والی غذائیں کھاتے نہیں تھے۔ نہ بھنڈی، نہ اروی، نہ ماش کی دال۔

''اب کیا کروں؟'' اس کے منہ پر بارہ بج گئے۔ ابو بھوک کے کچے تھے اور غصے کے بڑے پکے۔ کنول نے تیزی سے کچھ سوچا۔

''قیمہ مٹر کھا لیں۔''

''پاگل ہوئی ہو۔ بڑا گوشت کہاں کھاتا ہوں میں۔ عرصہ ہو گیا کھائے ہوئے اور قیمہ تو میں مٹن کا بھی نہیں کھاتا۔'' ان کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔

''دیکھو میرے چکن کے کباب ہوں گے فریزر میں۔ امبرین کہہ رہی تھی کل کہ دو تین بچے ہوئے ہیں۔''

ابو نے کہا تو کنول کا چہرہ جو ابھی تک بارہ بجا رہا تھا، ایک دم فق ہو گیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ فریزر میں جو تین کباب بچے رکھے ہیں، وہ ابو کے لیے ہیں۔ شام میں بچوں کی فرمائش پر تینوں کو برگر بنا کر دے دیے تھے۔

''وہ..... وہ تو بچوں کو کھلا دیے تھے۔'' کنول کی زبان لڑکھڑائی۔

''شاباش ہے۔ بچوں کا خیال تھا جو سارا دن کچھ نہ کچھ چرتے رہتے ہیں۔ باپ کا کوئی خیال نہیں کہ بھوکا پیاسا تھکا ہارا کام سے آئے گا تو کیا کھائے گا بڈھا؟''

ابو کے صبر کا پیمانہ بس اب لبریز ہو گیا اور کنول اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کا غصہ بھی تیز تھا اور زبان بھی۔ جب بولنے پر آتے تو کوئی لحاظ نہیں کرتے تھے، نہ ہی یہ دیکھتے تھے کہ ان کے سامنے کون ہے۔

اس وقت بھی انہوں نے بے نقط سنا دیں۔

''کسی اور سیارے سے آئی ہو؟ اسی گھر سے بیاہ کر گئی ہو، آئے دن آتی جاتی رہتی ہو۔ میرے کھانے پینے کا تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں؟''

''بازار سے کچھ منگوا دوں؟'' کنول کی مت ماری گئی تھی، جو باپ کے غصے اور ڈانٹ سے خائف ہو کر پوچھ بیٹھی۔

''بازار کی چیزیں کھا کر تو اچھا بھلا صحت مند انسان بیمار پڑ جائے۔ مجھ بڈھے بیمار کو کیا قبر میں پہنچاؤ گی؟'' وہ تو بس بھڑک ہی اٹھے۔

''اچھا بھلا امبرین پکا رہی تھی میرا کھانا۔ میں نے ہی منع کر دیا تھا کل کہ تم اپنی تیاری کرنا جانے کی، کنول دیکھ لے گی رات کا کھانا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بھوکا رہنے پڑے گا۔'' وہ مستقل بول رہے تھے، اسی وقت امبرین کا فون آ گیا۔

''خاک پتھر کھا لیا، بھوکا بیٹھا ہوں۔ جو کباب تم

مدرسے لیے رکھ گئی تھیں، وہ بچوں کو پڑھا دیتی۔ میرے لیے ہلکا پھلکا بنا کے رکھ دیتی۔" تانیہ امبرین نے ان کے کھانے کے متعلق سوال کیا تھا، وہ چونک پڑے۔ پھر اس کی بات سن کر کنول کو دیکھا۔ "یہ بتایا کرو۔"

"کنول ابو کے لیے تھوڑی سی مونگ کی دال چنا دال دو، ذرا سی ہری مرچ ڈال کر پکا لو اور کل چکن کے کباب بنا کر رکھ دینا، ابو شوق سے کھا لیتے ہیں۔" امبرین نے بغیر کسی تمہید کے اسے جلدی جلدی دو چار ہدایات اور دیں اور خدا حافظ کہہ کے فون آف کر دیا۔

دھیرے دھیرے کنول ابو کی روٹین، عادات اور معمولات سے واقف ہو رہی تھی۔ کچھ معمولات نئے تھے اور کچھ پرانے مگر جنہیں وہ بھول چکی تھی۔

صبح سے اس کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی۔ صبح چھ بجے اٹھ جاتی۔ ابو کو ناشتے سے پہلے کھانے کی ایک گولی دیتی پھر وہ سات بجے ناشتا کرتے تھے۔ بچوں کو اسکول کے لیے اٹھاتی، شوہر بھی اٹھ جاتے دفتر کے لیے۔ کسی کو پراٹھے، کسی کو توس، کسی کو انڈا، کسی کو سیمن، مچھلی، شہد یا جیم۔ سب کی الگ الگ پسند کا ناشتا میز پر رکھتی۔ اس وقت اس کے ہاتھ پاؤں تیزی کے ساتھ چل رہے ہوتے تھے۔ بچوں کے لنچ باکس، شوہر کا، ابو کا لنچ، ساڑھے سات بجے وہ پھر کچی بنی گھر بھی راحتی۔ سب چلے جاتے تو ذرا سکون سے خود بھی ناشتا کر کے سارا پھیلاوا سمیٹنے اور صفائی ستھرائی میں لگ جاتی۔ خود اس کے اپنے گھر میں تو صفائی کے لیے ملازمہ آتی تھی مگر یہاں میں سارا کام امبرین خود کرتی تھی۔ ابو وہم کی حد تک صفائی پسند کے مالک تھے۔ گھر میں کسی ملازم یا ملازمہ کو رکھنے کے قطعی قائل نہ تھے۔

"کسی کا کیا بھروسا؟ لڑکیاں (امبرین) اکیلی ہوتی ہے، بری گھڑی آتے کوئی دیر تھوڑی لگتی ہے۔ خدانخواستہ کچھ ہو جائے تو؟" گھر میں ان کا حکم پتھر پر لکیر اور ان کی بات حرف آخر تھی، جس سے اختلاف کی جرأت کوئی نہ کر سکتا تھا۔ نہ بیٹا، نہ بہو۔ سو اب کنول صبح لیٹنے، سونے، آرام کرنے، ٹی وی یا موبائل میں غرق ہونے کے بجائے پورے گھر کی صفائی کرتی۔ لنچ تیار کرتی

کہ بچوں کو اسکول سے آنے کے بعد کھانا دینا ہوتا ہے۔

کھانا کھا کر برتن دھونے، کچن صاف کرنے تھوڑی دیر آرام کی غرض سے لیٹتی تو اپا فٹ اسے بلاوا آ جاتا کہ ابو اٹھ گئے ہیں۔ ان کے کپڑوں پر تقریباً ہر وقت ہی مختلف آئل کے دھبے لگ جاتے تھے۔ اس جھنجھٹ کو ختم کرنے کا آسان طریقہ یہ تھا کہ کپڑوں کی کوئی کمی نہ رہنے جانے کے لیے انہوں نے فقط دو جوڑے رکھے تھے۔ انہیں ہی اول بدل کر پہنتے تھے۔ دن میں دو بار ان کپڑوں کو تقریباً روز ہی دھلنے اور استری ہونے تھے۔ کنول نے بڑی مشکل سے اور محنت سے برش سے رگڑ رگڑ کر دھبے چھڑائے، دھونا ضروری تھا۔ اب دو کپڑوں کے لیے مشین کیا لگاتی پھر گارنٹی بھی نہیں تھی کہ مشین میں دھلنے سے کپڑے صاف ہو بھی جاتے۔ ابو نے بھی بتایا تھا کہ امبرین برش سے رگڑ کر ہی انہیں صاف کرتی ہے سو کنول بھی اس کی تقلید میں ہاتھ سے دھو رہی تھی۔

امبرین کو ملتان پہنچا کر اور ایک مایوں کی تقریب میں شرکت کر کے اشعر واپس آ گیا تھا۔ اس کی چھٹیاں بس اتنی ہی تھیں۔ پرائیویٹ نوکری میں اتنی چھٹیاں بھی مل گئیں تو غنیمت تھیں۔ بھائی کے آ جانے سے کنول کا کام اور ذمے داری تھوڑی اور بڑھ گئی تھی۔

چھٹی کا دن آیا تو کنول کو پتا چلا دن میں تارے نظر آ گئے۔ ابو کا ناشتا، کھانا تو اب کسی نہ کسی طرح تیز و طرار نمٹ جاتا مگر دوائیوں کی روٹین سے ابھی تک واقفیت نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے کاموں میں الجھ کر بھول جاتی۔ کبھی کھانے سے پہلے کی گولی بھول جاتی، کبھی کھانے کے بعد کی دوائیاں رہ جاتیں۔ جو وقفے وقفے سے دو تین بار دینی ہوتی تھیں، پھر ابو کی بڑبڑاہٹ شروع ہو جاتی۔

"سب اپنے مطلب کے ہیں، سگی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے میاں اور اپنی اولاد کے سارے معاملات یاد رکھتے ہیں۔ باپ کی دوائیاں کسی کو یاد نہیں رہتیں۔ امبرین ہوتی تو سارے کام چھوڑ کر پہلے مجھے دیکھتی تھی۔" ان کی باتیں سن کر کنول کبھی نادم ہوتی، کبھی جھلا جاتی۔

لوگ کہتے ہیں کہ بوڑھا اور بچہ برابر ہوتے ہیں۔ مگر بعض بوڑھے ایسے ہوتے ہیں جو بیک وقت کئی بچوں کے برابر

ہوتے ہیں اور بچے بھی ایسے جو بیک وقت تھوڑے ضدی، تھوڑے اڑیل، تھوڑے بدتمیز، تھوڑے بدلحاظ ہوں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی خاص سوغاتیں مثلاً تھوڑا خبطی اور سنکی پن بھی ہو تو سونے پہ سہاگا والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

چھٹی کا پہلا اتوار کنول کے اعصاب کے لیے ایک امتحان بن کر آیا تھا۔ بچوں نے حسب معمول ٹی وی کھولا اور اپنی مرضی اور پسند کے پروگرام دیکھنے لگے۔ ایک گھنٹے بعد ہی ابو جان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"کتنے گھنٹوں تک کھلا رہے گا ٹی وی؟ بل آتا ہے بجلی کا۔ خود کو بھرنا نہیں ہے تو درد بھی نہیں ہے۔ مال مفت دل بے رحم۔"

"اف۔" کنول نے جز بز ہوتے ہوئے چور نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ جنہوں نے میچ دیکھنے کے لیے ابھی ابھی چینل تبدیل کیا تھا۔ ابو کی آواز ان تک باآسانی پہنچ رہی تھی۔ تب ہی وہ ٹی وی بند کر کے خاموشی سے ڈرائنگ روم میں چلے گئے مگر اتنے بھلے مانس نہیں تھے کہ بیوی کے سامنے بھی چپ ہی رہتے۔

"ابو کبھی کبھی بولتے بہت ہیں، یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ سامنے کون ہے۔" دامادوں والا خصوصی پروٹوکول نہ ملنے پر بیوی کے آگے شکوہ کر ہی بیٹھے۔

"ابو کی عادت ہی ایسی ہے۔ وہ تو بھائی اور بھابھی کو ایسے ہی بے نقط سنا دیتے ہیں۔"

کنول ایک بے چاری سی مسکراہٹ کے ساتھ بس یہی وضاحت کر سکی۔

☆☆☆

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے۔ کنول کے چودہ طبق روشن ہوتے جا رہے تھے۔ شوہر صاحب کا منہ بن رہا تھا اور مزاج بگڑ رہا تھا۔ بچے الگ تنگ اور نالاں ہو رہے تھے۔ ان کے شور مچانے پر، کھیلنے، اچھلنے کودنے پر، ٹی وی دیکھنے پر، بے وقت آنے جانے پر۔ ہر بات پر پابندی لگی۔ ابو کچھ نہ کچھ بول دیتے، کبھی بچوں کا منہ بن جاتا۔ کبھی کنول کے شوہر کا۔ برا تو کنول کو بھی بہت لگتا تھا مگر باپ کا کچھ خوف تھا، کچھ لحاظ، بلند اضبط کر جاتی۔

تین ہفتے جیسے تیسے گزر گئے۔ اب تو وہ ایک ایک دن گن رہی تھی کہ کب یہ ہفتہ بھی پورا ہو۔ امبرین آئے اور وہ اپنے گھر جائے۔

میکا یقیناً بہت پیارا ہوتا ہے مگر اس وقت جب یہاں صرف مہمان بن کر کھانے پینے، سونے اور آرام کرنے آیا جائے۔ ذمے داریوں اور کام کے ڈھیر کے ساتھ تو اب اسے یہاں رہنا بھی بیگار لگ رہا تھا۔ وہ تو بس اتوار کے دن کا انتظار کر رہی تھی، جس کی شام میں امبرین اور بچے واپس آ رہے تھے۔ پھر وہ اپنے گھر جانے کے لیے آزاد تھی، جہاں صبح شوہر اور بچوں کو بھیجنے کے بعد وہ آزاد ہوتی تھی۔ یہاں پچھلے تین ہفتوں سے وہ ایک دن کے لیے بھی کہیں نکل نہیں سکی تھی۔

عام دنوں میں تو خیر کام ہی ہوتا تھا۔ چھٹی والے دن عموماً شوہر اور بچوں کے ساتھ آؤٹنگ پر چلے جاتے تھے۔ یہاں آ کر اس سے بھی گئے۔ ابو کو نہ گھر اکیلا چھوڑنا پسند تھا، نہ گھر پر اکیلا رہنا ان سے برداشت ہوتا تھا۔ شعر چھٹی والے دن بھی اوور ٹائم کر کے پیسے کما رہا تھا تاکہ شادیوں اور سفر کے اخراجات مینج کر سکے۔

چھٹی والے دن بھی ابو بڑبڑاتے رہتے بلکہ بڑبڑاتے کیا بیٹی داماد کو سناتے رہے۔

"کسی کو فرصت نہیں، دو گھڑی پاس آ کر بیٹھ جائے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں الجھے رہتے ہیں۔ میرا بیٹا اور بہو ہوتے تو یوں اکیلا ایک کونے میں نہیں پڑا ہوا ہوتا۔" داماد صاحب نے پورا مہینہ سن سن کر برداشت کر ہی لیا مگر آخری دن ناشتے کے دوران جب ابو نے کسی بات پر ہنس کر طنز کیا۔

"ہاں بھئی تمہارا تو اس پورے مہینے کا خرچا بچ گیا، مزے آ گئے۔"

بات تو سچ تھی مگر سچ کڑوا بھی تو ہوتا ہے۔ کنول تلملا گئی۔ داماد صاحب بچوں کو لے کر تین فن کرتے گھر چلے گئے۔ کنول بے چاری شام تک انتظار کرتی رہی کہ امبرین آئے تو وہ بھی اپنے گھر جائے اور جب امبرین آئی تو اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی آنکھوں میں اور کنول کے چہرے پر صاف صاف لکھا تھا۔

"کسی کی کمائی کھانا آسان نہیں ہوتا۔"

☆☆

منعم ملک

پھر اسی راہ گزر پر

۲۱ ستمبر ۲۰۰۵ء

وقت مغرب، سرمئی پھیلتی رات.....

میرے پیارے دوست عادی.....!

دعا کر رہا ہوں کہ زندگی تم پر چاروں جانب سے مہربان ہو اور تم بالکل اسی بے فکری سے خوش و مگن ہو جس میں تم لوگوں کو میں مرنے سے پہلے چھوڑ کر گیا تھا..... یہ خط آسمانوں کی وسعتوں میں اللہ کے کہیں بہت آس پاس ہو کر باقیوں کے بجائے تمہیں صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کیوں کہ ان گنت سال گزر جانے کے باوجود مجھے یاد ہے کہ تمہیں ہم سب کا سربراہ بننے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا.....

تم..... میرے بھائی، نہیں بلکہ بھائی سے بھی بڑھ کر..... ماں جیسی محبت کے قریب قریب..... تم جان قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے ناں، تو یہ حوصلہ تو صرف ایک ماں میں ہی ہوتا ہے۔

ہم چار تھے عادی..... اور اب بھی چار ہیں۔ یقیناً میں اب بھی تم لوگوں میں موجود ہوں..... کبھی کے نغموں میں، یادوں کے ترانوں میں، آنکھوں کی نمی میں..... اور دلوں کے جذبات میں بھی۔

مجھے ایک شکوہ ہے کہ میرے مردہ لبوں پر چٹکی مسکان دیکھ کر تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں جو اپنی بہن کے لیے اتنا فکر مند رہتا تھا اب ہر فرض سے وقت سے پہلے منہ موڑ چکنے کے بعد بھی مرتے وقت کیوں مسکرایا ہوں گا؟ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں عادی کہ میری جان لیتے وقت موت کے فرشتے نے سر گوشیانہ استفسار کیا۔

"تمہارے بعد تمہاری ماں اپنی واحد لاٹھی کا درد اور تمہاری بہن اپنے سر کا مان تمہاری قبر کی کس مٹی میں گھول کر پئیں گی؟"

بس اسی ایک پل کے رتبے میں مسکرایا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے تم تین آئے تھے۔ اللہ نے کسی کو بے سہارا اب چھوڑا ہے..... ہر کسی کے لیے زندگی جینے کے بہت آسرے موجود ہوتے ہیں اور پھر تم تو تھے بھی تین تین.....!!

میں جانتا ہوں تم نے اپنی بہن کی ذمہ داری بہت اچھے سے نبھائی..... اس کی بہترین جگہ شادی کی اور بھلے جتنی بھی مشکلیں تمہاری زندگی میں آئی ہوں گی..... تم اپنے ضمیر کے آگے سرخرو رہے ہو گے۔

اماں نے کچھ عرصہ بعد آ کر مجھے سب بتایا تھا کہ تم میری محبتوں کے بھی امین رہے..... اور دوستی کا بھی حق ادا کیا۔ آنکھیں نم ہو گئی تھیں کہ میرے اتنے انمول دوست تھے اور انمول واقعی صرف "دوست" ہی ہو سکتے ہیں۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ میری زندگی چھن گئی..... کاش میں اس زندگی میں تمہارے احسان اُتار پاتا۔ بہنیں بھائیوں کا دل ہوتی ہیں..... تم نے اُس "دل" کی حفاظت کر کے جو مجھے سانسیں دی ہیں وہ ایک موت سے کبھی نہیں ڈوب سکتیں۔ اسی لیے میں تم لوگوں میں زندہ ہوں میرے دوست.....!

آزمائش صرف ایک انسان پر اُترتی ہے اور اللہ بلا مقصد کبھی اُس انسان پر نہیں اُتارتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اُس انسان کا ظرف دیکھ کر اُسے اس آزمائش

کے لیے چنا ہے تاکہ وہ سرخرو ہونے کا حوصلہ خود میں رکھ سکے اور وہ انسان بہت "خاص" ہوتا ہے جو اُسے رشتوں کی قدر ہوتی ہے، اور اپنوں کی پرکھ۔ جو کٹھن وقت میں وفا نبھانا جانتا ہو..... اور مرض کی شفاء بننا بھی۔ پھر مجھ سے بڑھ کر کون جانتا ہوگا کہ میرے دوست بھی "خودغرض" نہیں ہوسکتے.....

اپنی بہنوں کا بہت خیال رکھنا..... اور باقی دونوں شیروں کا بھی۔ اللہ سے تم لوگوں کے لیے بہت دعا گو رہتا ہوں..... پھر بھی کوئی پھانس سی ہے جو نکلتی ہی نہیں۔

خیر اب اجازت چاہتا ہوں کہ اتنا بہت ہوگا

عالم ارواح سے تمہارا دوست

شیر دل!

☆☆☆

گاؤں کی کچی گلیوں میں تڑکے کا کھیتوں میں گیا کسان اپنی بیلوں کی جوڑی لیے گھر کو لوٹ رہا تھا..... جھٹپٹے کے سے آسمان پرندوں سے خالی اور گلی میں

اٹھتی ہلکی ہلکی گرد کے ساتھ بیلوں کے گلے میں جھولتی گھنٹیوں کی آواز صامت فضا میں ارتعاش سا پیدا کر رہی تھی۔ ایک طرف دور چلتی چکی کی ہک ہک..... اور دوسری طرف گلی کی نکڑ سے کسی شکست خوردہ مسافر کی طرح قدم دھرتے شخص کی حالت پر ملگجے سے اُجالے میں اداسی مدغم ہونے لگی تھی۔ ہاتھوں میں پنک جالی دار فراک والی بڑی سائز کی گڑیا کی ساتھ چند کھلونے..... اور دوسرے ہاتھ میں کاغذوں کی فائل پکڑے وہ جھکی گردن کے ساتھ قدم گھسیٹ رہا تھا۔ اُس کے وسیع صحن والے گھر کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو تندور پر پکتی روٹیوں کی بھینی بھینی سی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ بھوک کا شائبہ تک نہ ہوا۔

"سونیا..... میری گڑیا سونیا....." اُس نے آواز میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے پکارا تو اُس کی بیوی بھرتی سے پکی روٹیوں کی چنگیر اٹھاتی اس کی سمت پلٹی۔ باقی سب تندور پر ہی رہ گیا۔

"بروقت آئے تم..... چلو ہاتھ دھو کر بیٹھو، میں رکابی میں سالن نکال کر لاتی ہوں۔" رنگ برنگی چادر والی چنگیر رکھ کر اس نے محبت سے شوہر کو کہا۔

"فیروزہ، سونیا کہیں ہے، نظر نہیں آ رہی؟" اس نے بے چینی سے پھر بیٹی کی تلاش میں نظر دوڑائی۔

"یہیں ہے نا وہ..... تم روٹی تو کھالو، ویسے بھی ایک دفعہ روٹی نے حرارت کھو دی تو تم سے رغبت سے نہیں کھائی جاتی۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم، سونیا کو بلاؤ..... کچھ سنائی دے رہا ہے تمہیں؟" اُس کے ماتھے پر الجھن آمیز شکنیں نمودار ہوئیں تو فیروزہ ہنس پڑی۔

"اسے بخار ہو رہا ہے عدیل، پھر سے۔"

"تو دوائی.....؟"

"ہوں..... دی ہے، ذرا دیر پہلے ہی آنکھ لگی ہے اُس کی۔" ہنکارا بھر کر اس نے جواب دیا تو ایک مجبور باپ کی طرح وہ لب بھینچے چارپائی کے کنارے گرنے والے انداز میں ٹک گیا۔

"میری بیٹی بہت تکلیف میں ہے۔" ٹوٹتے اُجالے میں عدیل کی بھری آنکھوں کے آنسو بڑے سیاہ تھے۔

"وہ کب تک بھگتے عدیل..... نہ کچھ غذا ہے بدن پر ماس، وجود الگ سوکھ کر کانٹا..... شہر والے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

عدیل نے رپورٹس کی فائل اس کے حوالے کی۔ وہ انگریزی پڑھنے سے نابلد تھی۔

"اس میں کیا ہے؟"

"سونیا کی اوپن ہارٹ سرجری ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے فیروزہ..... جلد از جلد۔"

"وہ کیوں عدیل؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پریشانی سے اپنے مجازی خدا کی تاریک صورت تکنے لگی..... جو ضبط کے کڑوے گھونٹ اُتارتا پل صراط پر لڑکھڑا رہا تھا۔

"سونیا کی زندگی خطرے میں ہے..... ہماری ننھی معصوم پری کے دل میں سوراخ ہے۔" وہ بیوی کا آنچل پکڑ کر رو پڑا..... جیسے ڈوبتی چیونٹی تنکے کا سہارا لیتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کو کانٹا چبھنے پر بھی بلبلا اٹھنے والا موم تھا۔ تندور کے دہکتے انگاروں پر بھی کبھی کی دھوئی کی تیز بیلی گڑوی، فیروزہ کے نتھنوں تک اب آئی اور اندر رچ بس گئی۔

☆☆☆

صفیان کا منہ پھول کر خطرناک حد تک میں داخل ہو چکا تھا..... اور اسی کے مقابلے میں ساتھ دیتے شیر دل کے بھی جبڑے بری طرح ڈکھتے اب تشویش ناک حالت میں تھے۔

"میں نے اپنی ساری زندگی کبھی کوئی فرمائش یا ناجائز خواہش نہیں کی..... تو اب آپ لوگوں کو ہماری فریادوں پر کان دھرنے پڑیں گے۔" تیرہ سالہ صفیان جو اینٹھ اسٹینڈرڈ میں تھا، ماں کے کان کے پاس چلا کر بولا۔

کپڑے پریس کرتی رضیہ استری اسٹینڈ سے

ہنی اور بڑی فرصت سے اُسے دیکھا۔

"وہ اس لیے دادا حضور کہ آپ کی ہر خواہش بنا کہے آپ کے ابا پوری کرتے رہے ہیں، پھر بھی آپ نے آج اس کا رونا رو ہی دیا..... کتنی بری بات ہے۔" رضیہ نے مصنوعی سا ڈانٹتے ہوئے کہا تو لمحے بھر کو چپ رہ کر اُس نے نگاہوں سے فوراً شیر دل کو مدد کا اشارہ کیا..... جو اس سے ایک سال سینئر تھا..... کلاس میں بھی اور ایج میں بھی۔ لیکن دونوں ہی اپنی عمروں سے کافی چھوٹے لگتے تھے۔ شیر دل گڑبڑا کر آگے آیا۔

"پاپا پلیز آپ ہی مان جائیں نا..... "فورٹ منرو" دور ہی کتنا ہے یہاں سے، یہ بازو لمبا کیا اور یہ ہاتھ فورٹ منرو کو جا لگا..... اور آپ اجازت ایسے نہیں دے رہے جیسے "کوہ قاف" کے سفر پر جانا ہے۔" شیر دل خفگی سے کہہ کر باپ کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھ گیا۔

شاہ میر لاؤنج میں صوفہ پر بیٹھا لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا۔ گلاس وال سے سورج کی کرنیں منعکس ہو کر اُس کے چہرے کی چمک و شادابی کو مزید نمایاں کر رہی تھیں۔ بڑے بیٹے کے شکوے پر اس نے نفی دہائی۔

"تو بیٹا جی آپ بھی کوشش سے تھوڑا مزید لمبا کر کے فورٹ منرو کے بھائیوں کو بھی بھیج دیجیے ناں..... اتنی کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟" اُس نے سنجیدگی سے شیر دل سے سوال کیا تو اُس کی ناراضی دو چند ہو گئی۔ شاہ میر ہنستا ہوا رضیہ سے گویا ہوا۔

"سنا بیگم پولیس والوں کے لمبے ہاتھ آپ نے سنے ہوں گے..... مگر آپ کے شیر کے تو بازو ہی بہت لمبے ہیں۔" رضیہ مسکرا اٹھی۔

"پاپا....." دونوں نے یک زباں ہو کر صدائے احتجاج بلند کی۔

"آپ نے کبھی کہیں نہیں جانے دیا ہمیں..... یہاں تک کہ نہ کبھی نانو کے گھر نہ کوئی اور خونی رشتہ..... اور تو اور آپ کے کوئی فرینڈز بھی نہیں۔" شاہ میر کے چہرے پر ایک رنگ سا گزر گیا تو رضیہ نے بری طرح گھورا۔

"پاپا کو تنگ مت کرو..... وہ کام کر رہے ہیں۔"

"یار میں نے کہا نا، اگر تم دونوں کا بہت دل ہے تو چند دنوں تک اپنا شیڈول مینج کر کے ہم سب وہاں گھوم آتے ہیں، پھر کیسا اعتراض؟" شاہ میر اپنا کام ترک کر کے اُنہیں دیکھنے لگا جو باپ کی توجہ پا کر ایک دم مزید سرگرم نظر آنے لگے تھے۔

"پاپا یہ اسکول ٹرپ ہے اور ہمارے سارے فرینڈز اینڈ ٹیچرز ہوں گے، ہم نے ایسے ٹرپ کبھی جوائن نہیں کیے..... پلیز اس دفعہ ہمیں جانے دیں۔ ہمیں ان کے ساتھ زیادہ مزا آئے گا۔" شیر دل نے بہت اصرار سے کہا تو شاہ میر نیم رضا مندی سے اُسے دیکھنے لگا۔ پھر بے چارگی سے بولا۔

"بیٹا وہاں کے راستے....."

"اچھا گمان رکھیں پاپا..... اور ہمیں اجازت دے دیں۔" بہت پیار سے ہنستے ہوئے اُس نے باپ کا دل موم کیا اور مزید لاڈ کے لیے چہرے پر اُمید افزا تاثرات پھیلا لیے۔

"چلو بھئی بیگم ان دونوں کو اب دو بڈھوں کے ساتھ مزا نہیں آنے والا..... تو آپ بھی مان جائیے۔" شاہ میر نے ہار مانتے ہوئے بیوی کو چھیڑا تو اس نے گھور کر منع کرنا چاہا۔

"اوہ۔ گریٹ پاپا! ایسا بالکل نہیں ہے، یو بوتھ آر ٹو ینگ..... تو ہم چلے جائیں؟"

"ہاں لیکن اپنے ٹیچر سے بات کروا دینا۔" اس نے پیار سے گال تھپتھپائے تو وہ دونوں خوشی سے چلا اٹھے۔

"یاہووو..... اچھے پاپا، تھینک یو سو مچ..... لو یو مما۔" وہ آگے پیچھے نعرے لگاتے قلانچیں مارتے لاؤنج سے باہر نکل گئے۔ گلاس وال سے دھوپ ابھی تک ٹکرا رہی تھی۔

☆☆☆

بالوں کو مگن سے انداز میں اُوپر کی طرف جماتا وہ کمرے میں داخل ہوا، تو لبوں پر "Brown girl in the rain" (براؤن گرل ان

دارین) گنگنا رہا تھا۔ بڑی سی الماری کے پٹ کھول کر اُس نے چند مطلوبہ چیزیں حاصل کیں اور اسی رواں انداز میں زور لگا کر سوٹ کیس باہر کی طرف کھینچا..... چند دوسرے کپڑوں کے ساتھ کوئی چیز دھپ سے فرش پر جا گری۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بوسیدہ سی کوئی کتاب تھی..... اور اس کی جلد سیاہ تھی۔

☆☆☆

میرو..... عادی..... شیرو..... وسی.....!!

ہم چار انتہائی گہرے دوست..... بلکہ گہرائی پہ بات لے جانا بھی زیادتی ہوگی کہ ہماری محبت کی پیمائش کہاں ممکن ہے۔ ہم چاروں ہی ایک دوسرے کے لیے شدت پسند ہیں، اور جان نچھاور کر دینے والے..... ایک سکول، ایک کلاس، ایک مدرسہ..... اور ہر جگہ ایک ساتھ پایا جانا۔ ہم چار لوگ کم، اور ایک شخص کے چار سائے زیادہ لگتے ہیں۔

گاؤں کی امن پسند فضا میں، بے فکری کی ہر قسم کو آزما کے گلیوں میں کھیلتے، ہر سوں کے کھیت برباد کرتے، بکری کے بچے سٹوں کے ملائم بال نوچتے اور گرمیوں کے منہ سے شعلے نکالتے سورج کے عین نیچے نہر میں نہانے کے ساتھ ساتھ کنارے پار چوری کے فالسے توڑ کر کھانے میں جو لطف تھا، زندگی مانو یہیں کہیں تو تھی..... اپنی اپنی اور بس یہی۔

بستی میں کوئی شرارت ہوتی تو پورے یقین سے کہا جاتا۔ ''ان ہی چاروں کا ہاتھ ہوگا۔''

ایک واقعہ یوں ہوا کہ ماسی حاجرہ کے بیٹے کو ہمارے ساتھ ہاتھ ملانے کا شوق چڑھا۔ اُس نے دوستی کی خواہش میں ہم چاروں کو کھانے پر بھی بلا لیا کہ اُس وقت کنجوس ماسی حاجرہ گھر پر نہیں تھی۔ ساگ بغیر مکھن یا دیسی گھی کے تڑکے کے حلق سے نہ اُترتا تھا..... ہم چاروں پھوہڑ اور وہ ہم سے دو ہاتھ آگے۔ ماسی حاجرہ کے فریج میں سنبھال کر رکھا گیا گھی بہت جما ہوا تھا۔ اسے پگھلا کر ساگ میں تڑکا لگانے کا خیال بے شک ہمارا اپنا..... لیکن اسے کس نے مشورہ دیا تھا کہ پوری بالٹی ہی چولہے پر رکھ چھوڑے۔ غور کرنے پر گھی اپنی سطح سے نیچے تشریف لے جاتا نظر آیا تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہو کیا رہا ہے۔ یہ تو بعد میں دماغ نے الارم بجایا کہ پیلی گھی والی بالٹی پلاسٹک کی بنی ہوئی ہوتی ہے جو اس ظلم کی تاب نہ لا سکتے ہوئے نیچے سے کھسک گئی ہے۔ اُسی لمحے ماسی حاجرہ کہیں سے نمودار ہوگئی اور اُبلی آنکھوں کے ساتھ بیٹے کا جو حشر کیا..... اُس کے بعد سے وہ ہم سے کئی قدم دور رہ کر ہمیشہ چلا۔ ماسی حاجرہ کی شکایت کرنے پر امی جان بہت برافروختہ ہوئیں۔

''میرو تم لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہے..... میں تمہیں شہر لے جاؤں گی۔''

''نہیں.....'' یک زباں ہو کر تین چیخیں سنائی دی تھیں۔

''ساری غلطی ہماری ہے، میرو تو تب ساتھ تھا بھی نہیں.....''

امی جان کے پاس شہر لے جانے کی دھمکی ایسے موجود تھی جس کے ذریعے وہ کبھی بھی ہم چاروں کی دُم پر پاؤں رکھ دیتیں۔ اُن کا خواب تھا مجھے تعلیم دلوانا..... اور وہ بہر حال کبھی نہ کبھی شہر شفٹ ہو جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

یہ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ ساون دور تھا..... اور بارشیں، ہوائیں موسم سے خفا۔ ایسے دنوں میں ہر سال میلے سجا کرتے تھے اور میلے بھی پورے ٹھاٹ اور جوبن کے..... ہفتوں پہلے اس کے قصے جگہ جگہ سنائے جاتے اور دن تو میں کہوں اُنگلیوں پر کٹتے تھے۔

ہم چاروں کا جوش دیدنی تھا مگر نانا جان کے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔ وہ ایسی تفریحی جگہوں پر آوارگی سمجھ کر ان کے بالکل خلاف تھے۔

''میرو تم ذہن سے یہ خیال نکال دو کہ تم میلہ گھومنے جاؤ گے۔''

''مگر نانا جان ہمارا بڑا دل ہے.....'' نانا کے سطوت کے سامنے منمنائی سی آواز تھی میری۔

''میں نے کہا نا شاہ میر.....'' انہوں نے مزید کڑک آواز میں کہا۔ ''وہاں دھما کا ہونے کا خطرہ

ہے، تمہیں ہرگز اجازت نہیں ہے۔'' سفیدے کا پودا لگاتے ہوئے اُنہوں نے بات ختم کردی اور ہم چاروں مایوس سے نہر پنسال کے کنارے بیٹھے کچا سبزہ نوچ رہے تھے۔

''نانا ہمیں ڈرا رہے ہیں بس..... ایسا کچھ نہیں ہوتا۔'' شیرو واقعی شیر دل تھا۔ سب سے پہلے وہی بول اُٹھا.....

عادی جو کب سے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کسی معتبر شخصیت کی طرح کھنکار کر بولا۔

''کل کسی بھی طرح گھر سے جھوٹ بول کر باہر آجانا سب لوگ..... میلے تک لے جانا میرا کام۔''

اُس کی بات پر سب ''لبیک'' کہتے ہوئے دل وجان سے راضی تھے۔

اگلی صبح کی دھوپ بہت تیکھی تھی۔ بستی کو سڑک سے ملاتی کچی پگڈنڈی پر ہم چاروں کندھے جوڑے چل رہے تھے۔

میلے کے دن گہما گہمی بہت ہوتی..... اور سواری بھی مشکل سے ملتی ہے۔ اب کی بار میلے میں ایک سرائیکی کامیڈی ایکٹر کی آمد کی افواہ تھی، جس نے براہ راست اسٹیج پر فارمنس دینا تھی۔ اور ہم سب کو اُسے دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ راستے میں چلتی ایک بیل گاڑی پر لٹک گئے۔

بیل گاڑی خراماں خراماں ہمکو لے کھاتی..... ہمیں کبھی ادھر کبھی اُدھر اُچھالتی بڑھتی رہی اور ہم چاروں اپنی پسلیوں کا امتحان لیتے رہے۔

میلہ ایک وسیع رقبے پر پھیلا تھا۔

اسٹیج پلے، لگی ایرانی سرکس اور پھڑکیلے کپڑوں وشوخ میک اپ تھوپے ڈانسرز کے رنگین اشتہارات..... اُونچے بہت اُونچے فلک بوس دائروں والے جھولے، لمبی قطاروں میں لگی دکانیں، میلے کی خاص تازہ پکتی مٹھائیاں و دیگر پکوان..... ایک طرف یخ مشروبات سے لوگ لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ہم چاروں اُس فنکار کا پتا پوچھتے وہاں پہنچے جہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ شامیانوں کی دیواروں کے اندر شو چل رہا تھا..... مائیک کی آواز اُس کے ہونے کا پتا دیتی تھی۔

''ٹکٹ.....؟'' ایک لمبی مونچھوں والے خرانٹ سے آدمی کے منہ سے مطالبہ سن کر ہمارے منہ کھل گئے۔

''میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں.....'' مجھے بڑا دکھ ہوا۔

شیر دل نے فوراً میلے کا بازار دیکھنے کا ارادہ کرلیا۔ سب کے پیسے ملا کر بھی عادی اور وسی کے ٹکٹ کی رقم ہی بن سکی۔

میری نگاہیں اچانک سامنے اُٹھیں اور دل باغ باغ ہوگیا۔ لاکھ اُچائی سے خوف کھانے کے باجود اُس دن میں شیرو (شیر دل) کی مدد سے درخت پر چڑھ گیا..... جس کی اُونچی شاخ پر بیٹھ کر شامیانے کی چھت و دیواروں کے بیچ کے جھروکے سے پورا شو بغیر ٹکٹ کے دیکھ لیا۔

اندر وہ اپنی محبوبہ کو منانے کے لیے بے ڈھنگے انداز میں گا رہا تھا۔

آ آ آ ای ای اُو
میرا دل نہ توڑو
روٹھ کے نہ جاؤ میری ماں

''ماں.....'' اچانک اُس کا باپ نکل کر طنزیہ گویا ہوا تو اُس کی سٹی گم ہوگئی۔ ''نہ ابا..... ماں ہوسی تیڈی..... میڈی تے بہن اے۔''

''وے بھا لگی..... میں بہن آں تیڈی۔''

محبوبہ ایک دم پل پڑی اور ناظرین کے اُبلتے قہقہے..... اسی بات پہ قہقہہ لگاتے ہوئے میں جوں ہی اُچھلا، شاخ ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں اگلے ہی پل دھڑام سے زمین پر..... اس دن میرا گال سوج کر اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔ یہ ہی نہیں درخت کے تنے کے پاس اُتاری گئی میرے جوتی نداردھی۔

''شیرو میرے نئے جوتے.....'' میں نے منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا تو اُن کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جوتوں کی واردات ہوگئی تھی شاید..... امی جان کے خوف

سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اگلا پڑاؤ "کشتی جھولا" تھا۔

پیسے شامل کر کے سب اُوپر چڑھ آئے اور لکڑی کے پھٹوں پر براجمان ہو گئے۔ یہاں بھی ہماری شرارتیں جاری تھیں..... میرے قریب ایک عورت بیٹھی تھی جس کی کوکھ میں میری کہنی جا لگی۔ مائی نے دو ہتڑے رسید کیے۔

"وے توں اندھا ایں..... دیکھ بھی سہی کہ میں پیٹ کے ساتھ ہوں۔" وہ سرائیکی میں چلا کر بولی جو مجھ پر ناگوار گزرا۔

"نہ تے میں کیا کراں..... میں بھی اپنے پیٹ کے ساتھ ہی ہوں۔" میری بات پر وہ حیرت سے ناک پہ اُنگلی ٹکا کر دیکھنے لگی۔ شیر دل بھڑک گیا۔

"اُو مائی، میرو کو کچھ نہ کہنا۔"

اسی اثناء میں جھولا رواں ہو گیا۔ شروع میں جوش و خروش سے جو شور بلند ہو رہا تھا، وہ جھولے کے رفتار پکڑتے ہی خوف ناک چیخوں میں بدل گیا۔

چکراتے دماغ..... خوف سے اُبلی آنکھوں کے ساتھ جھولے کے شور میں دبتیں ہماری چیخیں..... کہیں کچھ اثر نہ ہوا تو میں نے ساتھ بیٹھی عورت کے بازو میں دانت گاڑھ دیے، جس کی بھیانک درد انگیز چیخیں ہماری چیخوں کے ساتھ شمولیت اختیار کر گئیں، خدا خدا کر کے جھولا روکا گیا۔ ٹکٹ کے پیسے جو ملیامٹ ہوئے سو ہوئے، مٹھیوں نے الگ آدھ مُوا کر کے رکھ دیا۔

میں ننگے پاؤں بغیر شرم کے پورا میلہ گھومتا رہا، لیکن جوتے کھو دینے کا غم بہت زیادہ تھا۔ ایک جگہ عادی کو روک کر میں نے کہا۔

"امی جان مجھے گھر نہیں گھسنے دیں گی، میرے جوتوں کا کچھ کرو۔" میں روہانسا ہو رہا تھا۔ ان سب میں کم ہمت اور بہت زیادہ حساس میں ہی تھا۔

"اُس کی فکر تم کیوں کرتے ہو..... میں کس لیے ہوں۔" شیرو نے کہا۔ ساتھ ہی ہاتھ جیب میں گئے۔ شاید پیسے..... مگر اُس کے ہاتھوں نے جیب سے مُڑے تُڑے جوتے برآمد کر لیے، تو میرا پھولا منہ مزید نہ کھل سکا۔

"تم پورا دن جوتے جیب میں رکھے گھومتے رہے؟" وسی کے حیرت نما سوال پر تینوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ واپسی پر رات کے سائے پھیل چکے تھے۔

اُن تینوں نے نانا جان کے گھر کی کچی دیوار پار کراتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

"اُدھر کوئی ہے؟"

"اُدھر کوئی نہیں ہے..... کیونکہ "کوئی" تو یہاں ہے۔" نانا جان کی کرخت آواز جو دیوار پار اُن تینوں کے پیچھے سے اُبھری تھی۔ سب کا دم نکل گیا۔

☆☆☆

گول میز کانفرنس پہلے ہی کی جا چکی تھی۔ جس میں چار خواتین، تین لڑکیوں اور ایک مرد سربراہ نانا جان نے شرکت اختیار کی۔ ہم سب کو ایک کونے میں مرغا بنا کر اپنی بید کی چھڑی ہاتھوں میں گھماتے ہوئے یہاں سے وہاں چکر کاٹ رہے تھے، اور خواتین کی زبان پکڑنے والا کوئی نہ تھا۔

"میرو تم نے سخت مایوس کیا ہے مجھے..... آئے تمہارے باپ کی کال سعودیہ عرب سے، خدانا خواستہ کچھ اور ہو جاتا تو کیا جواب دیتی میں اُن کو..... اور ابا جی آپ نے کہا تھا کہ آپ نے کہہ دیا اور کافی ہو گیا، یہ ذمہ داری لی تھی آپ نے عطا محمد سے۔" امی جان کا غصیلا لہجہ نانا جان کا مزید غضب جگا رہا تھا اور ہمارے جسم ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

"میں نے تو عادی کی جیب سے سارے پیسے بھی نکال لیے تھے..... پھر کہاں سے یہ جرمن کی فوج نکل پڑی۔"

عادی کی ماں سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔ ہمارے چاروں کے کسی افلاطونی دماغ میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ہماری غیر موجودگی بھلے کتنی دیر ڈھکی رہے گی، اور پریشانی سے گھر والوں کا کتنا برا حال ہو سکتا ہے۔

"چاچا جی میں کہہ رہی ہوں ان سب کو شیرو کی

ہلاک کر گیا ہوگا..... کتنی دفعہ کہا ہے اسے کسی کام پر ڈلوا دیں یہ بندوبوں نہیں بیٹھنے والا۔" شیرو کی ماں بہت سادہ خاتون تھیں لیکن اس وقت خاصی ناراض تھیں۔ قریب دبک کر بیٹھی بچیاں لڑکیاں پہلو پہ پہلو بدل رہی تھیں۔ نانا جان نے گھرک کر کہا۔

"کیا تکلیف ہے تم تینوں کو؟" تینوں فوراً معصوم بن کر پیچک گئیں۔ (ماؤں کے ناجائز چھپائے گئے پیسوں پر بھائیوں کے لیے چوری شب خون مارنے والی وہی تین معصوم تھیں۔)

"معاف کردیں نانا جان..... آخر ماؤں کے فرزند ہیں۔" عدیل نے اپنی اُردو جھاڑی تو نانا جان نے جھٹ چھڑی رسید کردی۔ وہ کتنی دیر اوہ، آہ کرتا رہا۔

"سچ بتاؤ یہ حرکت کس کی تھی، ورنہ رات بھر اسی حالت میں کھڑے رہو گے۔" اُن کے حکم پر عادی سیدھا ہوا اور بڑی شان سے ایک طویل انگڑائی لی۔ نانا نے اُسے گھورا مگر وہ سکون سے بولا۔

"یہ ساری میری غلطی ہے نانا جان، ان بے چاروں کی کوئی غلطی نہیں۔" عادی قربانی کا بکرا بنتے ہوئے بولا اور اس تشبیہ پر مجھے ہنسی آرہی ہے۔ تین بے چاری شکلیں اُٹھ کر سیدھی ہوگئیں۔

"تو تم اپنا اقبال جرم قبول کررہے ہو؟"

"اقبال کا نہیں..... میں اپنا جرم قبول کررہا ہوں..... اور نانا جان یہ چغلی اقبال نے لگائی آپ کو؟ کس اقبال کی بات کررہے ہیں؟" عادی نے دانت پیس لیے میں جانتا تھا اُس کے کتنے اقبال نامی لوگ کے مخالف ہیں۔

"جس اقبال کے تم ابھی فرزند بن رہے تھے..... شاید اُس اقبال کی۔" میں نے بھی ٹکڑا لگایا۔ لیکن ہم سب کی خاصیت تھی کوئی کسی پر سزا نہیں ڈال سکتا تھا..... عادی کے بعد میں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔

"ان سب سے اصرار میں نے کیا تھا نانا جان۔"

"میرے تم تو آج سامان باندھ لو اپنا۔" امی جان بہت کچھ کہہ کر گویا ہوئیں تو دی نے گھبرا کر اپنا منہ کھولا۔ "یہ جھوٹ بول رہے ہیں نانا جان..... ان کے شوق کو ہوا دینے والا میں تھا۔"

"کہو اس بند کرو تم سب اپنی اور مجھے سیدھی طرح بتاؤ ورنہ کسی کی خیر نہیں۔" نانا جان ایک دم زور سے دھاڑے تو ماؤں کے کلیجے بھی منہ کو آگئے۔ اسی وقت شیرو میدان میں اُتر آیا۔

"جی یہ ہے نانا جان کہ وہاں کھیتے کا بندوبست میں نے کیا اور پیسے بھی میرے پاس ہی تھے..... آپ نے جتنا مارنا ہے مجھے مار لیں۔" میری دیکھا دیکھی سب ہی انہیں نانا جان کہتے تھے۔ شیرو کی بات پر انہوں نے اپنی چھڑی کا تھم اس کی گردن میں ڈال کر اپنے قریب کیا تو کلثوم اور رضیہ مزید چپ نہ بیٹھ سکیں۔

"اسے کچھ نہ کہیں نانا جان، ہم بھی برابر کی شریک ہیں۔"

"کیا تم لوگ بھی میلہ گھومنے آئیں.....؟" ان کی ماؤں کی منہ کھل گئے تو وہ سٹپٹائیں۔

"ارے نہیں..... پیسے ہم نے ہی چرا کر دیے تھے، ان لوگوں کا بہت دل تھا۔"

"لو بھئی، یہاں تو آوا کا آوا ہی....." نانا جان خود چکرا کر بیٹھ گئے۔

یہ ہماری زندگی کا یادگار میلہ رہا۔ اس ساری کارروائی کے بعد ہر ایک کی ماں کا جذباتی پن بہت لطف دینے والا تھا۔ معافی وعہد و پیماں کے بعد حساب کلیئر ہوا تھا اور ایسی ہی رہیں ہم سب کی شرارتیں..... کبھی نہ ختم ہونے والی اور مار کھانے کے بعد بھی مضبوط تر.....!!

عادی اور کلثوم دو بہن بھائی تھے۔ دو شیرو اور رضیہ۔ میں اکلوتا تھا اور دی کی چار بہنیں۔ ان چار گھروں میں، میں نے جتنا اخلاص اور محبت دیکھی تھی، وہ ہم چاروں کی ہم آہنگی میں اہمیت رکھتی تھی۔

شیرو یتیم اس لیے نہیں تھا کہ ایک بیچاری ماں کے ساتھ وہ ہم سب کا چہیتا دوست تھا..... اور جس کے ساتھ اتنی محبتیں ہوں اسے یتیم نہیں کہلانا چاہیے۔ زندگی اسی طرح ہم سب کی اُنگلی بہت نرمی

سے تھامے ہوئی تھی۔ امی جان اور ابو کو بہت اُمیدیں تھیں مجھ سے..... اور میں پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ امی جان اکثر روک ٹوک کرتی تھیں۔

''تم کہاں جارہے ہو بیگ لے کر؟''

''میں شیرو کے گھر..... سب مل کر پڑھیں گے ناں تو اچھی تیاری ہوگی۔''

''اچھا وہ تمہاری بڑی مدد کریں گے..... تم وہاں خود کو برباد کرلو گے۔ تمہیں پتا ہے نا تمہارا ٹارگٹ کیا ہے۔''

''امی جان آپ مجھے اجازت دیں..... میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

میری سنجیدگی اور پھر نتائج دیکھ کر وہ پھر کبھی نہیں بولیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ یوں میرا ذہن مرکوز ہونے کے بجائے مزید بٹ جاتا ہے۔

گاؤں کا مڈل تک اسکول سرکاری تھا..... ایک استاد کو دوائی کھانے کی بہت عادت تھی اور وہ ہمیشہ کلاس کے دوران ہمیں گولیاں لینے بھیجتا تھا۔ ایک دن مجھے شرارت سوجھی اور اُس میں میں نے باقی سب کو بھی شامل کرلیا۔ سڑک تک حکیم کے پاس جانا بھی تو عذاب لگتا تھا..... لہٰذا نظر بچا کر چاک مٹھی بھر چھپا لیتے اور اُستاد کے کہنے پر اسکول کے عقب میں بیٹھ کر عادی میں اور شیرو اُس چاک کو گولی کے سائز کا کاٹ کاٹ کے پرچی میں سلیقے سے رکھتے اور استاد کی خدمت میں حاضر کرتے۔ بعد میں اُن پیسوں سے ٹافیوں کی عیاشی کرتے تھے۔ استاد صاحب حیران ہوتے۔

سر درد کی گولیاں..... سفید۔ فلو، بخار، چکر کی گولیاں..... سفید۔'' اور تو اور پیچش کی گولیاں بھی سفید..... اور بغیر کسی نام ونشان والی۔ اُستاد صاحب کو بھی شک پڑ گیا۔ ہمارے جانے کے بعد پیچھے پیچھے چل پڑے، اور ایک دن رنگے ہاتھوں یہ جعلی ادویات کمپنی برآمد کر بیٹھے۔ سزا دی گئی..... گھر بلاوا بھیجا گیا۔ واپسی پر جس نے سنا ہنس ہنس کے برا حال تھا۔

☆☆☆

وقت نے دھیرے دھیرے ہم کو بڑا کردیا اور یک جاں چار قالب۔

میٹرک کے ایگزام کے بعد ہم سب فارغ تھے اور اس مقام پر آکر ایک نیا موڑ آگیا۔ بہتی شادیاں بہت کم عمری میں کردینے کی روایت تھی عادی اپنی ماموں زاد سے منسوب تھا اور وہ اب عاد کی شادی کی بات کانوں میں ڈالنے لگے تھے عادی کا اپنا ارادہ فی الحال نہیں بھی تھا تو بھی چچی کو پر کچھ اعتراض نہیں لگ رہا تھا۔

''کون سا آج کررہے ہیں، ایک دو سال رکھ جاتے ہیں..... لڑکیوں کو زیادہ دیر بٹھائے رکھنے رواج نہیں ہے بچے..... اور کرنی تو ہے، اللہ مالک ہے۔'' گاؤں میں اکثر لوگوں کی سوچ ایسی ہی سیدھی اور رشک آمیز تھی۔ شاید ماحول کا اثر ہوتا ہے کہ بالغ کچھ فکریں ہونے کے باوجود بھی نظر نہیں آتیں۔ تنہا سن کر چیخ پڑا۔

''آپ عادی کو ہم سب سے الگ کرنا چاہتے ہیں، ہم یہ شادی کرنے نہیں دیں گے۔''

چچی اور امی جان کتنی دیر ہنستی رہیں۔

''جھلا ہے کاکا..... نالڑکی بیاہ کر ادھر آئی۔ یا عادی کو بیاہ دوں گی کہ الگ ہو جاؤ گے، ہیں؟''

''جو بھی ہے، اس طرح بلا جھجک پھر کہاں یہاں آسکیں گے۔'' میں اُداسی سے بیٹھ گیا۔ بوجھل ہونے لگا تھا۔ اتنے سالوں کی محبت اچانک کوئی اور حق جتانے والا آجائے تو ایک کہاں برداشت ہوتا ہے۔

''ماں صدقے میرا بچہ..... کلثوم کے ہوتے لوگوں کا اپنا گھر ہے تو تب بھی کوئی فرق نہیں گا۔ بھائیوں میں بھلا کوئی جھجک۔''

''چھوڑو اماں..... ڈرامے باز ہے، آپ شادی کی تیاری کرو..... میرا بدلہ بھابھی لے گی اب سے۔'' کلثوم نے منہ چڑا کر کہا تو وہ کھل کر ہنسنے لگیں۔

''اسی چڑیل کی کردو چچی۔'' میں جل کر ہوتا اُٹھ آیا۔ راستے میں عادی مل گیا تو وہ بھی ہنسنے لگا۔

"مجنوں کیوں بن رہے ہو..... صرف بات ہی چلی ہے۔" اُس نے بھٹے کے دو ٹکڑے کیے اور آدھا میری طرف بڑھا دیا تھا۔ میں نے بھٹے پر دانت گاڑھے۔

"ابھی ضرورت بھی کیا ہے..... ایف اے کرو، میں نے بھی تو ڈاکٹر بننا ہے نا۔"

"ہاں بھائی! تمہاری تو لمبی چھٹی..... خیر سیریس مت لو، ابھی ایسا کچھ نہیں ہے۔" ہم دونوں ساتھ چلتے بستی سے باہر آئے۔ میدان میں کرکٹ کھیلی جا رہی تھا۔

"تمہیں کس نے پوچھنا ہے..... چچی نہیں سننے دیکھنے لگے، جو بس کو اسٹارٹ کرتا پرابلم کا پتا لگانے کی کوشش کر رہا تھا..... اسٹوڈنٹس سے بھری تین بسیں اُن سے کافی آگے نکل چکی تھی۔ شیر دل نے سر کھڑکی سے نکال کر تازہ ہوا میں لمبی سانس کھینچی۔ بس ایک کشادہ پُل پر بند ہوئی تھی، اور پُل کی دوسری طرف تنگ سی کچی پگڈنڈی پر بستی کے کچے پکے گھر بنے ہوئے تھے..... شیر دل کو مزید افسردگی نے گھیر لیا۔ اُس کے معصوم دل کو منوں وزن نے بوجھل کر رکھا تھا..... حالانکہ یہاں آتے ہوئے وہ کتنا خوش تھا۔

"شیر دل آر یو اپ سیٹ؟" صفیان نے گیم کھیلتے ٹیب سے نظریں اُٹھا کر بھائی سے دریافت کیا۔ شیر دل جبراً مسکرایا۔

"نہیں یار..... بس مما، پاپا یاد آ رہے ہیں۔"

"تم اب بڑے ہو جاؤ شیر دل....." صفیان ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر معصوم سا ہنسا۔ شیر دل نے ہنسنے میں اس کا ساتھ دیا۔

"نیچے چلو صوفی، بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

"پہلے بتاتے یار....." صفیان ٹیب بند کرتا تابعداری سے اُٹھ گیا۔ بس خراب ہو چکی تھی۔ سر حسین سلیمان نے بچوں کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ کچھ گھنٹے یہیں اسٹے (ٹھہریں) کریں گے جب تک کہ مکینک آ کے مسئلہ دور نہیں کر جاتا.....

بچے اُکتا کے بس سے اُتر گئے۔ پُل کی دوسری طرف پگڈنڈی کے بالکل ساتھ مسجد کے باہر نلکا لگا ہوا تھا..... کچھ لڑکے فریش ہونے نلکے کی اور بڑھنے لگے۔ شیر دل اور صفیان کے قدم گہرے سبز درختوں میں گھری اُس پگڈنڈی کی طرف اُٹھ رہے تھے..... جس کی دھول میں نجانے کتنے قدموں کی داستانیں گرد آلود ہو چکی ہوں گی۔ شیر دل کو وہ بستی اور وہاں کے پہلو میں سکون سے بہتی نہر کے کنارے خودرو گھاس، مہندی کے درختوں کی خوشبو..... اور دراز قامت جوار کے کھیتوں کے آخری سروں پر سورج کی سرخ لو ابھی بھی بہتی نظر آ رہی تھی۔

تمام لڑکے ہڑبڑا کر اُچک اُچک کر ڈرائیور کو

کے کھیتوں کے درمیان سے گزرتی کچی سڑک پر ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ سڑک کے اردگرد سرسبز لہلہاتے کھیت تھے، کپاس کے پودوں پر بڑے بڑے پھول، سڑک

کے گھر بڑے پُراسرار سے لگے، جس کی طرف بڑھتے قدم اس کے دل پر چھایا غبار ہٹانے کے لیے نادانستگی میں آگے آگے متحرک تھے۔

"شیر دل دھیان کرنا، ایسی جگہوں پر کتے بہت ہوتے ہیں۔" صفیان نے اس کا ہاتھ ہلا کر تشویش سے کہا۔ شیر دل نے توجہ اُس کی جانب مبذول کی۔

"سنو..... کون ہو تم لوگ؟" شیر دل کے کچھ کہنے سے قبل ہی دونوں آواز پر چونک کر مڑے۔ اُن کے بالکل قریب شیر دل کے برابر کا لڑکا شلوار قمیص پہنے ہاتھ میں پینسل کی باکٹی پکڑے حیرت انگیز نظروں سے انہیں گھور رہا تھا۔ پینٹ شرٹس میں ملبوس، سلیقگی سے تراشے بالوں میں مٹی سے بچ کر چلتے، صاف ستھرے سے وہ لڑکے کہیں سے بھی گاؤں کے نہیں دکھتے تھے۔

"ہیلو..... تم یہاں کے رہائشی ہو؟" شیر دل نے دوستانہ انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔ جسے نووارد نے ہلکا سے چھو کر چھوڑ دیا۔

"ہاں..... کیا تم لوگ کسی سے ملنے آئے ہوئے ہو؟"

"نہیں ہم لوگوں کی کوچ خراب ہوگئی ہے..... وہ وہاں۔" صفیان نے ایڑیاں اُٹھا کر پل کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم دونوں نے سوچا پورا ہونے سے بہتر ہے ہم لوگ یہاں گھوم لیں۔" اس نے مسکرا کر اشتیاق سے کہا تو تفتیش کرتے لڑکے کو بہت اچھا لگا۔ اُس کے لبوں پر پزیرائی آمیز مسکراہٹ کھل گئی۔

"میرا نام عدن ہے..... میرے دوست پیار سے مجھے "عدی" بھی کہتے ہیں۔ تم دونوں کی مرضی جو کہو..... میرے گھر چلو گے؟" وہ جلدی جلدی تعارف کراتا ہوا بولا تو صفیان نے جھٹ رضامندی دے دی۔

"وائے ناٹ..... ہمارے نام صفیان..... شیر دل۔"

کچھ قدموں کا فاصلہ پاٹ کر ان کے قدم لکڑی کے کھلے آبنوسی دروازے پر جا کر رُکے۔ نئے لوگوں سے ملنے کا شوق اُن کو شاندار ساٹور بھلا چکا تھا۔

عدن بلا جھجک اُن دونوں کو لیتا ہوا اندر داخل ہوگیا تو صحن میں اپلے اُٹھاتی عورت اور ناکا چلا کھل و گھاس سے لکڑی کہنیاں دھوتے آدمی کی آنکھیں گول سی ہو کر سکڑ گئیں۔ دونوں اپنا کام چھوڑ کر ناسمجھی کے عالم میں اُن کی طرف آئے۔

"ابا۔ یہ دونوں میرے نئے نئے دوست ہیں..... شہر کے ہیں۔ نہر والی سڑک پر ان کا کوچ خراب ہوگیا ہے، میں انہیں اپنا گھر دکھانے لے آیا۔" عدن نے ساری بات واضح کی تو دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ لب کھولے۔

"السلام علیکم انکل..... ہیلو آنٹی۔" عدیل اور فیروزہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑے..... دونوں کے دل میں بے پناہ پیار اُمڈا تھا۔

"آؤ بچو، یہاں آرام سے بیٹھو....." عدیل نے دونوں کے پیار سے بال سہلاتے ہوئے چارپائیوں کی طرف اشارہ کیا، اور دروازہ بند کرنے چلا گیا۔

عدن اور صفیان بہت خوش نظر آرہے تھے دل شیر دل اور صفیان کے لیے یہ سب کچھ دل موہ لینے والا تھا..... ان لوگوں کی سادہ محبت، اور گاؤں کا خالص سا ماحول.....!!

چارپائی کے کونے پر ایک مریل سی بلی ہ روی سے گزیا کھیل رہی تھی۔ وہ مرجھائی مرجھائی سی بے آب و رنگ لگتی تھی۔ شکل پر زردی کھنڈی تھی آنکھوں میں پیلاہٹ۔ شیر دل اور صفیان اُسے دیکھ رہ گئے۔ جب وہ ٹکر ٹکر دونوں کو دیکھنے لگی۔

"یہ میری چھوٹی بہن ہے سونیا..... اکثر رہتی ہے، اسے دل میں درد پڑتا ہے مگر ابھی کچھ ہے۔" عدن نے مدھم آواز میں اُنہیں بتایا تو دو ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ عدن اپنی بہن سے بہت پیار ہوگا..... سونیا اپنا مشغلہ کر اُن کے ساتھ مل گئی۔

"یہ بہت پیاری ہے..... کیا اس کا علاج ہو رہا؟" صفیان نے ہمدردی سے پوچھا پھر خود کہنے لگا۔

"تم ٹینشن نہ لو عدن..... میرے پاپا بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ میں اُن سے سونیا کے بارے میں ضرور بات کروں گا، وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔" اُس نے تسلی دی تو عدن کے چہرے پر زندگی کی لہر پہلے کے قطروں کی طرح چمک گئی..... وہ ایک دم اُس کے ہاتھ تھام کر بولا۔

"تم واقعی بات کرو گے.....؟"

"ہاں بالکل..... اب تو ہم لوگ دوست ہیں ناں۔" اُس نے یقین دہانی کرائی۔ تو وہ خوشی سے بولا۔

"میں بعد میں بھی تم لوگوں کا انتظار کروں گا۔"

تب ہی فیروزہ اور عدیل اُن کے پاس آ کر بیٹھے۔ فیروزہ کھانے کی ٹرے لائی تھی جو سفید صافی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ دسترخوان بچھانے لگی۔

"ہم کھانا نہیں کھائیں گے آنٹی..... بہت شکریہ، سفر کے دوران بہت کچھ لے چکے ہیں۔" شیر دل نے ہاتھ اُٹھا کر نرمی سے ٹوک دیا تو فیروزہ اصرار نہ کر سکی۔ عدیل نے کھانا شروع کر دیا۔

"ماشاء اللہ بہت پیارے ہو آپ دونوں..... بہت قسمت والے ہیں آپ کے والدین۔ بیٹا! میں آپ لوگوں کے لیے یہاں کی خاص سوغات لائی ہوں۔" بچوں کو ساتھ کھلا دیکھ کر فیروزہ نے بہت محبت سے متوجہ کیا..... صفیان اور عدن کی چہکار سے رونق سی لگ گئی تھی۔ سونیا بھی ہشاش بشاش سی ہو کر ان کی لائف رودینن سن رہی تھی۔

"ضرور آنٹی..... ہم بھی واپسی پر آپ کے لیے اچھا سا گفٹ لائیں گے۔"

"ہاہا واہ بھئی..... اور نوجوان تم نے نام نہیں بتایا اپنا۔" عدیل صفیان کی بات سے محظوظ ہو کر شیر دل سے مخاطب ہوا، جو سر کو نیکسٹ کر رہا تھا۔

"شیر دل....." اُس نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔ فیروزہ کے چہرے پر کوئی تاثر ٹھہرا اور عدیل کا ہاتھ تھم گیا تھا۔

☆☆☆

میرا یقین ہے کہ نئے رشتے، پرانے رشتوں کو مضبوط کرنے میں بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

کلثوم میری محبت نہیں تھی۔ نہ ہی میں نے اُسے کبھی اس حوالے سے دیکھا تھا..... لیکن عادی کی اُس بات نے مجھے خوشی کے گہرے ساگر میں دھکیل دیا تھا۔ یا پھر ہم سارے انسان ہی قسمت کی بساط کے مہرے ہوتے ہیں، جن کے بخت اُٹھا کر تقدیر کھیلتی ہے۔ میں خوش تھا کہ عادی اور میرا دیرینہ رشتہ قائم ہو رہا تھا۔ اس رشتے میں محبت سے بڑھ کر وہ سکون و خوشی تھی جس سے میں مطمئن تھا۔

کالج میں ایڈمیشن سے قبل میں نے امی جان سے بات کی تو ان کے چہرے پر حد درجہ سنجیدگی کی دبیز چادر تن گئی۔

"تم ابھی سے کن معاملوں میں پڑ رہے ہو میرو! تم جانتے ہو ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے ہمارا۔"

"میرا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے امی جان..... میں نے صرف آپ کو آگاہ کیا ہے۔" میرا اور امی کا شروع سے ہی بہت دوستانہ تعلق تھا۔ اسی بنا پر میں اتنی آسانی سے اپنے دل کی بات کر پا رہا تھا۔

"کسی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے کچھ باتوں پر اور دلوں پر اچھا اثر نہیں ڈالتیں۔ سمجھے تم؟ تم اپنے مقصد سے بھٹک نہ جانا۔" اُن کا اشارہ میرے مستقبل کی طرف تھا..... اکلوتی اولاد ہونے کا ایک واحد نقصان یہی ہوتا ہے کہ تمام تر اُمیدیں اُسی سے وابستہ ہوتی ہیں۔

"امی! آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں.....؟" میرے ایک سوال پر خاموشی اُن کے لبوں کا قفل بن گئی۔ وہ واقعی مجھے سمجھتی تھیں، اس لیے میرے کہے بغیر شہر جانے سے قبل منگنی پر راضی ہو گئیں۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب والد صاحب سعودی عرب سے خروج لینے کا فیصلہ کیے، پاکستان میں اپنا بزنس سیٹل کرنے کی تگ و دو میں تھے..... اور ہم لوگ قدوسوچ میں بہت بڑے بڑے ہو گئے تھے۔

وے کیڈا چنگا گھدائی اوئے ہر رنگ دا چولا

دنیا تے کوئے نی، تیرے انگ دا ڈھولا
(تم پہ ہر رنگ کا کپڑا بہت جچتا ہے میرے دوست
اس دنیا میں تیرے مقابل کا کوئی اور نہیں ہے میرے محبوب)

رات چاند کے گرد گھومتی تھی، اور ڈھولکی کی تھاپ پہ بلند ہوتے گانے مجھے شرمیلا مسکرانے پر بار بار مجبور کر رہے تھے..... میں خوش تھا اور میرے دوست مجھ سے بڑھ کر خوش تھے۔ وہ خوشیوں میں اضافے کی ایک اور سہانی رات تھی۔ منگنی ایک چھوٹی سی رسم..... لیکن خوشیوں کے لیے بہانہ ڈھونڈنا سرشار کر دیتا ہے۔ رات گئے خوشیوں کے گیت گائے گئے تب جا کے ہنگامے سرد پڑے۔

اپنی خوشی میں مجھ سے شیرو کی پریشانی جانے کیسے اوجھل رہ گئی تھی۔ کئی دنوں بعد اُسے پہلی بار اُس کے گھر کے ٹیلے پار انگور کی بیلوں کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پیتے دیکھا تو پیروں میں سے گویا زمین کھسک گئی۔ یہ حرکت میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو حلف لے کر کہتا کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا..... اس سے پہلے بھی اُس نے کیا بھی تو نہیں تھا ناں۔

''اچھا تو یہ نوبت آ گئی ہے اب.....'' میری آواز دکھ سے پھٹ گئی تو اُس نے گھبرا کر لمحہ ضائع کیا بنا سگریٹ زمین پر مسل دی۔ میں بہت ناراضی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''میرو یہ بس آج ہی.....'' وہ شرمندگی سے شاید بول ہی نہیں پایا۔ عادی اور وسیم (وسی) کے سامنے وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے لعنت ملامت سن رہا تھا۔

''تمہیں یہ لت کب سے لگی ہے؟'' عادی کے ترش لہجے پہ وہ تڑپ گیا۔

''یوں مت کہو یار..... مجھے تو کش لینے کا بھی ڈھنگ نہیں ہے، قسم کھا رہا ہوں یہ پہلی دفعہ تھا۔''

''آخری دفعہ تو نہیں تھا..... تمہیں یہ نایاب مشورہ ملا کہاں سے؟'' وسی نے طنز کا تیر چھوڑا۔ میں اس سارے میں خاموش تماشائی بنا اُس کے بولنے منتظر تھا.....!

''میری پریشانیوں نے..... دوستوں بچپن لڑکپن انسان سے اس طرح چھوٹ جاتا ہے کہ بہت بھاری ذمہ داریوں کا اور اک ایک دم انسان پر آشکا ہو جاتا ہے۔ پہلے جیسی بے فکری نہیں رہتی..... اگر رہنا بھی چاہے تو لوگ رہنے نہیں دیتے۔''

''کس چیز کی پریشانیاں.....؟'' اُس کا ٹوٹا لہجہ دیکھ کر ہم سارے متحیر رہ گئے۔

''میری ذاتی پریشانیاں..... ابا کے مرنے اماں کی جوانی کو جدوجہد کے اژدھے کھا گئے..... بہن بھائی کو جینے کا ڈھنگ سکھانے کے لیے خود جینے کا ڈھونگ کرتی رہیں۔ ایک بیوہ، پھر لاچار و غریب عورت کے لیے جینا ایک ڈھونگ ہی تو ہوتا ہے۔''

''اب جبکہ بڑھاپے کا دیمک اُن کے وجود اس قدر ڈھیر کر چکا ہے، اُن پر مزید بوجھ بننا میرے لیے توہین آمیز ہے۔ اب اُن کا بوجھ اُٹھانا میرا فرض ہے، اس سے پہلے ہی اگر وہ مجھ سے مایوس ہو کر اللہ کے پاس چلی گئیں تو میں زندگی کس جی سے جیوں گا.....''

میری ایک معصوم بہن ہے..... جس کی جوانی خوشیوں کی حفاظت میرا فرض ہے۔ کیا وہ محض ہماری حیثیت کی بھینٹ چڑھ کر ہمارے جیسے ہی کسی کو شاید میں چلی جائے جہاں خواہشیں، حسرت بن کر رہ جائیں..... کیا میں ایک مرد ہو کر بس تماشا دیکھوں؟

زندگی بہت تلخ ہے یار..... اور لوگ اس میں اپنے اپنے حصے کا زہر ملا نا عین ثواب سمجھ لیتے ہیں اسی تلخی کو سگریٹ کے کڑوے دھوئیں سے کاٹنا چاہا تھا۔''

وہ زخمی لہجے پر چپ کا مقفل چڑھا کر زمین گھورنے لگا تو ہم سب کی آنکھیں دکھ کی شدت بھری ہوئی تھیں اور اذیت ٹپ ٹپ بہنے کو تیار..... مگر اس میں میرے سان و گمان سے پرے تھا کہ ہمارا

اتنا بوجھ دل پر ہونے کے باوجود بھی ہنس لیتا ہے، ہماری خوشی کو دوبالا کر دیتا ہے۔ کلثوم کے بعد سے شاید اُسے رضیہ کا مستقل دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے سوچا یہ ایک فطری عمل ہے..... اسے سننے والا کوئی اور ہوتا تو شاید بہت کچھ ہو کر اُسے حاسد جیسا کچھ لفظ کہہ کر لازوال دوستی پر لفظ کوچ کر دیتا۔ مگر میں واقف تھا کہ یہ وہ چیز تھی جو ہمارے شیرو میں ایک فیصد بھی نہیں تھی۔

"کیا ہوا..... تم سب ہو نا یار، میں سب کچھ کر لوں گا۔" اُس نے آنکھیں نکال کر مسکراہٹ اُچھالی تو بنا ایک لفظ کہے ہم تینوں دیوانہ وار اُس کے گلے لگ گئے۔ اس اتفاق پر وہ بوکھلانے کے جتنے بھی ڈرامے کر لیتا..... ہم سب کے اپنی اپنی جگہ دل بہت بوجھل ہو چکے تھے اور اس سے سب ہی باخبر تھے، پھر بھی مسکراہٹ سے بھرم رکھ رہے تھے۔

"تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو، کسی نے کچھ کہا ہے؟" میری سوئی ایک جگہ اٹک گئی تھی۔ کوئی کسی سے کوئی بات کہیں چھپاتا تھا، اُس نے بھی نہیں چھپائی۔

"اماں جنتے نے اپنے نیم پاگل پوتے کے لیے رضیہ کی بات کی ہے، اس بات پہ کہ وہ دو وقت کی روٹی بہت فراخدلی سے اُسے دیں گے..... ورنہ میں تو شاید....."

میرے اندر ٹیس کی ایک سرکش لہر اُٹھی تھی۔ بغیر کسی کی تمیز و لحاظ رکھے نہ صرف میں نے اُنہیں بے تکان سنائی تھیں، بلکہ لڑ کر بھی آیا تھا۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ کسی اور کی مفلسی کا مذاق اُڑائے.....

میرے لیے یہ زندگی کا پہلا سفاک رخ تھا۔

کتنے دنوں تک نیند آنکھوں سے دور رہی تھی۔ بار بار شیرو کی تکلیف کا سن کے دل میں درد کی لہر اُٹھتی رہی.....

کاش کہ انسان کبھی اتنا مجبور نہ ہوا کرے اور کسی جادو کی چھڑی سے اپنے حالات بدل لے..... مگر اس میں بھی اللہ ہی کی مصلحت ہے اور ایک مرد کی طاقت ہی اس کی جاہ و کی چھڑی ہوتی ہے.....

میٹرک کا رزلٹ حسب توقع نہایت شاندار رہا۔ میرے ہائی پرسنٹیج مارکس کے ساتھ عادی اور وسی نے بھی بہت اچھے نمبروں سے فرسٹ ڈویژن بنالی تھی..... میرا داخلہ شہر کے معروف کالج، ایف۔ ایس۔ سی۔ میڈیکل میں اسکالرشپ پر ہو گیا..... عادی کا شیرو کی طرح ایف۔ اے کا ارادہ تھا..... شیرو اس وقت ایف۔ اے۔ سیکنڈ پارٹ میں تھا۔ میرے لیے یہ بہت مسرت آمیز خبر تھی..... امی جان اور نانا جان بار بار نظر اُتارتے۔ بابا کی بھی دن میں کئی بار کال آتی تھی..... اس سے اگلا مرحلہ اُداس کن تھا۔

شہر شفٹ ہونا، اور پھر میڈیکل کے لیے ہاسٹل..... میرا اول سوچ کر اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا۔ انسان کی یہ بھی ایک خود ساختہ سی پریشانی ہے، بہت سی پریشانیوں میں..... کہ وقت سے پہلے وہ بہت سے مسائل خود پر بری طرح حاوی کر لیتا ہے۔

اس قصے میں شیرو کی پریشانی کا کہیں خاتمہ نہیں ہوا تھا.....

میرا کالج شروع ہوا تو ہر روز ساڑھے سات بجے گاؤں سے روانہ ہونے والی بس سے شہر روانہ ہوتا اور ڈھلی دوپہر کو واپسی ہوتی تھی۔ بابا کے مستقل پاکستان واپس آنے پر شہر میں باقاعدہ شفٹنگ ہونی تھی کہ امی جان تنہا رہنے کی عادی نہیں تھیں۔ اسکول کے دس سال ساتھ رہنے والے دوستوں کو سائنس کے مضامین اور کالج کے فرق نے یکسر الگ کر کے رکھ دیا تھا۔

اتنے وقت میں کلثوم اور میرے بیچ قائم ہوئے رشتے کو لے کر دل نے میٹھے سے جذبات اُبھارنے شروع کر دیے تھے۔ شاید امی جان سچ ہی کہتی تھیں..... لیکن مجھے اپنے جذبات پر بلا کا کنٹرول تھا، کلثوم بھی مجھے دیکھ کر شرما جاتی، کبھی اِدھر اُدھر چھپ جاتی۔ پہلے کی بے تکلفی والی بات بھی نہیں رہی تھی۔

شیرو ایف۔ اے سے فارغ ہوا تو مجھے میرے دل سے پھانس نکالنے کا موقع مل گیا..... کسی خیال

کے تحت میں، نانا جان سے مخاطب ہوا۔

"نانا جان..... آپ کے کتنے سورسز ہیں، آپ شیرو کے لیے کچھ کریں نا پلیز۔"

"کیا مطلب..... میں سمجھا نہیں، میں کیا کروں؟" انہوں نے اُلجھن سے چشمے کے پار سے دیکھا۔

"شیرو کی کہیں جاب لگوا دیں..... وہ اپنے حالات کو لے کر بہت مایوس ہے۔" انہیں شاید شیرو سے زیادہ میں دل گرفتہ لگا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئے۔

میں نے اُن سے بات کی اور اچھا ہی کیا تھا کہ کر لی تھی..... چند ہی ہفتوں بعد ہمارا پہلے والا شیرو ہمارے سامنے تھا۔

"میرو، عادی..... میری جاب لگ گئی ہے۔ تم سب کی دعائیں رنگ لے آئیں..... نانا جان بہت اچھے ہیں، دیکھنا پولیس کی یونیفارم میں شیرو پکا شیر نظر آئے گا۔"

اُس کی خوشی دیدنی تھی۔ اور بہت وقت بعد ہنسی و چیخ و پکار سے گونجتی فضا نے پہلے کا سا خالص پن محسوس کیا تھا..... شیرو نے ایک ایک کو پکڑ کر یہ خبر سنائی تھی اور میں نے عادی کے ساتھ مل کر پوری بستی میں گلاب جامن بانٹے..... وہ خوشی ایسی تھی کہ آنکھیں بھر لائی تھی۔

"میری پیاری اماں اب سے سلائی مشین بند..... اور باقی سارے کام، رضو تم بے فکری سے اب میٹرک کے امتحان دینا..... اپنی پہلی تنخواہ سے اماں کی سونے کی بالیاں لوں گا، پھر گھر کی مرمت..... اور کچھ ہی سالوں میں نیا گھر۔"

"شیخ چلی تنخواہ کا اندازہ رکھ کر ہی نوکری کو انڈوں سے بھرنا۔" رضیہ کے چھیڑنے پر قہقہے مدھم سروں میں بکھر گئے تھے۔

"وہ انڈے جنہیں جمع تم کیا کرو گی....."

زندگی پھر سے پُرسکون کروٹ لیٹ گئی تھی۔ دبے پاؤں کسی طوفان کو بلانے کے لیے.....

☆☆☆

نیلگوں اُجالے گھروں کی اونچی چھ... صفیان او... توڑ رہے تھے اور تاریکی دھواں بن کر... طرف برسائی جانے لگی۔ آسمان کی وسعتوں... چاند ٹھنڈا سا نظر آنے لگا تھا..... لیکن اند... کھوکھلا کھوکھلا سا تھا۔ مرغیاں پنکھ سکیڑ کر... پر رکھتیں، اور ایک ہی جست لگا کر... ہوئے بیری کے درخت پر چڑھنے لگیں... وہی بیلوں کے گلے کی بجتی گھنٹیاں..... سائے پھیلنے کے اثرات یہاں الگ طرح... نظر آتے تھے۔

عدن اور سونیا گھوم پھر کر انہیں اپنی... قیمتی ہر چیز دکھا رہے تھے۔

"یہاں رات سے پہلے کا وقت کتنا... صورت ہے، ہمارے گھر تو مصنوعی روشنیوں... بھی نہیں چلتا کہ قضا مغرب کا وقت کس قدر... ہے۔" شیر دل نے مسحور ہوتے ہوئے دونوں بھائیوں سے کہا۔ وہ عدن کے طوطے کا پاس... تھے۔

"ہاں یہاں چاندنی راتوں کا بھی اپنا... الگ حسن ہوتا ہے۔" عدن نے اس سے پہلے... کبھی محسوس کیا تھا کہ نہیں..... مگر اس سے وہ... سے بول رہا تھا۔

"تم لوگ کبھی ہمارے گھر آؤ گے..... ڈھیر ساری چیزیں دکھاؤں گا تمہیں..... تو خالی سڑکیں ہی اتنی شفاف ہیں کہ زرد پتے... وہاں گندگی پھیلاتے نہیں دیکھتے۔" صفیان کا... ایک انداز تھا..... شیر دل زیر لب مسکرایا۔

"اب کبھی آنا ہوا تو ابا سے ضرور کہوں گا... لیکن وہ زیادہ تر شہر سونیا کو لے کر جاتے ہیں۔" سونیا کہہ کر چپ سا ہو گیا۔ بہن کی بیماری کا خیال پھر... یاد آ گیا تھا۔

صحن کے ایک کونے کچی جگہ پر بکر... منمنا رہی تھیں۔ کبھی بھینسیں ڈکارنے لگتیں...

صفیان اور شیر دل کی یہ زور آزمائی پر عدیل اور فیروزہ نے انہیں گلے کا دودھ بھی دوبھر کر دکھایا تھا۔

"واؤ آئی..... ہو آر آ ویری پاور فل اینڈ شیر لیڈی....." صفیان اور شیر دل باوجود کوشش کے اب ایک دھار دودھ بھی نہ نکال پائے تو صفیان نے فیروزہ کی رفتار دیکھ کر باقاعدہ تالی بجاتے ہوئے تبصرہ جاری کیا۔

"تمہیں شیرنی کہہ رہا ہے....." دونوں میاں، بیوی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ شاید عرصے بعد انہیں یہ فکری میسر آئی تھی۔ انہیں اپنی ہنسی بہت بھلی لگی..... اور ان کے بچوں کو بھی۔

"بہت پیارے بچے ہیں عدیل، مانو کسی اپنے کے ہوں..... جب سے آئے ہیں ایک پل اجنبیت کا احساس نہیں جاگا۔" فیروزہ بچوں کو کمرے میں ٹھنڈا دیکھتے ہوئے عدیل سے کہنے لگی۔ وہ روح افزا گھول کر ٹھنڈا دودھ بنا رہی تھی..... عدیل اطمینان سے بیٹھا تھا۔

"ماشاء اللہ..... اتنا پیار مت لگاؤ، ابھی بچے چلے جائیں گے، پھر دل برا کرو گی..... اللہ والدین کی راحت بنائے۔" عدیل کے اندر کا شفیق باپ جاگ گیا تھا۔ اس کی نظروں کا ارتکاز بھی وہیں جا کر ٹھہر گیا۔

"عدی تم بھی ہمارے ساتھ فورٹ منرو..... سر سے میں بات کر لوں گا، واپسی تو ہونی بھی ہے نا؟" شیر دل اس کا دل بہلانے کی غرض سے چہک کر بولا..... جیسے اس کے دماغ نے اس کو بھی ابھی کمال کا آئیڈیا دیا ہو۔ عدن کا دل بھی مچل گیا تھا.....!

"ہاں..... لیکن نہیں شیر ہے، تم لوگ ہو آؤ، سونیا اکیلی ہو جاتی ہے۔" عدن نے فوراً جذبات پر بند باندھتے ہوئے محبت سے سونیا کو دیکھا۔ "تم لوگ پھر کبھی، ابا نے میرے لیے کوہاٹ سے منگوایا تھا..... وہ کوئی چیز سامنے کر کے دکھانے لگا اور شیر دل قائل ہو گیا کہ وہ بہت سمجھ دار بچہ تھا۔

"شیر دل چلیں کیا..... ہم مس نہ ہو جائیں؟" صفیان نے سونیا کو کھلونا واپس کر کے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔ سونیا بولتی بہت کم تھی، اور صرف مسکراتی تھی۔

"تم لوگ اب بور ہو رہے ہو....." عدن نے پھیکا سا مسکرا کر کہا۔ واپسی کا سوچ کے وہ تین ایک ساتھ ایک ہی احساس سے گزرے تھے۔ واپسی..... جو ہمیشہ اداسی کی سوغات دیتی ہے۔

"ارے نہیں..... ابھی تھوڑا وقت ہے صفیان۔" شیر دل نے رسان سے کہا اور جونہی نظر گھمائی۔ وہ ٹھٹک سا گیا تھا۔

"عدی یہ دیوار پر کس کی تصویریں ہیں....." وہ شوق سے آگے ہوا۔ اس کمرے کی پچھلی دیوار پر کیل ٹھوک کر بلیک اینڈ وائٹ تصویر پرانے سے شیشے کے چھوٹے سے فریم میں گرد آلود ہو رہی تھی..... شیر دل کو دور سے لگا شاید عدن کے دوست ہیں۔

"یہ میرے چاچو ہیں....." عدن ٹیبل پر چڑھا اور تصویر اتار کر اپنی قمیص سے جھاڑتا ہوا نیچے آ گیا۔ تصویر کچھ پھٹی ہوئی تھی۔

"یہ والے میرے ابا، اور دائیں بائیں دونوں چاچو..... ابا کی یہ فوٹو دیکھ کر ہم اکثر ہنستے ہیں۔" وہ کہہ کر پھر ہنس پڑا۔ صفیان نے چونک کر تصویر تھمائی اور بہت غور سے دیکھا۔

"تمہارے چاچو..... ارے یہ میرے ماموں ہیں..... شیر دل دیکھو، یہ شیرو ماموں....." اچانک وفور جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، جبکہ شیر دل پہلے ہی پہچان چکا تھا۔

"تمہارے ماموں..... لیکن یہ تو ابا کے بھائی ہیں۔" عدن نے بے حد اُلجھن سے اُن دونوں کی تکا تھا۔ شیر دل کسی شاک کی کیفیت میں تھا۔

"ایم شیور یہ شیرو ماموں ہیں..... مما کے پاس اُن کی سیم ایسی ہی پکچر ہے اور....."

"نکلو تم دونوں میرے گھر سے....." کسی دھاڑ سے مشابہ عدیل کی آواز تھی۔ چاروں کا دل حلق میں

آ گیا..... فریم چھوٹ کر ان کے قدموں میں گر گیا تھا۔

"ابا کیا ہوا....." مار بے دہشت کے عدن ہکلا گیا۔ سونیا چیخ مار کر رونے لگی تھی مگر وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔ چہرہ و آنکھیں لہو ٹپکا رہی تھیں..... لال مرچوں سی رنگت۔

"تم لوگوں کے باپ کا کیا نام ہے؟" غیض و غضب سے اُس کی آواز کانپ رہی تھی..... صفیان ڈر کر شیر دل سے چپک گیا تھا۔ لیکن صرف اسی کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری تھا۔

"کک..... کیوں؟"

"میں نے پوچھا....."

"ڈاکٹر شاہ میر..... عطا....." شیر دل نے روکنا چاہا..... مگر صفیان کے تین لفظوں کے ساتھ ہی عدیل آندھی طوفان کی طرح دونوں کو گھسیٹنے لگا..... عدن کی چیخ نکل گئی۔

"ابا کیا کر رہے ہیں..... اماں، اماں....." وہ پاگلوں کی طرح چلاتا باپ کے پیچھے بھاگا جو صحن عبور کر رہا تھا..... بچوں نے اپنے باپ کو پہلے کبھی اتنا سنگدل نہیں دیکھا تھا۔

"نکل جاؤ میرے گھر سے اور دوبارہ کبھی قدم بھی رکھا تو ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا..... کیا سمجھ رکھا ہے کہ عدیل بہت بے وقوف ہے تم لوگ آسانی سے اُلو بنا لو گے تم لوگوں کی بدفطرتی سے اچھی طرح واقف ہوں میں..... دفع ہو جاؤ میرے گاؤں سے۔"

دونوں کے بازوؤں پر آہنی گرفت رکھے وہ قدم وزبان برابر چلا رہا تھا۔ صفیان کی آنکھیں اُبل پڑیں..... فیروزہ بھاگتی بھاگتی ہانپ گئی تھی۔

"کیا کر رہے ہو عدیل چھوڑو اُن کو..... بچے ڈر جائیں گے۔"

شیرنی اپنا سارا زور آزما کر بھی نہ عدیل کے قدم روک سکی نہ اُن کے بازو چھوٹے..... عدن کے آنسو جل تھل بہنا شروع ہو گئے تھے۔ سونیا تو کہیں پیچھے ہی گر گئی تھی۔

"جا کے کہہ دینا اپنے باپ سے تم لوگوں کے ذریعے یہ گھٹیا حرکتیں کرنا بند کر دے..... نہ تو اُس معافی مل سکتی ہے نہ یہاں کوئی جگہ ہے۔"

"عدیل خدا کے لیے چھوڑو، وہ اس رو کے عادی نہیں ہیں..... بچے برا اثر لیں گے کسی کا خیال کرو۔" وہ چلا کر بولی اور عدیل نے دونوں دہلیز کے باہر پٹخا۔ بری طرح سے ہانپتا ہوا وہ کو اُڑا رہا تھا..... اُنگلی اُٹھائی، خون رنگ آنکھیں اُن جمائیں۔

"کوشش کرنا دوبارہ ایسے ردعمل کی ضرورت پڑے..... میرے بچوں سے دور رہنا۔" فیروزہ سہمے ہوئے بچوں کی طرف جانا چاہتی تھی مگر عدیل بازو سے پکڑے واپس پلٹ گئی..... صفیان روتا شیر دل سے لپٹ گیا تھا..... پھر آنکھیں صاف کر کے منہ بسور کر بولا۔

"ہاؤ روڈ شیری..... کتنے بیسٹ (وحشی) ہیں یہ۔"

"چپ، ایسا نہیں کہتے....." اس کے ہونٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے شیر دل کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر عارض بھگو گئے۔ عدن گیلی آنکھوں سے کی طرف پُر اُمید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، جیسے ہو نہ مانگ پا رہا ہو، اور اُن سے نظر انداز کر دینے توقع رکھتا ہو۔

"عدن یہاں آؤ....." شیر دل نے بہت سے پکارا۔ تو اُس کی شکل مزید رونے والی ہو گئی۔

"پرسوں شام ہم واپس آئیں گے..... ہمارا انتظار کرنا....." شاہ میر کا بیٹا بہت ڈھیٹ دوٹوک تھا.....

☆☆☆

"شیرو کو کسی نے گولی مار دی ہے۔" بستی کسی بچے نے دروازے کے پاس چلا کر کہا تھا۔ پیپل کے ملائم پتوں میں سوئے جگنو ایک ایک کر زمین پر گرنے لگے تھے۔ وہ ایک خون آشام

تھی، جس پر قیامت نے سر پٹخا تھا۔ ہم سب شیرو کے گھر پر موجود تھے..... اگلا دن اُس کی ڈیوٹی کا پہلا دن ہوتا اور اُس شام شیرو نے تمام دوستوں کو اس علاقے کی خاص ڈش "صبت" کی دعوت دی تھی۔ اُس شام اُس نے سب کی فرمائش پر یونیفارم بھی زیب تن کیا تھا..... اُونچا لمبا قد، چوڑی چھاتی اور سرخی بدن کا مالک..... گورا چٹا سا شیرو یونیفارم میں اس قدر ہینڈسم لگ رہا تھا کہ نظر نہ ٹکتی تھی۔ اور شاید کسی کی نظر نے اُس کی زندگی کا دیا بجھا دیا تھا.....

"شیرو..... میرا لال....." اُس کی ماں کی دل خراش چیخ فضا میں بلند ہوئی اور ہم سب سرپٹ بھاگے تھے۔ آنکھوں کے آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا..... اور دماغ کو کچھ سوجھتا نہیں تھا۔ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ ہم روڈ پر پہنچے جہاں سے وہ کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں لینے گیا تھا، لوگوں کا ایک ہجوم جما تھا.....!

"تم لوگ میرے ہاتھ کا ذائقہ چکھ لو، بیویوں کے آنے پر یاد کرو گے پھر....."

"بیویاں پھوہڑ بھی ہوئیں تو کچھ فرق نہیں پڑے گا..... ہمارا معدہ تمہارے بدذائقہ کھانوں کا عادی جیل جو چکا ہوگا۔"

میں نے اندھیرا چھائی آنکھوں کے ساتھ اونچے لمبے نوجوان کو آنکھیں موندے بے یار و مددگار پڑے دیکھا جس کے لبوں سے مسکراہٹ جدائیں ہوئی تھی..... اُس کے سینے پر اتنا بڑا سوراخ تھا کہ مجھے لمحے کے ہزارویں حصے میں کسی نے بلندی سے اٹھا کر پوری قوت سے اُس کے قریب دے مارا تھا۔

"شیر دل....." حلق پر زور دے کر میں حلیمہ بہنا سے ایسے چیخا تھا کہ تمام مین سہم کر میری طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔ خون کی گاڑھی سی لکیر میرے ہونٹوں کی دیواروں سے باہر آئی تھی۔ اپنے ایک عزیز کو اس حال میں دیکھنا موت ہوتی ہے..... بھدا سیاہ موت..... اُس کے اردگرد خون کا تالاب اُبلا ہوا تھا اور ہم تین بدنصیب ترین انسان اُس خون میں نہا رہے تھے..... آسمان ٹوٹا نہ زمین..... ہوا تو صرف یہ کہ ایک زندگی کی حرارت سے بھرپور روشن ستارہ ڈوب کر تاریک ہوگیا تھا۔

"اس کی موت ہوگئی ہے....." ریسکیو کا وہ بندہ وقت کا ظالم ترین انسان تھا جس نے اتنی بڑی بات کہہ دی اور زبان بھی نہ لڑکھڑائی تھی۔ میں نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا اور یوں دیکھا گویا وہ کسی اجنبی زبان میں کچھ بولا ہو..... پھر میں نے عادی کو اسے گردن سے جکڑتے دیکھا۔

"شیرو..... شش..... شیر دل"۔ میں نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھا اور پاگل انسان کی طرح سرگوشی کی۔ اُس کا چہرہ ابھی بھی گرم تھا..... جیسے سانسوں کی حرارت دوڑ رہی ہو، میرا دل چاہا وہ گولی شیرو کے دل سے نکل کر اُس بندے کو لگ جائے جس کی بے رحمی قابل سزا تھی.....

"شیرو آنکھیں کھولو..... تم خودغرض نہیں ہو سکتے، تم بے وفا نہیں ہو سکتے..... اُٹھو میں تمہیں حکم دے رہا ہوں اچھا..... ابھی کے ابھی آنکھیں کھولو ورنہ....." میں نے گڑگڑاتے ہوئے اُسے دھمکی دی.....

ایک بار پہلے بھی تو شرارت کی تھی ناں۔ تب جب وہ سو گیا تھا..... اور جاگ نہیں رہا تھا۔ میں نے دوسرخ مرچیں لی تھیں اور دونوں کا سرا کاٹ کے اُس کے نتھنوں میں گھسا دیں..... دو منٹ سے پہلے نہ صرف وہ جاگ گیا تھا بلکہ پورا دن چھینکتا بھی رہا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر نظریں گھمائیں، کچھ بھی تو پاس نہیں تھا..... نہ مرچیں، نہ زندگی، نہ شیرو.....

"کوئی ڈاکو تھے، موٹر سائیکل چھین رہے تھے..... اس بندے سے گولی چوک کر سیدھا پیچھے آتے شیر دل کو جا لگی۔" لوگ افسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے کو آگاہ کر رہے تھے۔

کسی نے کہا۔ "یہ پولیس کی یونیفارم میں تھا، چور ڈر گئے اور ناحق گولی کا شکار ہوگیا۔"

وسیم ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھے ایک ہاتھ شیرو کے چہرے پر..... زاروقطار رو رہا تھا۔
میں گرتے پڑتے پھر سے اُس آدمی کے پاس گیا۔

"پلیز ایک بار پھر چیک کریں..... اور دھیان سے کریں۔ اُس کے اندر ہمارے لیے زندگی کی تھوڑی سی رمق تو بچی ہی ہوگی..... خدا کے لیے ہم سب کی زندگی کو بچالیں۔" وہ ترحم بھری نظروں سے میرا دل رکھنے کے لیے دوبارہ چیک کرنے لگا مگر لمحہ تو بس آخری ہو چکا تھا..... وہ ہم سے دور جا چکا تھا۔ اتنا دور کہ ہماری جسموں سے نکلتی جان بھی اُسے واپس نہیں لاسکتی تھی۔

موت ایک اٹل حقیقت..... موت ایک ایسی آفت جو مرنے والے کے عزیزوں کی روحیں اپنے ساتھ ہی گروی لے جاتی ہے۔

اُس رات میں نے زندگی کا سفاک ترین روپ دیکھا تھا۔ وہ چار دوست جو مل کر زمین پر چلتے تھے تو جھرمٹ سا بنتا تھا..... شیرو کی چارپائی کو کندھا دے کر لانے والے تین لوگوں کے بیچ چارپائی کا وہ چوتھا بازو یتیم ہو کر جھول رہا تھا..... زندگی آنسو بن گئی اور سانسیں بوجھ..... سقراط کے کہتے ہیں، وہ ہمیں جیتے جی لگ گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے..... میرے بھائی کو، میں تم لوگوں کو معاف نہیں کروں گی..... میرا بھائی مجھے زندہ سلامت چاہیے۔ ہم کس کے لیے جئیں گے، میرا بھائی مٹی کھا جانے لائق نہیں ہے..... یا اللہ!"

رضیہ جنونی ہو رہی تھی اور میرا سینہ دکھ سے پھٹ رہا ہے۔ عادی اور وسیم کس حال میں تھے مجھے تو سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ نظر نہیں آرہے تھے۔

اُس رات تین دوست گہری نیند سوئے دوست کے آرام کا احترام کیے بغیر اس کے اوپر جھکے اس شدت سے روئے تھے کہ آنکھوں کا پانی پیندے سے بھی نچڑ گیا تھا۔

بستی کا ہر ایک باسی اشک بار تھا..... اور گاؤں کی فضا سوگوار۔ لفظ خوشی کو غم کے نوحے کھا گئے۔

جسم کا ایک حصہ مٹی میں اُترا تو ہنسی ہمیشہ کے لیے دکھ کی کوکھ میں جا سوئی۔

صبر اپنی جگہ ہوتا ہے..... پھر بھی نارمل ہونا کٹھن ہو جاتا ہے۔ انتہائی دشوار۔

☆☆☆

درختوں کے جھرمٹ میں خزاں کی سی ویرانی ڈیرے ڈال کے رکھتی تھی..... نہ کوئی پرندہ چہچہاتا نہ کوئل کوکتی۔ موسمی پرندے تو نجانے اس دیس سے ہجرت کیوں کر گئے تھے، آوارہ کوے یہاں بسنا کے بھی آتے پھر گھڑی دو گھڑی سانس لے کر اُڑان بھر لیتے..... ایک بار پھر خاموشی کا سماں۔

شاہ میر کے گھر کی شاندار عمارت اس قدر شفاف تھی کہ کرسٹل کے باکس میں بند ہوئی لگتی تھی۔

رضیہ بیٹوں سے بات کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تو شاہ میر آرام کرسی پر بیٹھا اسکائپ آن کر رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر مہربان سی مسکراہٹ لبوں پر چمکی۔ آنکھوں پر لگے گلاسز اُس کے وقار میں اضافے کا سبب بنتے نظر آتے تھے۔ رضیہ کسی بات پر کہہ رہی تھی۔

"میرا بیٹا بہت حساس ہے مانی، اسے چھیڑنے کی کوشش مت کرو میں تمہارے کان کھینچوں گی۔" صفیان ماں کے سامنے شیر دل کا یقیناً مذاق اُڑاتا ہوگا۔ شاہ میر کو دلچسپی ہوئی۔

"مما! صفیان گرلز کو چھیڑ سکتا ہے مگر آپ کے معصوم سے بیٹے کو نہیں..... وہ الگ بات ہے کہ پکار بھی لے تو لگتا ہے اسے چھیڑ رہا ہے۔"

"ہاہاہا..... بہت شریر ہو..... بیٹا دھیان رکھنا علاقے بہت خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ شیر دل رہے ہو بھائی کا خیال رکھنا، آج کا دن گزار خیر سے واپس آؤ۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا سے ہی ان پر دعائیں پھونک ڈالے۔ شیر دل صفیان کے کان کے پاس ہی تھا جب ہی بولی۔

"او کے مما! شیر دل کی" اپنے میرو" سے بات کروادیں، وہ رو نہیں پا رہا۔" صفیان کی بات سن کر رضیہ بے ساختہ کھلکھلاتی چلی گئی۔ وہ شرارت سے بالکل رضیہ کی ٹون میں بولا تھا..... جو شاہ میر کو بہت کم اصلی نام سے پکارتی تھی۔

"تم ذرا واپس آجاؤ..... لو میرو! شیر دل بات کرنا چاہ رہا ہے۔" دونوں کی محبت پہ مسکراتا وہ گہری سانس لیتا ہوا بیٹھک سے سیدھا ہوا۔

"ہیلو میرے شہزادے..... اتنے کیوں اُداس ہو رہے ہو یار، چلے گئے ہو تو چل کرو۔"

"آئی لو یو پاپا..... میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں ہمیشہ۔" شیر دل کی آواز سن کر ایک پل کو شاہ میر کچھ بول نہیں سکا۔

"یس مائی سن..... پاپا آل سو ود یو آل ویز میری جان..... تم ٹھیک تو ہو نا شیرو؟" اسے نجانے کیوں دور بیٹھے بچوں سے بات کرتے ہوئے پہلی دفعہ گھبراہٹ ہوئی۔

"میری فکر مت کریں پاپا..... مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں پاپا۔"

"یہ تو اکثر آپ کی مما بھی کہتی ہیں۔" وہ ذہن میں کچھ سوچتے ہوئے بظاہر ہنسا۔ "میں واقعی اچھا ہوں گا تب ہی اللہ نے بہت پیاری فیملی دی ہے مجھے۔"

"اللہ آپ کو کچھ اور بھی دے گا پاپا..... جو آپ کے دل کی کسک بن گیا ہے۔"

"شیر دل کوئی سیڈ بک تو نہیں پڑھ لی تم نے....." شیر دل نے بہت خاموشی سے رابطہ منقطع کر دیا تو شاہ میر نے استفہامیہ نگاہوں سے رضیہ کو دیکھا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" اس کی باتوں پر غور کرتے شاہ میر کو حقیقتاً پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ رضیہ آہستگی سے اُٹھ کر پیچھے آئی اور دھیرے دھیرے انگلیوں سے اُس کا ماتھا مسلنے لگی۔

"تم پر گیا ہے..... حساس ہے نا ہم سے دوری برداشت نہیں ہو رہی ہوگی۔" وہ سکون سے بولی اور محبت سے اس شخص کو دیکھنے لگی جس سے وہ گزشتہ کئی سالوں سے خاموش محبت کیے چلی جا رہی تھی..... لیکن کبھی اظہار کی ہمت خود میں پاتی تھی نہ بساط.....

"اللہ نے اسے بہت پیارا دل دیا ہے..... وہ دوسروں کا سوچتا ہے، ہمارا شیرو ہے وہ۔" شاہ میر نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا تو اس نے فوراً نظریں پھیر لیں۔ شیرو کے نام کی شاہ میر کے چہرے پر چمکتی مسکراہٹ ہمیشہ اُس کا دل چیر دیتی تھی۔

"ایسے دل دکھ بھی تو بہت اُٹھاتے ہیں..... اپنی خوشی تک کھو دیتے ہیں اور پھر سمجھوتوں کا بوجھ رہ جاتی ہے اُن کی زندگی۔" رضیہ کا لہجہ ان کہی سوچوں کی پھوار میں بھیگ گیا تھا..... شاہ میر ایک دم سیدھا ہوا۔

"کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟" بے یقینی سے اسے تکتے شاہ میر کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑیں..... رضیہ تڑپ کر رہ گئی۔

"کیسی بات کرتے ہو، تمہارا ساتھ میرے مقدر میں تو اللہ نے سنہرے پنوں پر لکھ چھوڑا ہے..... میں تو تمہاری بات کر رہی ہوں کہ....." اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے شاہ میر کے دماغ نے کچھ کلک کیا تھا..... وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا (شیر دل کی وہ اُلجھی سی باتیں) اور شتابی سے اپنے کمرے کی الماری کے پاس گیا۔ چند چیزیں اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد وہ مڑا تو چہرے پر دکھ و صدمے کے شدید آثار تھے..... بوسیدہ سی سیاہ ڈائری اپنی جگہ سے غائب تھی..... اشیر دل کی گتھلو کی ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

☆☆☆

بہت دور، فورٹ منرو کا ٹھنڈا سورج فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر خوب روشن تھا۔

پہاڑوں کے دامن کی جنگلی گھاس پر پڑے شبنمی قطرے اُس کی بے حرارت کرنیں ابھی تک

مٹانے میں ناکام تھے..... بہت سے لڑکے اچھلتے کودتے بادلوں کو چھونے کی کوشش کررہے تھے۔ فورٹ منرو کی سرد فضائیں اور قدرتی حسن اُنہیں شیدائی کررہا تھا۔ صفیان نے کیمرے کی مدد سے شیر دل کے کئی پوز لیے..... وہ بہت بلندی سے گرتے جھرنے کے چھ فاصلے پر ایک تراشے ہوئے پتھر پر بیٹھا تیز تیز قلم گھسیٹ رہا تھا..... جھرنے کا پانی پہاڑی کے قدموں میں گرتا بہت احتجاج کررہا تھا۔

''شیر دل کم آن یار..... کیا تم بور کام لے کر بیٹھے ہو۔'' صفیان کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہوکر چھلک گیا تو وہ بہت عاجز آکر بولا۔ شیر دل نے جھکی گردن اُٹھائی..... گہرا سانس کھینچا، اُس کا دل اب ہر بوجھ سے آزاد تھا۔

''آل رائٹ..... آجاؤ لفٹ چیئر کی سیر لیتے ہیں۔'' دونوں فورٹ منرو کی فضاؤں کو اپنا البیلا پن دکھانے کے واپسی کے سفر میں ایک دوسرا کا بوجھ اُٹھانے سے قاصر ہورہے تھے۔ بہت اُونچائی پر رہنے سے آکسیجن کی کم فراہمی کچھ دیر کے لیے سکت چھین چکی تھی۔ صفیان بس میں سوار ہوتے ہی سوگیا۔ اپنے والدین کے گاؤں سے گزرتے ہوئے، جب سورج کی تھکی ہاری نارنجی کرنیں نہر کے پانی میں آگ لگاتی نظر آرہی تھیں..... پل کے کنارے ایک وجود سر پھوڑے بیٹھا شیر دل کو اس خوبصورت منظر کا حصہ معلوم ہوا تھا۔

''دو منٹ کے لیے رُکیں پلیز..... روکیں نا۔'' ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ مارتا وہ بعجلت باہر کود گیا..... اُس وجود نے سر اُٹھایا تو لگتا تھا جیسے وہ بہت وقت سے وہاں بیٹھا ہے، شاید سارا دن..... شیر دل کو سامنے پاکر عدن کے لبوں پر بکھرتی شکر گزاری سی مسکراہٹ کا کوئی مول نہیں تھا..... جیسے کوئی جی سا اُٹھا ہو۔

☆☆☆

''یار ایسا کون کرتا ہے..... کوئی اتنا بھی گھائل کرتا ہے۔ اگر زندگی کی یہی اوقات ہے، پھر ساتھ رہنے کی قسمیں کیوں کھائی تھیں۔'' شیر دل چالیسوں کے بعد بھی اُس کے گرم لمس میرے ہاتھ سے جدا نہ ہوتے ہیں..... ہم تینوں نیم پاگل ہوچلے تھے۔ شیر دل کی قدم قدم پے یادیں بکھری تھیں کوئی زندگی کا سرا تھامتا بھی تو کیسے..... اکثر سوتے سوتے میری آنکھ کھل جاتی اور میں چیخنے چلانے لگتا..... وقت بہت بدل گیا تھا۔ ہم بدل گئے تھے لیکن تقدیر نے تو ہر چیز ہی تلپٹ کرنے کی قسم اُٹھا رکھی تھی۔

کچھ ماہ بعد بھی سب اُسی ایک ہی نقطے پر جم کے کھڑے ہوئے تھے.....

شیر دل کی ماں انتہائی لاغر ہوگئی تھی۔ عمر بھر کا سرمایہ لٹانے کے بعد وہ زندہ تھی یہ ہی حیرانی کی بات تھی..... اور اُن سے کسی چیز کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ وہ سخت بیمار تھیں، اس پر ایک اور واقعے نے اُن کی مصیبتوں میں ایک اور اضافہ کردیا تھا۔

رات کی تاریکی میں کچھ لوگ اُن کے گھر گھس گئے..... اور رضیہ ساری رات گندم کی بوریوں کے پیچھے منہ چھپائے سسکتی رہی۔ یہ میرے لیے ایک اور اعصاب شکن واقعہ تھا۔ دنیا کے کالے چہروں کے نقاب جو اب تک ہماری معصوم نظروں پر چڑھے تھے، وہ اب کے بہت تکلیف دہ انداز میں اُترنے لگے۔

''اس گھر میں میری عزت کے سوا کچھ نہیں ہے، میری معصوم بچی میری کمزور پناہوں میں کہاں محفوظ رہ سکتی ہے..... یا اللہ اسے بلا لیتا میرا شیر دل زندہ ہوتا۔'' مارے بے بسی کے وہ پھوٹ پھوٹ کے رورہی تھیں..... اور میرے جسم کا ریشہ ریشہ کانپ رہا تھا..... اذیت سی اذیت تھی۔

میرے ذہن پہ بہت برا اثر پڑا تھا۔ کئی دن اضطراب کی کیفیت نے میری صحت متاثر کردی تھی میرے دل میں رہ رہ کے ملال جاگتا کہ شیر دل کیے وعدے، کیا محض وعدے تھے، کہ ہم اُس کی عزت کا خیال بھی نہیں رکھ پارہے تھے۔ عادی

ہاسوں ان دنوں اس کی شادی پر زور دے رہے تھے، اور وہ سخت پریشان تھا۔

شیرو کی ماں پر ایک اور مرتبہ دورہ پڑا تو انہوں نے امی جان کی موجودگی میں، میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

"میری رجو سے نکاح کرلو میرو..... میری موت کو اب راستہ فراہم کردو، جس کے راستے میں بار بار ایک جوان بیٹی آجاتی ہے۔" امی نے بہت عجیب نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو..... میرو کیسے....."

ایک مجبور ماں بہت آس سے میرا ہاتھ تھامے ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں جن میں مجھے شیر دل نظر آیا، اور شیر دل کی بہن..... اس وقت جس حالات سے گزر رہی تھی، میں خود غرضی نہیں دکھا سکتا تھا۔ شیرو کی موت مجھ سے بہت بڑی قربانی مانگنے آ کھڑی ہوئی تھی.....

"میں کیا بکواس سن رہا ہوں میرو..... تم میری بہن سے منسوب ہو۔" عدیل سنگین تاثرات کے ساتھ میرے روبرو تھا..... مجھے پہلی جھلک میں وہ کوئی اور ہی لگا۔

"شیرو کے گھر کو میری ضرورت ہے عادی..... مجھے دوسرا "شیر دل" بننے دو۔ مجھے معاف کردو، تم تو یہ سب سمجھو گے۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ اور وہ مجھے نہیں سمجھا تھا۔

"میرے سامنے ڈھونگ مت کرو..... تمہیں قربان ہونے کا بہت شوق ہے؟ لیکن تمہیں بھولنا نہیں چاہیے کہ تم کسی کو اپنے نام کر چکے ہو۔ اور ہمارے ہاں زبان ہی سب کچھ سمجھی جاتی ہے ایسے معاملوں میں..... تمہیں میری عزت نظر نہیں آرہی؟"

عادی کی باتوں نے مجھے پھوچکا کردیا تھا۔ بے یقینی کی کیفیت نے مجھے گنگ کردیا۔ وہ صرف "میری" یہ آگیا تھا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو عادی.....؟"

"ہاں ہم اس کی شادی کسی سے بھی کر سکتے ہیں..... تم اپنا فیصلہ واپس لے لو۔" وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔

"کس سے.....؟ کیا کوئی اس وقت ان کو سہارا دینے کے لیے آگے آرہا ہے؟" وہ لب بھینچے کھڑا رہا۔

"کیا شیرو کسی سے بھی اس کی شادی کردیتا؟" میں نہیں کرتا نکاح اس سے عادی..... بدلے میں تم کرلو۔" میں نے بہت امید سے کہا تھا مگر وہ بہت بگڑ گیا۔ اس حادثے نے اسے بھی بہت چڑچڑا کردیا تھا۔

"تم پاگل ہوگئے ہو شاہ میر..... میں کیسے کرسکتا ہوں۔ میری اپنی بات بچپن سے ٹھہری ہوئی ہے..... تمہیں جتنا کہا ہے اتنا کرو، رضیہ کا بھی ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔" وہ بہت کھوکھلے لہجے میں کہہ رہا تھا اور بہت غصہ ہو کر..... مجھے اپنی دوستی کا شیرازہ بکھرتا ہوا لگا تھا۔

"تم بہت خود غرض ہو رہے ہو عادی..... میرا فیصلہ اس صورت میں نہیں بدلے گا، اتنی جلدی تمہیں میں شیرو کے حقوق بھولنے نہیں دوں گا۔"

"ایک مرے ہوئے انسان کے حقوق یاد دلا کر..... تم زندہ لوگوں کی حق تلفی کر رہے ہو، شیرو میرا بھی دوست تھا....." اُسے بہت جلدی یاد آگیا۔ میں بہت کرب سے ہنسا تھا۔

"یہی تو فرق ہے عادی وہ تمہارا دوست "تھا"..... میرا تو وہ اب بھی دوست ہے۔ اور حق تلفی؟ مت بھولو کہ کلثوم سے میں نے کوئی نکاح نہیں کیا تھا۔"

میرے یہ الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں جو میں نے دکھ و غصے کی کیفیت میں کہے تھے..... وہ خشمگیں نگاہیں اسے مجھے گھورتا رہا۔

"لیکن یہ تعلق بھی تم نے اپنی مرضی سے جوڑا تھا..... میں دیکھ لوں گا تم یہ کیسے کرتے ہو۔"

"میرے لیے یہ بہت کٹھن ہے عادی..... تم

میرا ساتھ دو، تاکہ مجھے ایسا کرنے میں جذباتی سہارا ملے۔'' میں رو دینے کو ہو گیا۔ اس نے جب میرے ہاتھ جھٹکے..... مجھے لگا میں نے اپنا جان سے پیارا ایک اور دوست بھی آج کھو دیا ہے۔

''میں دیکھ لوں گا.....'' اور وہ دیکھتا رہ گیا..... مجھے مشکل میں سہارا بننا آتا تھا۔

کلثوم نے غیر متوقع طور پر خودکشی کی کوشش کی تھی اور سال کے اختتام پر میں کالج میں بری طرح سے فیل ہو گیا تھا.....!!

شہر شفٹ ہوتے وقت امی جان نے بہت بھاری من سے نکاح کی سنت پوری کروائی تھی۔ دکھ، صدمہ، ذلت، طیش کیا تھا جس کی زد میں عادی نہیں تھا..... بات چھوٹی تھی اور حالات نازک..... مگر اُس کے لیے سب انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ ہماری دوستی کا انجام محض یہ ہوا۔

''تم نے میری بہن کے جذبات سے کھیل کے مجھے اس سے نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا، کاش جو گولی شیرو کو لگی وہ تمہیں لگی ہوتی.....''

وہ دھتکار کے اتنے حقارت آمیز الفاظ بول سکتا ہے، میں زندگی بھر نہیں یقین کروں گا..... پھر بھی روح گھائل ہوتی رہی اور بدبودار زخم بنتے رہے۔

''عادی کیا کر رہے ہو ہوش میں آؤ.....'' وسیم اُسے جھنجھوڑتا گرج کر بولا تھا۔ ''ہمارا دوست مرا ہے..... ہم تین زندہ ہیں۔ اور ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے، ہم سب بکھر گئے تو شیرو کی جوان موت محض الزام ہو کر بے مول رہ جائے گی..... اُس کا غم ہم مل کر ہی بانٹ سکتے ہیں ورنہ یہ ہمارے لیے ایک ناسور بن جائے گا۔'' وسی، جسے ہم اتنا سمجھتے نہیں تھے کتنی سچائی فاش کر رہا تھا..... وہ بپھرے شیر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر آخری بھونڈی کوشش کر رہا تھا۔

''میرے گاؤں میں دوبارہ قدم مت رکھنا..... تم نہیں رہو گے یا میں.....'' ڈوبتی مغرب کو ہم اتنی آسانی سے اس تباہ نگر کو چھوڑ آئے گویا کچھ دیر کے قیام کے لیے رکے ہوں۔ زندگی ٹھہر گئی ہے رکے ہوئے پانی کی طرح جس میں کائی بن کر بدبو [illegible] رہتی ہے..... جامد سی..... جس کا جمود شاید وقت توڑے..... شیرو کی بہن کی سہاگ کی نشانیاں میری مسیحائی کے منتظر لوگ..... میرے بچے پھر بھی عدیل خود..... ہاں مگر شاید.....!!

☆☆☆

سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو، اور املتاس کے اُڑتے پیلے پھول۔ فیروزہ نے جھاڑو دیے [illegible] چھڑکاؤ کر دیا تھا۔ سونیا کی پریشانی ایسی تھی کہ دن اُن کے سرد چولہے ابھی تک نہ جلے تھے۔ اُس کی طبیعت روز بہ روز گر رہی تھی..... ہتھیلیاں لٹھے کی مانند، ہڈیوں کا ڈھانچہ، ناخن بھی ایسے سفید جیسے خون بس نام کو رہ گیا ہو..... وہ قطرہ قطرہ اسے ختم ہوتا دیکھ رہے تھے۔

وہ اندر گئی تو عدیل لب کاٹتا آنسو بہا رہا تھا..... اب تو انجانے میں پرانے زخموں کے کھرنڈ بھی اُکھڑ گئے تھے، خون رستا تھا۔ فیروزہ کے قدموں کی چاپ سن کر وہ چونک گیا۔

''خود کو اور اذیت مت دو عدیل..... قسمت کو منظور ہوا تو ہماری سونیا بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

''میری قسمت کبھی اتنی اچھی نہیں رہی فیروزہ..... جن لوگوں سے میں محبت کرتا ہوں اُنہیں راس نہیں آتا.....'' اُس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ لگتا تھا جیسے سرخ مرچیں رگڑ لی گئی ہوں..... فیروزہ نے تڑپ کر اس کا سر اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔ وہ خود کو بکھرنے سے کب روکے ہوئی تھی۔

''ایسے باتیں منہ سے نہیں نکالوں عادی..... ہم سب کے ہیرو ہو، ہمارے محافظ..... تم نے ہمیں دھوپ میں کھڑے درخت کی مانند خود جل کر ہمیں ٹھنڈی چھاؤں پہنچائی ہے۔ اللہ کا نام لے کر سونیا آپریشن کروا لو عدیل۔'' گرم سیال اُس کے چہرے کو بھگو رہا تھا..... عدیل اس کے ہاتھ تھام کر ڈرے اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے لگا۔

"تمہارا دل مان رہا ہے.....؟ میں اپنی پھولوں سی بچی کو ان ڈاکٹروں کے بے رحم ہاتھوں میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا فیروزہ۔ مجھے ان پر یقین نہیں ہے۔"

"اللہ پر تو یقین ہے ناں..... ڈاکٹروں کی بھلا کیا اوقات۔"

"اللہ پر ہی تو یقین ہے....." اُس کی آنکھوں کے کٹورے پھر بھرنے لگے۔ "اپنوں کی تکلیف کا احساس روح فرسا ہوتا ہے فیروزہ، شیرو کے بعد مجھے لگا تھا، مجھے زندگی دوبارہ کبھی اس سے زیادہ بڑے دکھ سے دوچار نہیں کر سکے گی..... لیکن وقت پھر سے اسی مقام پر لے آیا ہے مجھے۔ سونیا کو کچھ ہوا تو مجھے معاف کر دینا فیروزہ، میرا ساتھ یہیں....."

"ایک لفظ اور مت کہنا عدیل..... تم کو ایک "ماں" کا دل نظر نہیں آتا، تم خود غرض ہو..... بہت خود غرض۔" فیروزہ ایک جھٹکے میں اُس سے دور کھڑی ہو گئی۔ عدیل کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے۔

"تم بہت قنوطیت کا شکار ہو رہے ہو عدیل، مگر مچھ ریت میں سر چھپا لے تو طوفان تھم نہیں جاتا..... سونیا تو ٹھیک ہو ہی جائے گی مگر اس سے پہلے تم اپنی باتوں سے ہم سب کو مار ڈالو گے۔"

"فیروزہ....."

"نہیں عادی..... تم بہت دفعہ بہت غلط فیصلے کر جاتے ہو اور پھر انہی کی اذیتیں سہتے رہتے ہو..... دو دن سے مجھے سب نظر آ رہا ہے تم کیوں بار بار آنکھوں کے کنارے پونچھتے ہو..... شاہ میر کی اولاد پر اتنا شدید ردِ عمل دے کر تم پھر مطمئن کیوں نہیں ہو تم تو "حق" پر ہو نا؟ دراصل مجھے اپنا ہمسفر بنا کے بھی تم اپنی ذات کے خول میں ہمیشہ سے تنہا رہے ہو۔ تم نے خود کو بہت اکیلا کر لیا ہے عادی....."

فیروزہ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ مصلحت کی چپ اب کیوں خالی برتن کا شور بن گئی تھی..... شاید ہاتھ سیدھا دل پر پڑ گیا تھا۔ عدیل پھیکا سا حیرت سے اس کی صورت تک رہا تھا۔

"تم شاہ میر کا ذکر کیوں بیچ میں لے آئی ہو؟"

"وہ ہمیشہ بیچ میں رہا ہے..... لیکن اب تم نے مجھے مجبور کیا ہے..... تمہیں پتا ہے عدیل پچھلے دو دنوں سے تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے؟" وہ بازو سینے پر باندھ کر چپ ہوئی، عدیل نے نظریں چرا لیں۔

"میں شاید اپ سیٹ ہوں فیروزہ..... ماضی میں جو ہوا وہ سب اچانک پھر تازہ ہو گیا....." عدیل لب بھینچے خاموش ہو گیا تھا۔ فیروزہ کو ترس سا آیا اُس پر۔

"تم چاہتے ہو وہ خود آتا ناں تمہارے پاس.....؟" اس نے جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ آنکھوں میں سختی ہلکورے لیتی تھی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو فیروزہ؟ تم جانتی ہو اُس نے کیا کیا تھا..... وہ بھائی تھا میرا..... لیکن وہ نہیں تھا۔" اس کے لہجے میں شکستگی سی تھی..... اپنی کم مائیگی کا احساس..... چکنا چور مان کی کرچیاں۔

"تم تو تھے نا عدیل..... تمہاری خود ساختہ ناراضی کی مدت اتنی نہیں ہے جتنی تم دونوں سزا کاٹ چکے ہو؟ تم تو بہت نرم دل ہو عدیل پھر بھی اتنے سالوں میں تمہیں ذرا سا رحم نہیں آیا کہ بات اتنی بھی نہیں..... مجھے تو خوف آتا ہے عادی مجھ سے بھی کوئی غلطی ہو گئی تو تمہاری تو نفرت بھی محبت کی طرح بہت انتہا کی ہو گی۔" وہ کھوئے ہوئے اُداس کن لہجے میں بولتی مرگھٹ پار بیٹھی سوگوار سی کنیا لگتی تھی جو آئے روز جسم و آگ کا تماشا دیکھتی ہو۔ افسردگی چاروں اور سسک سسک رہی تھی۔

"ایسا مت کہو فیروزہ..... تمہارا معاملہ بہت الگ ہے۔" اس نے بے چین ہو کر کہا مگر اُس کا لہجہ بے لچک تھا..... جو جتنا محبت کرتا ہے، اُس سے دگنا قرض ادا کرتا ہے۔

"اُس کا معاملہ بہت بڑا ہے..... اُس نے میرا اندھا یقین توڑا تھا فیروزہ..... جس شخص پر آپ کو

یقین ہونا اُسے بھروسا نہیں توڑنا چاہیے ورنہ انسان کھوکھلا رہ جاتا ہے۔ میرے کچھ خواب تھے، کچھ اُمیدیں..... میری بہن مر جاتی، اُسے پروا نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے خود کہا تھا بہنیں بھائیوں کا دل ہوتی ہیں تو اسے عادی کے دل کی پروا نہیں رہی..... کلثوم اپنی گرہستی میں خوش ہے لیکن میں نہیں بھول سکتا کہ اُس نے مجھے اپنی کنواری بہن سے نظریں چرانے پر مجبور کیا تھا۔"

"میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہیں ہے عدیل..... زندگی میں والدین، بیوی، بچے اپنی الگ جگہ..... لیکن مخلص دوست انسان کی فولادی طاقت ہوتے ہیں۔ وہ ایک خاموش اظہار ہوتے ہیں کہ ہم تمہاری پیچھے کھڑے ہیں، اور وقت نے چاہا تو آگے بھی..... تم بار بار اسی لیے ہمت ہار جاتے ہو عادی کہ تم نے اپنے دوست کھو دیے ہیں لیکن ہم سب تو ہیں ناں....." اُس کے چوڑے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فیروزہ محبت سے بولی تھی۔ اسے اپنے شوہر کے دل کا غبار نکالنا مقصود تھا جس میں وہ کامیاب ہوگئی تھی..... عدیل اُٹھا تو اس نے فیروزہ کو کہتے پایا۔

"سونیا کے آپریشن کے لیے وقت لے لو عادی....."

"اور پیسے.....؟"

"زمین بیچ دو، روکھے سوکھے پر گزارا کرلیں گے۔" اُس نے اپنا آخری آنسو پونچھا۔

☆☆☆

"مجھ سے مت چھپائیں پاپا..... شاید اللہ نے ہی میرے سامنے اس پردے کو چاک کیا ہے۔"

"شیر دل۔ ویسا نہیں ہے بیٹا، وہ سچ ہوتا مانوں ناں..... اپنی مما سے پوچھو، میں بڑا افسانہ طراز تھا، وہ صرف میرے تخلیق کے کردار ہیں۔"

"اُن کرداروں کی آپ کی زندگی پر گہری چھاپ ہے پاپا۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ کردار امر ہو جائیں۔"

بے کار کی ضد چھوڑ دو شیرو..... زندگی کوئی کینوس نہیں، جس میں تم اپنی مرضی کے افسانوی رنگ بھر لو، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ہم راز چھپا کے پھر رہے ہوں۔"

"زندگی بہت گہری اور پیچیدہ ضرور ہے پاپا..... اور افسانوی رنگ اس سے بڑھ کر کیا ہوں گے کہ آپ کے نام پر ہمیں گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔"

لمحے بھر کو وہ خاموشی میں چلے گئے تھے" پن ڈراپ سائلنس"..... وال کلاک کی ٹک ٹک سماعتوں پر ہتھوڑے کی صورت برس رہی تھی اور وہ لوگ دم بخود تھے۔ شاہ میر، رضیہ اس اتفاق پر بے یقینی سے بے زبان ہو رہے تھے..... اور شیر دل حد درجہ سنجیدہ تھا۔ وہ اسی لمحے سے بہت ڈرتے تھے کہ کبھی والدین کے دلوں کے ناسور اُن کے بچے محسوس کریں۔

"تم لوگ کسی اجنبی کے گھر گھس جاؤ گے تو وہ یہ ہی سلوک کریں گے۔" شاہ میر برہمی سے بولا۔ مارے بے بسی کے اُس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ رضیہ کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر دونوں کے تابڑ توڑ جملے سن رہی تھی۔

"اُن کی بیٹی سونیا..... وسیم چاچو نے کبھی نام تو بتایا ہوگا آپ کو..... اُس کے دل میں سوراخ ہے۔" شیر دل نے اُس کے ضبط پر ایک اور دھما کا کیا۔ شاہ میر کا وجود بگولوں کی زد میں آگیا۔ وسیم نے اس بات کا ذکر اس سے کبھی نہیں کیا تھا..... دونوں کا تعلق سرسری سا رہ گیا تھا۔ دونوں رابطہ قائم کرتے پھر دونوں ہی بول نہ پاتے۔ اس طرح ایک نے بات کرنا عرصہ ہوا ترک کردی۔ دوسرے نے بھی کوشش نہیں کی تھی۔

"شیر دل میرے کمرے سے باہر جاؤ....."

"ایم سوری پاپا....." اُس نے ڈائری سینٹرل ٹیبل پر رکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ "بہت ہوگیا تھا پاپا قدرت کو شاید اب منظور ہوگیا ہے کہ آپ سب ایک فیملی بن جائیں۔ اُس کی مصلحت کوئی نہیں سمجھتا مگر اُنہوں نے آپ کے لیے وسیلہ پیدا کردیا

ہے..... میں شیر دل ہوں نا پاپا، شیر دل آپ سب کو پھر سے جوڑ دے گا.....

شاہ میر کے گرد برف کی سرد دیواریں کھڑی ہوئیں..... شیر دل کہہ کر رُکا نہیں۔ رضیہ نے کپکپاتا ہاتھ اُس پر رکھا تو اُسے وہ مٹی کا بے جان مجسمہ لگا۔

☆☆☆

سورج بھی کے پھول مغرب کی طرف سر جھکائے کھڑے تھے۔ اُفق کے کناروں پر گرد کا غبار تھا جو ہوا چلنے کا واضح سندیسہ دے رہا تھا..... کسی بھی وقت آندھی آتی اور ہر چیز پر گرد پڑ جاتی۔ موسم بدل رہا تھا، کھڑی عصر میں مرغی اپنے گداز پروں والے چوزوں کے ساتھ گشت کے لیے نکلتی تو لگتا تھا زمین اُس کے پاؤں نہیں جلاتی۔ عدیل تیزی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوا تو بہت خوش نظر آتا تھا۔ اُس نے وہیں سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

"فیروزہ..... عدن..... کہاں ہو تم لوگ۔"

چھوٹے چھوٹے چوزے اُس کے قدموں میں آتے بمشکل اُچھل اُچھل کر بچے تھے..... مرغی ناگواری سے چلانے لگی۔

"خدا خیر کرے، خیریت تو ہے۔" فیروزہ لمبا سا دوپٹا سنبھالتی آئی..... اور عدن کے ہاتھ میں قلم کتاب تھی۔

"اللہ نے ہماری سن لی ہے..... سونیا کے ڈاکٹر نے کہا کہ شہر کے معروف و ماہر سرجن نے سونیا کی سرجری کے لیے وقت دیا ہے، اور اگلی بات سنو کہ وہ بالکل مفت سرجری کر رہا ہے..... میں نے کہا بھی کہ انہوں نے سونیا کے لیے اتنا کیا بہت ہے ہم پیسوں کا بندوبست کر رہے ہیں..... مگر ان کا کہنا تھا جب ڈاکٹر خود کہہ رہے ہیں تو ہم کفرانِ نعمت کیوں کر رہے ہیں..... وہ بہت پُرامید تھے فیروزہ۔" عدیل کے چہرے پر خوشی کے بے شمار رنگ کھل رہے تھے۔ فیروزہ نے تشکرانہ تاثرات سے آسمان کی طرف دیکھا۔

"اللہ بڑا کارساز ہے عدیل..... ڈاکٹرز کو پیسوں کی کیا کمی، لیکن یہ واقعی ہمارے لیے فرشتہ بھیجا گیا ہے۔" مسرت سے اُس کا جسم لرزنے لگا تھا۔

"ابا میں نے اس کے لیے اللہ سے ایک سو پچاس نفل منت مانگی ہیں..... سونیا ٹھیک ہو جائے، اس سے ڈبل شکرانے کے نوافل ادا کروں گا۔" عدن نے جگمگاتی آنکھوں سے باپ سے کہا۔ عدیل نے ہنستے ہوئے اُس کے بال سنوارے۔

"تم لوگ نیم کی چھاؤں میں بیٹھو، میں ابھی باداموں کا یخ شربت لاتی ہوں۔" فیروزہ اُلٹے قدموں پلٹ گئی تو وہ وہاں بیٹھنے کی بجائے اندر چلا گیا۔ الماری میں اُس نے سونیا کی ٹیسٹ رپورٹس کی فائل اُٹھائی، وہ تمام کاغذوں کی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فائل کھولی تو پہلا ورقہ نہ کسی ٹیسٹ کی رپورٹ تھا..... نہ ہی ادویات کا نسخہ.....!

۲۱ ستمبر، ۵۰۰۲ء

وقت مغرب، سرمئی پھیلتی رات،

میرے پیارے دوست عادی.....!

دعا کر رہا ہوں کہ زندگی تم پر چاروں جانب سے مہربان ہو، اور تم بالکل اسی بے فکری سے خوش و مگن ہو جس میں تم لوگوں کو میں مرنے سے پہلے چھوڑ کر گیا تھا..... یہ خط آسمانوں کی وسعتوں میں اللہ کے کہیں بہت آس پاس ہو کر باتیوں کے بجائے تمہیں صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کیوں کہ ان گنت سال گزر جانے کے باوجود مجھے یاد ہے کہ تمہیں ہم سب کا سربراہ بننے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا.....

تم..... میرے بھائی، نہیں بلکہ بھائی سے بھی بڑھ کر..... ماں جیسی محبت کے قریب قریب..... تم جان قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے ناں، تو یہ حوصلہ تو صرف ایک ماں میں ہی ہوتا ہے۔

ہم چار تھے عادی..... اور اب بھی چار ہیں۔ یقیناً میں اب بھی تم لوگوں میں موجود ہوں..... ہنسی کے نغموں میں، یادوں کے ترانوں میں، آنکھوں کی نمی میں..... اور دلوں کے جذبات میں۔ مجھے ایک شکوہ ہے کہ میرے مردہ لبوں پر چنگی مسکان دیکھ کر تم

نے پوچھا ہی نہیں کہ میں جو اپنی بہن کے لیے اتنا فکر مند رہتا تھا اب ہر فرض سے وقت سے پہلے منہ موڑ چکنے کے بعد بھی مرتے وقت کیوں مسکرایا ہوں گا؟ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں عادی کہ میری جان لیتے وقت موت کے فرشتے نے سرگوشیانہ استفسار کیا۔

"تمہارے بعد تمہاری ماں اپنی واحد لاٹھی کا درد اور تمہاری بہن اپنے سرکا مان تمہاری قبر کی کس مٹی میں گھول کر پیئں گی؟"

بس اسی کے اسی پل کے رتبے میں مسکرایا تھا ،اور میری آنکھوں کے سامنے تم تین آئے تھے۔ اللہ نے کسی کو بے سہارا کب چھوڑا ہے..... ہر کسی کے لیے زندگی جینے کے بہت آسرے موجود ہوتے ہیں اور پھر تم تو تھے بھی تین تین.....!!

میں جانتا ہوں تم نے اپنی بہن کی ذمہ داری بہت اچھے سے نبھائی..... اس کی بہترین جگہ شادی کی اور بھلے جتنی بھی مشکلیں تمہاری زندگی میں آئی ہوں گی..... تم اپنے ضمیر کے آگے سرخرو رہے ہوگے۔

اماں نے کچھ عرصہ بعد آکر مجھے سب بتایا تھا کہ تم میری محبتوں کے بھی امین رہے..... اور دوستی کا بھی حق ادا کیا۔ آنکھیں نم ہوگئی تھیں کہ میرے اتنے انمول دوست تھے۔ اور انمول واقعی صرف "دوست" ہی ہوسکتے ہیں۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ میری زندگی چھن گئی..... کاش میں اس میں تمہارے احسان اُتار پاتا۔ بہنیں بھائیوں کا دل ہوتی ہیں..... تم نے اُس "دل" کی حفاظت کر کے جو مجھے سانسیں دی ہیں وہ ایک موت سے کبھی نہیں ڈوب سکتیں اسی لیے میں تم لوگوں میں زندہ ہوں میرے دوست.....

آزمائش صرف ایک انسان پر اُترتی ہے..... اور اللہ بلا مقصد بھی اُس انسان پر نہیں اُتارتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اُس انسان کا ظرف دیکھ کر اُسے اس آزمائش کے لیے چنتا ہے تاکہ وہ سرخرو ہونے کا حوصلہ خود میں رکھ سکے۔ اور وہ انسان بہت "خاص" ہوتا ہے..... کہ اُسے رشتوں کی قدر ہوتی ہے، اور اپنوں کی پرکھ۔ جو کٹھن وقت میں وفا نباہنا جانتا ہو..... اور مرض کی شفاء بننا بھی۔ اور مجھ سے بڑھ کر کون جانتا ہوگا کہ میرے دوست بھی "خود غرض" نہیں ہوسکتے.....

اپنی بہنوں کا بہت خیال رکھنا..... اور باقی دونوں شیروں کا بھی۔ اللہ سے تم لوگوں کے لیے بہت دعا گو رہتا ہوں..... پھر بھی کوئی پھانس سی ہے جو نکلتی ہی نہیں۔

خیر اب اجازت چاہتا ہوں کہ اتنا بہت ہوگا

عالم ارواح سے تمہارا دوست

شیر دل

کوئی زلزلہ سا تھا جس کی زد میں آئے عدیل کا وجود خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ایک بار پھر غلط وقت پر وہ تحریر اُس کے ہاتھ لگی تھی..... مگر نہیں وہ ہی دراصل صحیح وقت تھا.....!

"تمہاری بہن..... تمہاری بہن..... تمہاری بہن....." وہ بازگشت تھی جو اس کی سماعتوں کی عروج سے کھائیوں تک ہو کر معدوم ہوتی جارہی تھی..... اس کے دماغ میں اندھیرا چھانے لگا۔

"مغرب کا وقت..... تمہاری بہن..... بھائیوں جیسے انمول دوست..... خاص انسان..... خود غرض انسان..... خود غرض انسان۔"

"میں خود غرض انسان.....؟" حیرت کی بلندیوں پر چڑھ کر اُس نے ماؤف دماغ سے سوال کیا۔ اُس کے ہاتھ اسی سالہ بوڑھے کے سے تھے اور کاغذ کا بے جان سا خاموش ٹکڑا اُس میں جھولتا سپاٹ تھا.....!

"اماں نے آکر بتایا مجھے تم میری محبتوں کے امین رہے..... کاش تمہارا احسان اُتار پاتا، بہنیں بھائیوں کا دل ہوتی ہیں..... اللہ ایک انسان کو آزمائش کے لیے چنتا ہے اور وہ بہت خاص ہوتا ہے..... میرے دوست بھی خود غرض نہیں بن سکتے۔"

مغرب کا وقت، رضیہ کی رخصتی کا سمے، اور رضیہ کون تھی؟ وہ اُسے تمہاری بہن کہہ رہا ہے.....

"مجھے دوستی کا حق ادا کرنے دو....." اُسے میرو کی بے بسی یاد آئی اور اس کے الفاظ..... تو "خاص انسان" وہ تھا۔ خود غرضی عدیل نے دکھائی..... اُس کی ٹانگیں اُس کا وزن اُٹھانے سے قاصر ہو گئیں تو وہ پھسلتا چلا گیا۔

انسان تو اتنا ارزاں نہیں ہے کہ وہ چیختا رہے اور کچھ نہ سمجھا سکے..... ایک کاغذ کا کھردرا ٹکڑا اتنا طاقت ور ہو جائے کہ یوں آئینہ دکھا دے۔ اُس نے تو واقعی ہی ارزاں سمجھ لیا تھا..... شیرو کی موت کو، شاہ میر کو۔ اُسے نیم تاریک کمرے میں اپنی ایک ایک بات یاد آئی..... اُس نے وہ تحریر بار بار پڑھی اور اسی صفحے میں اپنا منہ چھپا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

وہ اینڈ میں نتھی داماں رہ گیا تھا..... اپنی انا، ناراضی، شاہ میر اور اُس کے بہت دور جا چکے بچے.....

☆☆☆

آنگن کے جھولے میں دونوں ہلکا ہلکا ہلتے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے..... رضیہ کا دوپٹا ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا کہ لمبے بال شاہ میر کے شانوں پر پڑے تھے۔

"امی جان اور بابا عمرے سے واپس آ رہے ہیں..... بچوں کو بہت یاد کر رہے ہیں۔" شاہ میر نے اُسے اطلاع دی۔

"ماشاء اللہ! اور اپنے بچے کو؟" وہ مائل بہ شرارت ہوئی تو شاہ میر کے گالوں میں گڑھے بن گئے۔

"اُن کے بچے کے پاس تم ہو، وہ اپنی بہو کو یاد کر رہے ہیں....." وہ کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ رضیہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"سوچ رہی ہوں کہ پہلی پہل کتنا مشکل وقت کٹا ناں میرو..... اماں کی وفات اور پہلے بچے کی پیدائش پر تمہارا ہاسٹل میں ہونا، تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو میں شاید سنبھل نہ پاتی۔"

"کیوں ایسا سوچ رہی ہو، تمہاری ثابت قدمی اور صبر کا صلہ دیا ہے زندگی نے۔" شاہ میر سفید کرتا شلوار میں کف کہنیوں تک موڑے اُسے بہت وجیہہ نظر آیا۔ وہ سیدھی ہو گئی۔

"لیکن تم نے اپنی پوری زندگی میرے ساتھ سمجھوتے میں وقف کر دی۔ جب میری شادی ہوئی تم سے، تم نے دنیا دیکھی ہی کہاں تھی۔"

"تم صاف کیوں نہیں پوچھتیں..... کہ باہر کی دنیا دیکھ کر مجھ پر پچھتاوے کہاں کہاں سے حملہ آور ہوتے ہیں؟"

"تم خود بتا دو....." وہ آہستگی سے بولی تو شاہ میر ہونٹوں کی چونچ بنا کے آنکھیں ترچھی کیے سوچ میں پڑ گیا۔ رضیہ مسکرانے لگی.....

"مائی ڈیئر وائف تو بات یوں ہے کہ تمہارا ہزبینڈ سیدھا سا بندہ ہے..... جسے یہ سادہ سی بندی ہی پسند ہے۔"

"کبھی کبھی بہت شرمندگی ہوتی ہے اپنے آپ سے کہ تمہاری زندگی میں میرا وجود کسی سزا..... شاہ میر نے تیزی سے اُس کے لبوں پر اُنگلی رکھی..... مسکراہٹ ہنوز لپٹی تھی۔

"تمہارا وجود میری زندگی میں ہے تبھی میں زندہ ہوں، کیا تم نے مجھے اپنے ساتھ خوش نہیں دیکھا؟..... تم مجھ سے کوئی شکایت نہیں کرتیں۔"

"مجھے تم سے کبھی شکایت ہوئی ہی نہیں میرو..... خود سے بڑھ کر مجھے کسی اور لڑکی کی خوش قسمتی پر یقین نہیں..... تم ایک بہت پیارے انسان ہو۔"

"مجھے تم سے بہت محبت ہے رضیہ، اس لیے کہ میں نے یہ بندھن خلوص دل سے قائم کیا تھا..... تمہاری وجہ سے میری زندگی پُرسکون اور مطمئن ہے جو کسی اور کے ساتھ شاید نہ ہوتی۔ تم میری زندگی کا روشن ستارہ ہو....."

شاہ میر کو رضیہ کی آواز بھاری ہوتی لگی..... عورت دنیا کی حسین مخلوق، جسے محبت کی دو بوندیں

سرسبز و شاداب کر دیتی ہے۔ شاہ میر کے بھرپور اعتراف پر وہ مسکرائی تو ایک روشن جگنو کاسنی پھولوں سے اُڑتا ہوا رضیہ کے نم گال پر بیٹھ گیا۔ شاہ میر نے اُسے نرمی سے چھو کر رضیہ کے ماتھے پر بٹھا دیا۔

''اور تمہارے مقدر کا ستارہ میرے ساتھ ایسے جگمگاتا رہے، کیونکہ تمہارے بغیر اب میں ہر طرح سے ادھورا ہوں۔'' اُس نے ناک پر چٹکی کاٹی، تو رضیہ نے کھلکھلاتے ہوئے اپنا سر پھر سے شاہ میر کے شانے پر رکھا۔ اُس کی مانگ تک جاتا جگنو بہت چمک رہا تھا۔

☆☆☆

ہاسپٹل کا کوریڈور وحشت ناک سناٹے میں گھرا تھا۔

تسبیح کے دانوں کے ساتھ فیروزہ کے آنسو بھی متواتر گر رہے تھے..... راہداری میں ملگجا سا اندھیرا، فینائل و ادویات کی بدبو اور قدموں کی اُبھرتی دم توڑتی چاپ۔ ہر آہٹ پہ دل حلق تک اُچھلتا تھا۔ انگاروں پر ٹہلتے عدیل کے خشک لب ہر اُس آیت کا ورد کر رہے تھے جو اس ننھی پری کی زندگی کی لکیر کو بڑھا دیتی۔ اعصاب شکن انتظار کے بعد بتی بجھی اور عدیل کی سکت ختم۔ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھول کر چہرے پر ماسک اور آنکھوں پر چشمہ لگائے سفید اوور آل میں ڈاکٹر باہر آیا..... عدیل کے پیر زنجیر ہو گئے۔ کسی معمول کی طرح ڈاکٹر سیدھا چلتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھ گیا.....

عدیل پیچھے جاتا کہ آگے۔ اُس کے دل کو ڈاکٹر کی خاموشی پنکھ لگا گئی۔

''میری سونیا.....'' وہ بھاگ کر آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھا، فیروزہ بھی حواس باختہ سی تھی۔ اسی وقت ایک اور ڈاکٹر اور نرسیں باہر نکلیں۔

''وہ اندر میری بیبی.....؟'' الفاظ اُس کے حلق کے تاریک سرنگ میں پھنس گئے۔

''آپریشن کامیاب رہا ہے، ہم تھوڑی دیر میں روم میں شفٹ کر رہے ہیں..... باقی انسٹرکشنز کے لیے ڈاکٹر شاہ میر سے مل لیں۔'' نرس نے پیشہ ورانہ انداز میں عدیل سے مخاطب ہو کر کہا اور اندر چلی گئی۔

سونیا کی خوشی، ہسپتال، فیروزہ..... اُسے ان سب میں صرف ایک نام یاد رہا۔

''ڈاکٹر شاہ میر.....'' وہ وہیں سے چیخا۔ کچھ لوگ مڑے، پھر پلٹ گئے۔ اُنہیں لگا وہ پاگل ہے۔ اور وہ پاگل ہی ہے..... شاہ میر اتنے سالوں بعد اُس کے سامنے آیا اور منہ ڈھانپے گزرتا چلا گیا۔ اُسے آج بھی پاس تھا عدیل کے الفاظ کا..... عدیل جست لگاتا اندھا دھند بھاگا۔ راہداری، سیڑھیاں، نیچے..... اور نیچے وہ ریسپشن کے پاس فائل پر جھکا کچھ تیز تیز لکھتا جا رہا تھا..... عدیل ہاتھ پہلو میں گرائے، قدم قدم چلتا اُس کے قریب آنے لگا۔ آنسو موتیوں کی لڑیوں کی صورت اُس کے رخساروں پر دیوانہ وار بہہ رہے تھے۔

''شکریہ بہت بچ ہو گا ڈاکٹر صاحب.....'' عدیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ کر گلوگیر لہجے میں کہا۔ شاہ میر کے ہاتھ تھے..... وہ نہیں مڑا..... نہیں مڑا۔

''بہت شوق ہے تمہیں دوستی کا حق ادا کرنے کا.....'' وہ بنا اُسے موڑے کہتا گیا۔ شاہ میر روٹھے بچے کی طرح پیٹھ موڑے کھڑا رہا۔

''بندہ اتنا تو سوچتا ہے کہ وہ بندہ اس قابل ہے کہ نہیں..... ایک اور قرض چڑھانا ضروری تھا۔''

''سوری میں ڈیوٹی پر ہوں اور میری.....''

''تیرا ابا بھی ڈیوٹی پر ہے.....'' عدیل نے ایک جھٹکے میں اُسے سیدھا کیا..... اتنا اچھا اداکار بھی نہیں تھا وہ کہ اپنی آواز سے دھوکا دیتا۔ عدیل نے ایک اور جھٹکا اسے دیا اور دونوں ایک دوسرے کے گلے میں جھول گئے۔ ہسپتال میں، وہاں کئی لوگوں کی موجودگی میں..... اسٹاف کے سامنے وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے شدتِ جذبات سے روتے ہوئے ہر چیز کو فراموش کر رہے تھے۔

''شیر دل'' نے واقعی اُنہیں جوڑ دیا تھا۔

دیکھنے والوں نے حیرت سے تھم کر دیکھا۔۔۔۔ انہیں لگا شاید کوئی مرگ ہوگئی ہے۔۔۔۔ حالانکہ اُن کا وارث "زندہ" ہوا تھا۔

پھر اسی راہ گزر پر شاید
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید
جن کے ہم منتظر رہے ان کو
مل گئے اور ہمسفر شاید
اجنبیت کی دھند چھٹ جائے
چمک اٹھے تیری نظر شاید
جو بھی بچھڑے وہ کب ملے ہیں فراز
پھر بھی تو انتظار کر شاید

☆☆☆

سونیا کی سرجری کے دس دن بعد کا منظر:

شوخ رنگوں کے تمام پرندے دیس کو لوٹ آئے تھے۔ وہی بستی اور اُس کی دھول اُڑاتی پگڈنڈیاں تھیں۔۔۔۔ وہی گلیاں جہاں اُن کا بچپن مچلتا تھا، وہی نانا جان کا گھر جہاں اُس کے قدموں کے نشان آج بھی ثبت تھے، اور تو تلے الفاظ گونجتے تھے۔ وہ ہی شیرو کا گھر۔ (ایک درد سا اُٹھا، ہوک سی) جس کے کچی دیواروں میں ایستادہ لکڑی کے دیمک زدہ دروازے پر پڑا قفل اتنا زنگ آلود تھا کہ شاید ہی وہ کھلتا۔ وہ کچی نرم گھاس والی پنسال (اب ٹوٹ چکی تھی) نہر کے پار فالسوں کے باغات تو اب بھی تھے۔ سورج کی ست رنگی شعاعیں فضاؤں کو رنگین کر رہی تھیں جن میں آتشی رنگ نمایاں تھا۔۔۔!!

شاہ میر کی گاڑی جادی کے گھر کے سامنے رکی تو آدھی بستی گلی میں جمع تھی۔ وہ دونوں میاں، بیوی بکو شرمندہ سے ہوتے نیچے اُترے۔۔۔۔ شیر دل اور صفیان کو عدن نے دور سے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی موجودگی باور کرائی۔ وہ دونوں اُسی کے پاس گئے۔

"کچھ بتاؤ شیر دل، کیا تم اُس دن واقعی حادثاتی طور پر ہمارے گھر آئے تھے؟" شیر دل نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"میں تمہیں جاسوس لگتا ہوں کہیں سے۔۔۔۔ اور مجھے یہ بھی بتاؤ کہ تمہیں کہ مجھے ایسے بھی خواب نہیں آئے جس میں تمہیں دوست بنانا مقصود ہو۔" وہ ناک چڑھا کر بولا۔ عدن بہت اُداس لگا تھا۔

"مت بھولو کہ تمہارا پورا کام میں نے کیا تھا۔۔۔"

"تو تمہیں بھی تو ہمارے رشتے دار نکل آنے کا اعزاز مل رہا ہے ناں۔" کیا شان بے نیازی تھی شیر دل کی۔۔۔۔ تینوں نے بے ساختہ قہقہے لگائے۔ عدن کے باقی دوست جھینپ گئے تھے۔

"پاپا! ہمیں اُنہوں نے گھر سے نکالا تھا۔۔۔"

عدیل کو آتا دیکھ کر صفیان نے منہ بسورتے ہوئے باپ سے شکایت کی تو سب مسکرا اُٹھے۔ ہوا کے دوش پر درختوں کے شاخیں جھومنے لگی تھیں۔

"بیٹا یہ میرے بھائی ہیں۔۔۔ آپ کے چاچو۔"

"تو آپ کو نکالتے ناں، ہمیں کیوں۔۔۔"

اُس کا منہ ابھی بھی مصنوعی ناراضی سے پھولا ہوا تھا۔ جب عدیل مسکراتا ہوا ذرا سا جھکا۔

"نکالنا تو واقعی اسے چاہیے کہ اس نے میرے پیارے بھتیجوں کو ہم سے دور رکھا۔۔۔۔ لیکن خیر ہے اب یہ آپ کا گھر ہے ہماری گستاخی معاف۔" عدیل کی اپنی ہی باتوں پر کٹتی سی اُبھری تھی مگر کسی نے محسوس ہوئے دیے بنا قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔

"اور سونیا کی طبیعت کیسی ہے اب بھابھی؟"

رضیہ اپنے سر پر عدیل کا ہاتھ دیکھ کر بس پھکا سا مسکرا سکی۔۔۔۔ دیوار گرنے میں ذرا سا وقت تو لگتا تھا۔ وہ فیروزہ کے ساتھ بیٹھ کر پوچھنے لگی، جو خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"بہت بہتر ہے۔۔۔۔ اب تو بس مہینہ بھر میں مکمل صحت یاب ہو جائے گی، شاہ میر بھائی کے بہت احسان۔۔۔۔"

"یہ مت کہیں فیروزہ، اب بھائی کہا ہی ہے تو بغیر احسان کے اُنہیں ذمہ داری پوری کرنے دیں۔"

اُس کا سنجیدہ لہجہ فیروزہ کو متاثر کر رہا تھا۔ دونوں چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگیں۔

"میں نے تم لوگوں کا بہت انتظار کیا ہے شیر دل۔" عدن نے دونوں بھائیوں کو مخاطب کیا۔

شیر دل نے بہت خلوص سے اُسے دیکھا۔

"میں نے کہا تھا ہم آئیں گے عدن، بس دعا کرو کہ ہر دکھ کا ازالہ ہو جائے..... تم نے بہت سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے عدن، سونیا کا دکھ محسوس کرتے ہوئے ہی عادی چاچو اُس خط کی گہرائی سمجھ سکتے تھے، ورنہ میرے لفظوں میں کیا سکت....."

میرے دوست بن جاؤ شیر دل....." عدن نے مسکراتے ہوئے کہا تو شیر دل گردن اُٹھا کے ہنسا۔

صفیان اُترے چہرے کے ساتھ بور بیٹھا تھا کہ دو "سمجھدار" لوگوں کی عالمی گفتگو اختتام پذیر ہو تو وہ کوئی چٹکلا چھوڑے.....!

ان سب کو یہیں چھوڑ کر وہ تینوں دوست بچپن کی طرح ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے..... ایک سکون تھا، طمانیت تھی، زندگی جیسے آج مکمل تھی۔

"میرو شیر دل کتنا سمجھدار واقع ہوا ہے، کیا کبھی سوچا تھا کہ ہم بڑوں کی صلح یہ بچے کروا دیں گے۔" وسیم نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عدیل زخمی سا ہنس دیا۔

"بڑوں کی غلطیاں اکثر بچے آ کر سدھار جاتے ہیں..... دکھ تو اس بات کا ہے کہ جو بات وہ سمجھا سکتے ہیں وہ مجھے سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ میں نے اپنی ناراضی میں اتنے سنہری سال جلا دیے۔"

"مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے عادی، جب سب کچھ اچھا ہو جائے تو برا وقت یاد ہی نہیں آتا کہ کبھی آیا تھا..... تب حالات ہی ایسے بن گئے تھے۔" شاہ میر نے کندھے پر ہاتھ مارا۔ وہ دونوں سے اس قدر بے تکلفی سے بات کر رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے..... عدیل شرمسار ہو رہا تھا۔

"اور شیر دل نے سب کے لیے حالات سازگار کر دیے، وہ شیر دل جیسا ہے ناں۔" وسیم نے استفسار کیا۔ شاہ میر مسکرایا۔

"ہمارا شیرو ہے وہ..... اور ایک دوسری کاپی عدن۔"

"شیر دل نے بہت خوب صورت لکھا کہ تم بہت خاص انسان ہو، تمہیں دوستی کا حق نباہنا آتا ہے، یہ تو میں ہی خود غرض بن گیا تھا ورنہ شیرو کے سامنے آج....." اُس کی آواز بھرا گئی تو شاہ میر نے ٹوک دیا۔

"بس یار پوری کہانی میں عورتوں کی طرح بہت رو لیے ہیں ہم..... تمہیں تو اندازہ ہے ایک بڑا ڈاکٹر ہوں میں۔"

"بڑے عہدوں کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے کیا میرو؟" شاہ میر کے مذاق پر وہ کچھ سوچ کر بولا تو اُس نے بے ساختہ کہا۔

"اگر ہوتا تو تمہارے ساتھ ہاسپٹل میں نہ روتا..... حالانکہ بہت روڈ مشہور ہوں، خیر مجھے کپلی والی زندگی چاہیے عادی..... اب تو اس میں رنگ بھرنے بہت پیارے کردار شامل ہو چکے ہیں۔"

"اور ہمارا شیرو بھی..... یقیناً اب اُس کے دل کی وہ پھانس بھی نکل گئی ہوگی، اور وہ ہم سب کے بہت پاس ہے..... بالکل ساتھ۔"

فیروزہ نے اسی سے درست کہا تھا کہ دوست سانسوں کی کشادگی فراہم کرتے ہیں..... سب کچھ کتنا مکمل تھا، اور مٹھی میں۔ غصہ تو وقتی ہوتا ہے، اُتر جاتا ہے۔ "انا" خطرناک ہوتی ہے۔

روٹھنا چاہیے..... کہ اس سے از سر نو محبت جی اُٹھتی ہے۔

لیکن اتنا طویل نہیں روٹھنا چاہیے کہ دل ہی مردہ ہو جائیں.....

ہاتھوں میں پتھر لے کر اُنہوں نے ایک ساتھ تین پتھر نہر میں پھینک دیے۔ اُن کے ساتھ سورج کی ارغوانی کرنوں نے بھی دیکھا کہ تینوں پتھروں کے گرد بننے والے "دائرے"، "چار" تھے۔

☆☆

عندلیب زہرا

صفائی پسند

دیبا باجی اور ان کا گھر میرا آئیڈیل تھا۔ روشن چہرے والی، اجلے اجلے ہاتھ پیر، نکھرا نکھرا سراپا۔ نفاست و سلیقہ جیسے ان پر ختم تھا۔ ان کے گھر اور شخصیت سے جیسے پاکیزگی کا تاثر ابھرتا تھا۔ میری پہلی ملاقات ان سے میلاد و قرآن خوانی کے موقع پر ہوئی تھی۔ دو گلیاں چھوڑ کر ان کا گھر تھا۔ سبز بیلوں سے ڈھکا ہوا، صاف ستھرا۔ سب خواتین با ادب طریقے سے قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ پھر میلاد کا انعقاد ہوا۔ کتنے دن میں ان کے سحر میں رہی۔ اپنا گھر میلا، گندا سندا لگتا۔ امی نے میری ان ترانیوں سے تنگ آ کر کہا۔

"صاف رکھنے سے گھر صاف ہوتے ہیں۔ تم خود بھی ہاتھ پیر ہلایا کرو نا۔"

"بھابھی کیوں دھیان نہیں رکھتیں؟ مجھ پر پڑھائی کا بوجھ ہے" میں چمک کر بولی۔

"ہاں پر کم بوجھ ہے — چار اپنے بچے، میاں، ساس، سسر — اور پھر تم۔" امی نے آنکھیں نکالیں۔

"انصاف پسندی۔" میں بڑبڑائی۔

"کرتی ہے بے چاری — سارے دن لگتی رہتی ہے۔ تم پڑھتی رہتی ہو، مل تھوڑی جوتی ہو۔ آئندہ تم خود ہاتھ پیر ہلایا کرو گی۔" امی نے حکم صادر کیا۔

میں بھی کیا کرتی، صفائی پسند تھی مگر کفار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ منی پلانٹ کی بیل لگانے کی کوشش کی (جی ہاں، محض کوشش) اگلے دن بوتلیں الٹی پڑی تھیں۔ پتے نوچ دیے گئے تھے۔ یہ کارنامہ سنی اور ٹیپو کا تھا۔ بھابھی نیلی جینس کے ساتھ کسی اور پرنٹ کی شلوار پہن کر مطمئن سی بچوں کی شرارتیں انجوائے کرتیں۔ کام نمٹاتی جاتیں۔ امی برآمدے میں تخت پر بیٹھ کر ساگ یا پالک کاٹتیں یا موسمی پھل کاٹ کاٹ کر سب کو دیتی جاتیں۔ بھلے چھلکوں کا ڈھیر جمع ہوتا رہے۔ (ہونہہ، میں کڑھ کر رہ جاتی) اور خود چیزیں سمیٹنے میں ہلکان ہوتی رہتی۔ ایسے میں نسیم خالہ اور دیبا باجی کا گھر مجھے جنت لگتا۔ امی کی رشتے داری بھی تھی سو ان کے گھر جانے کی اجازت تھی۔

میں جب بھی جاتی، گھر صاف ستھرا ملتا۔ ٹھیک ہے کوئی بچہ نہ تھا مگر رہتے تو انسان ہی تھے نا۔

دیبا باجی یونیورسٹی جاتیں اور وليد بھائی جاب کرتے تھے۔ اکثر خیال آتا کاش دیبا باجی میری بھابھی ہوتیں۔ میں ہفتے میں ایک دو چکر روز لگاتی۔ ان لوگوں کا رویہ بھی حوصلہ افزا ہوتا۔

☆☆☆

ایک روز میں کھیر بنا کر لے گئی تھی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ میں جھجکتے ہوئے صحن میں ہی کھڑی رہی، جب ہی ولید بھائی کمرے سے نکلے۔

"امی تو گھر پر نہیں ہیں، تم آؤ — ہم سے گپ شپ کرو۔" وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اندر تک اترتی نظریں جن میں پاکیزگی نہیں تھی۔ "آؤ ناں!" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا، میں جو پہلے ہی ان کے بدلتے تیوروں سے ہراساں تھی انہیں دھکا دے کر بھاگ گئی۔

گھر آ کر بھی میری حالت نہ سنبھل سکی۔ بس بار بار رونا آ رہا تھا لیکن اس ڈر، خوف کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا۔

"ہوسکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔" میں خود کو مطمئن کرنا چاہتی مگر چھٹی حس ہر دلیل کو رد کر دیتی۔

میں نے از خود خالہ نسیم کے گھر جانا موقوف کر دیا۔ ان ہی دنوں امی نے بتایا دیبا باجی بیمار ہیں اور بار بار میرا پوچھتی ہیں۔ میں نے جانا ہی مناسب سمجھا اور اس وقت گئی جب ولید بھائی گھر پر نہ ہوں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے کان لگا کر باتیں سننا چاہیں (لڑکیوں کا ازلی تجسس) باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں، اپنا نام سنا تو قدم ٹھہر سے گئے۔

"بھاگ بھاگ کر ہانپنے آتی ہے، لگتا ہے ولید پر نظر ہے۔" یہ دیبا باجی تھیں (میرا آئیڈیل)۔

"امی! آپ بھی ناں، بہت پیار سے ملتی ہیں۔ خواہ مخواہ اگلے بندے کو خوش فہمی ہو جاتی ہے۔ آپ کے چند دور رشتے دار اس قابل ہیں کہ ان سے رشتہ جوڑیں؟" تکبر سے بھرپور لہجے نے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔

"ارے دس کام کر دیتی ہے، کپڑے سی دیتی ہے — اچار بنا دیتی ہے۔ اچھا ہے ناں، چھوٹے موٹے کاموں کے لیے یہ غریب رشتے دار ٹھیک رہتے ہیں۔"

یہ نسیم خالہ تھیں جو اپنی میٹھی زبان سے مجھ سے بیسیوں کام نکلوا لیتیں اور میں جو اپنے گھر کے ماحول سے اکتائی رہتی تھی، ان کی باتوں سے خوش ہو جاتی۔

"ولید کا معیار تو اتنا اونچا ہے کہ اس معمولی سانولی شکل کی لڑکی کو ملازمہ بھی نہ رکھے۔ ہونہہ — بے فکر رہو۔" مجھ میں مزید

سنبھلنے کا حوصلہ بھی نہ رہا۔ میں ان ہی قدموں لوٹ گئی۔

کیا یہ سچ ہے کہ بعض لوگ خاص حالات میں ہی پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں یا یہ ہماری کوتاہی ہوتی ہے جو ہم خود کو دھوکا دیتے ہیں؟

میں ٹوٹی پھوٹی حالت میں گھر واپس آئی۔ کیسے آئی یاد نہیں۔۔۔۔ اجلے سراپے والی دیبا باجی کے اندر اتنا تعفن ہوگا، یہ بات گمان سے بھی دور تھی۔ بس قدرت نے اتنا بھرم رکھا کہ کسی کو میری آمد کی خبر نہ ہو سکی تھی۔ میں آنسو بے دردی سے صاف کر رہی تھی، لیکن وہ پھر بھی امڈ امڈ کر آ رہے تھے۔ شاید یہ بے عزتی کا احساس تھا جو کم نہ ہو رہا تھا۔ میں گیٹ کھول کر اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔

حسب روایت صحن بکھرا ہوا تھا۔ گڑیا کی سائیکل، ریلوے کا بستہ، ٹیپو کے فیڈر، سنی کے کھلونے، بھابھی کا ایک بچن میں تھا اور ایک صحن میں۔ وہ واشنگ مشین کے ساتھ نبرد آزما تھیں، ساتھ ساتھ زبان چل رہی تھی۔

"بچو! اپنی چیزیں سمیٹ لو۔ پھوپھو جانی ناراض ہوں گی۔" میں خاموشی سے آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔

صاف ستھرا کمرا۔۔۔۔ ہر شے ترتیب سے رکھی تھی۔ سلیقے سے ٹنگے ملبوسات۔۔۔۔ ترتیب سے رکھے ریک میں جوتے۔۔۔۔ پورے گھر میں واحد میرا کمرا تھا جہاں سلیقہ اور ترتیب نظر آتی ورنہ پورا گھر اکھاڑہ لگتا۔ بھائی کے سلیپر جہاں پر ملتے، واکر اور کھلونے امی کے بیڈ روم سے۔۔۔۔ فیڈر ڈرائنگ روم میں سینٹرل ٹیبل پر سجا ہوتا۔

بھابھی ہنستے ہنستے چیزیں سمیٹتی جاتیں۔ میں چڑتی تو کہتیں۔

"ہنستے بستے گھروں میں کام بکھرتے ہیں اور مسکراتے ہوئے سمیٹ لیے جاتے ہیں۔"

"دیبا باجی کا گھر بھی تو ہے۔" میں فٹ سے حوالہ دیتی۔

"رہنے دو۔۔۔۔ ان کی صفائی اور دھلائیاں۔۔۔۔" امی قافیہ ملا کر بے زاری کا اظہار کرتیں۔ "ان کے گھر نہ کوئی جاتا ہے نہ آتا ہے سوائے تمہارے۔۔۔۔"

"زیادہ صفائیاں، تباہیاں لاتی ہیں۔" اسجد بھائی مجھے چڑاتے۔ میں ہڑبڑا کے خود کی بکھرا وا سمیٹنے لگتی۔

آج وہی بکھرا گھر۔۔۔۔ چیزیں پھیلاتے بچے۔۔۔۔ خود سے لاپروا بھابھی۔۔۔۔ مگر ہم سب کے لیے فکر مند۔ سارے ماحول میں تنا تانا تھا۔۔۔۔ جس کا ادراک مجھے آج ہوا تھا۔

☆☆☆

"ہانیہ! بیٹا کیا ہوا؟" بھائی نے لائٹ آن کی۔ وہ آفس سے آ کر پہلے مجھے دیکھتے پھر اپنے بچوں کو۔ میں جو تکیے میں منہ چھپا کر سوچوں میں الجھی ہوئی تھی، یک دم اٹھ بیٹھی۔

"یہ لو پانی۔۔۔۔ شربت پیو۔۔۔۔ توبہ گرمی نے سب کو پریشان کر دیا۔" بھابھی حسب روایت زور زور سے بولتی ہوئی اندر آئیں۔

جگ میں سے شربت انڈیل کر گلاس مجھے تھمایا۔

"مما ہمیں بھی۔۔۔۔" بچے شور مچاتے ہوئے اندر آ گئے۔

"کیا ہوا ہانیہ!" امی لرزتی کانپتی اندر آئیں۔

"بس سر میں درد تھا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"آ۔۔۔۔ میں دم کر دوں۔ اتنی پیاری ہے، نظر لگ جاتی ہے۔" وہ زیر لب دعا پڑھنے لگیں۔

"دادو شربت۔" ٹیپو نے مداخلت کی اور میرے بیڈ پر چڑھ گیا۔ صرف نیکر میں ملبوس ٹیپو۔۔۔۔ موٹے بھاری بدن کے ساتھ بندوق خان (چوکیدار) کا بیٹا زیادہ لگ رہا تھا۔ ہاتھ کی پشت سے ناک رگڑتا۔۔۔۔

بھابھی میری طبیعت سے واقف تھیں سو منع کرنے لگیں۔

"مت کرو۔۔۔۔ پھوپھو ناراض ہوں گی۔"

"کوئی نہیں ہوتیں ناراض۔" اس نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور شرارتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ نجانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے موٹے گپلو ٹیپو کو سینے سے لگا لیا اور بہت سے آنسو اس کے گھنے بالوں میں چھپ گئے۔

آج مجھے اندازہ ہوا کہ صفائی پسندی کا تعلق محض گھر کی صفائی ستھرائی سے نہیں ہوتا۔ ایک صفائی نظروں کی ہوتی ہے۔ جیسے ولید بھائی۔۔۔۔ جن کی نگاہوں میں ہر عورت کے لیے غلاظت ہوتی۔

سوچ کی بھی صفائی ضروری ہے، جیسے دیبا باجی اور نسیم خالہ۔۔۔۔ جو بدگمانی اور غرور کا شکار تھیں۔

اور دل و دماغ کی صفائی۔۔۔۔ جس کی مجھے ضرورت تھی۔ جب شکووں، گلوں کی گرد ہٹی تو معلوم ہوا کہ بھابھی کے بظاہر لاپروا رویے میں ہم سب کے لیے کتنی محبت اور شفافیت تھی۔

مجھے سمجھ میں آ چکا تھا کہ گھر صاف ہو جاتے ہیں۔ تمام چیزیں اپنی جگہ پر آ جاتی ہیں، پھیلاوے سمٹ جاتے ہیں بس دل اور نظر کو صاف ہونا چاہیے۔ ☆☆

نظیر فاطمہ

نازک آبگینے

دن اپنا سفر تمام کر کے شام سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو رہا تھا۔ سڑک پر آتے جاتے لوگوں، گاڑیوں اور بسوں کا رش تھا۔ ہر کوئی جلدی میں تھا۔ ہر کسی کو اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس عمارت کی پانچویں منزل پر اپنے آفس میں بیٹھی وہ سب سے بے خبر، بڑے انہماک سے اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھی۔ کافی کا خالی کپ اس کے دائیں جانب میز پر رکھا تھا۔ دفعتاً کوئی دروازہ کھول کے اندر آیا۔ اس نے نظر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ آنے والا بغیر پوچھے کرسی گھسیٹ کے میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"میں نے آپ سے ایک سوال کیا تھا۔"

"میں اس کا جواب دے چکی ہوں۔"

"میں اس جواب کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں وجہ بتانے کی پابند نہیں ہوں۔"

"اگر میں کہوں کہ وہ کوئی بھی وجہ ہو مجھے فرق نہیں پڑتا تو؟"

"اچھا۔" نظر یہ انداز اختیار کیا گیا۔

"آزما لیں۔" اُدھر چیلنج کر دیا گیا۔

"آپ ایک بدکردار لڑکی سے رشتہ جوڑنا یقیناً ناپسند کریں گے۔"

"بدکردار بھی اپنے آپ کو اپنے منہ سے بدکردار نہیں کہتا۔"

"مگر سب نے اس کو بدکردار سمجھا ہوا تھا کہ اس کے خاندان نے بھی تو؟"

"سمجھے جانے اور ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"آپ کچھ نہیں جانتے تو بحث بھی مت کریں۔" وہ لاجواب ہوئی تو جھنجلا گئی۔

"میں جاننا بھی نہیں چاہتا میرا اور آپ کا پورے دو سال کا ساتھ ہے اس آفس میں اور دو سال کسی کو پرکھنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ سمجھ لیں میں سب جانتا ہوں۔"

"میں اب کسی پر اعتماد نہیں کر سکتی۔"

"کر لیں، فائدے میں رہیں گی۔"

"آپ جائیں پلیز۔"

"ابھی جا رہا ہوں مگر جب تک آپ کے راستے میں آتا رہوں گا جب تک آپ ہاں نہیں کرتیں۔ وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا اور اس نے کہنیاں میز پر ٹکا کر ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ باہر کھڑکی سے اترتی شام نے ایک نظر اس اُلجھی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔

☆☆☆

شاندانہ گھر میں داخل ہوئی تو بریانی کی اشتہا انگیز اور مزے دار سی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ اسے پہلے ہی بہت بھوک لگ رہی تھی اب اور بڑھ

گئی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے برآمدے میں چلی آئی۔

"اماں پلیز کھانا..... بہت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ کندھوں سے بیگ اتار کر برآمدے میں پڑے تخت پر ڈھیر ہوگئی اور دوپٹا سر سے اُتار کر گود میں رکھ لیا۔

"جاؤ پہلے ہاتھ منہ دھو کے آؤ میں کھانا لاتی ہوں۔"

وہ منہ دھو کر آئی تو اماں ٹرے میں بریانی کی پلیٹ، رائتے اور سلاد تخت پر رکھ چکی تھیں۔ شاندانہ نے ڈٹ کے کھانا کھایا۔ اس کی ماں کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا اور ان کے رشتہ داروں کے علاوہ ان کے ہمسائے بھی اکثر اماں کے ہاتھ کے کھانے سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔

اماں نے آج بھی اپنے مخصوص فن میں بریانی رکھی ہوئی تھی۔ شاندانہ خالی برتن کچن میں رکھنے گئی تو سامنے پڑا فن دیکھ کر مسکرائی۔

"آج محلے میں کس کی قسمت جاگنے والی ہے پیاری اماں۔" شاندانہ نے شرارت سے پوچھا۔

"یہ سامنے والی نادیہ کے ہاں بھجواؤں گی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں خوش ہو کر کھالیں گے۔ ابھی قیوم آتا ہے تو بھجواتی ہوں۔" لتاں نے نارمل لہجے میں جواب دیا۔

"آپ نے بھی نا پورے محلے میں باریاں لگا رکھی ہیں۔ آج فلاں کے گھر کل فلاں کے گھر اور پرسوں فلاں کے بھی گھر۔" شاندانہ اماں کے عادت سے واقف تھی۔ سو انھیں گلے میں بازو حمائل کر کے چھیڑا۔

"چل ہٹ کتنی بار کہا ہے کہ ہمسایوں کا بھی حق ہوتا ہے کھانے میں اپنی حیثیت کے مطابق یہ حق ادا کرتی ہوں تو کیا برا ہے۔" اماں نے اس کے بازو ہٹائے تو وہ منہ بسور کر رہ گئی۔

☆☆☆

عارفہ بیگم اور مقدم صاحب کے چار بچے تھے۔ ایک بیٹی اور تین بیٹے۔ دو بیٹوں جلال اور طارق کے بعد شاندانہ اور اس سے چھوٹا ایک بھائی عبدالقیوم۔ بڑے دو بیٹے پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔ دونوں شادی شدہ اور بچوں والے تھے جو اسی گھر کے دوسرے پورشن میں رہائش پذیر تھے۔ ایک کی ایک بیٹی تھی اور دوسرے کا ایک بیٹا۔ شاندانہ کے ایم۔ بی۔ اے کا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔ مقدم صاحب بھی اچھی نوکری پر تھے۔ گھر میں خوشحالی تھی اور عارفہ بیگم اپنی اس خوش حالی میں اپنے رشتہ داروں اور محلے داروں کو شریک رکھتی تھیں۔

زندگی کے اکثر معاملات میں عارفہ کی سوچ بڑی روایتی سی تھی کہ جیسے بیٹی کو زیادہ پڑھانے کی قائل نہ تھیں۔ ان کے نزدیک بیٹی کی جلد سے جلد شادی بہت ضروری تھی۔ جوان بیٹی کی عزت کانچ کا پیالہ ہوتا ہے کہ ذرا دھکا لگا اور وہ چکنا چور۔ وہ تو شاندانہ کے بی ایس آنرز کے بھی خلاف تھیں مگر مقدم صاحب کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور اب شاندانہ ایم۔ بی۔ اے کر رہی تھی۔ وہ لڑکیوں کے بے جا گھر سے بھی نکلنے کی بھی قائل نہ تھیں۔ وہ اُسے محلے میں بھی کہیں اکیلے نہیں جانے دیتی تھیں۔ شاندانہ کو بھی صرف یونیورسٹی اکیلے جانے کی اجازت تھی وہ بھی یونیورسٹی کی بس میں۔ سو جب بھی کسی کے گھر کوئی چیز بھجوانی ہوتی تو خود جاتیں یا اپنے بیٹوں کو بھیجتیں۔ بڑے بیٹے تو اب اس ڈیوٹی سے فارغ ہو گئے تھے اس لیے چھوٹا قیوم اب یہ ذمہ داری نبھا رہا تھا۔

شاندانہ بھابھیوں کی بھی لاڈلی تھی مگر اس نے کبھی ان لاڈوں کا غلط فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ جب کبھی اس کے بھائی اسے زیادہ اہمیت دیتے تو بھابھیوں کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے مگر ان کے ہونٹوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ ہوتی اور دل۔ دل زہر سے بھی زیادہ کڑواہٹ سے بھر جاتے۔ دونوں اس کے خلاف کچھ بھی کہہ کر اپنی حیثیت کم نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ پھر وہ دونوں الگ تھلگ تھیں۔ ساس سسر ان کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔ تو وہ کیوں اس چھوٹی سے بات کو بنیاد بنا کر اپنے گھر کا سکون خراب کرتیں۔ اس کی شادی ہونے تک اس کو برداشت کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سو وہ کر رہی تھیں برداشت شاندانہ کو، دل میں بغض رکھ کر منافقت کی چال چل کر۔

☆☆☆

"اماں! رضیہ کے گھر جانا ہے مجھے۔" شاندانہ نے شام کو عارفہ سے کہا۔

"کیوں؟"

"اماں! دو کرتے سلوانے ہیں میں نے ان کا ڈیزائن سمجھانا ہے۔" شاندانہ کے ہاتھ میں کچھ روز قبل اماں کا لایا ہوا کپڑا تھا۔

"اچھا ٹھہرو۔ میں سالن بنالوں پھر چلتے ہیں۔"
"اماں یہ دو گھر چھوڑ کے جانا ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔"
ہاں تو تھوڑا صبر کر، لے چلتی ہوں ابھی۔"
شاندانہ منہ بسور کر بیٹھ گئی۔ جانتی تھی لتاں اسے اکیلے ہرگز نہیں جانے دیں گی۔
"بھابھی کو لے جاؤں؟" جب پندرہ بیس منٹ تک اماں فارغ نہ ہوئیں تو شاندانہ نے پوچھا۔
"چھری کے نیچے دم لے لڑکی، کہا ہے نا ابھی چلتے ہیں۔ بھابھیاں گھر نہیں ہیں تیری، شاپنگ پر گئی ہیں۔" لتاں نے ناگواری سے گھرکا تو وہ سخت بدمزا ہوئی مگر خاموش رہی۔ بولتی تو لتاں نے اور غصے میں آجانا تھا۔
"لتاں بھی نا حد کرتی ہیں۔ میں بھلا کوئی چھوٹی بچی ہوں جسے کوئی اغوا کر لے گا۔ ایک وہ منال ہے ہر جگہ اکیلے آتی جاتی ہے۔ گاڑی تک ڈرائیو کر لیتی ہے۔ ایک میں ہوں جو اپنے محلے میں اکیلی آ جا نہیں سکتی۔" وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگی۔ منال شاندانہ کی اسکول کی دوست تھی جواب یونیورسٹی میں بھی اس کے ساتھ تھی۔
"ہاں یاد آیا شاندانہ، تمہاری پھوپھو نے تمہارے لیے گرمیوں کے سوٹ بھجوائے ہیں۔ ٹی۔ سی۔ ایس والا دے گیا تھا صبح۔ تم وہ بھی دیکھ لو ان میں سے کوئی سلوانا ہے تو وہ بھی لے لو۔" عارفہ بیگم نے شاندانہ کو مخاطب کیا۔
"او، پھوپھو دی گریٹ۔" وہ پرجوش ہو کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔
اس کی پھوپھو نے اپنے بھائی بھاوج کو عندیہ دے رکھا تھا وہ شاندانہ کو اپنے بیٹے وقار سے بیاہیں گی۔ عارفہ اور مقدم کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شاندانہ اس بات سے باخبر تھی اور اسے اپنے ماں باپ کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ پھوپھو ابھی سے اس کے بہت لاڈ اٹھاتی تھیں۔ اکثر اس کے لیے کپڑے اور دیگر سامان بھجواتی رہتی تھیں۔ ویسے بھی شاندانہ من موجی سادہ سی خوش رہنے والی لڑکی تھی جس کی خواہشات گھر کے آنگن میں لگے درختوں کی طرح بس دو تین ہی تھیں۔ پریشان تو وہ لوگ رہتے ہیں جن کے اندر خواہشات کے گھنے جنگل اُگے ہوئے ہوں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی خوشیاں تراشنے والی لڑکی تھی۔ جس کے چہرے پر پررونق اور تازگی رہتی تھی۔

☆☆☆

شاندانہ یونیورسٹی بس سے اتر کر اپنی گلی میں داخل ہوتی تو گلی میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ ان کے ساتھ والے گھر میں کرائے دار آئے تھے۔ یہ گھر اس کے چچا سلمان کا تھا جو یہاں رہتے تھے۔ اب ان کے بیٹے نے کسی اچھی سوسائٹی میں گھر لیا تھا تو وہ سب وہیں شفٹ کر گئے تھے اور یہ گھر بیچنے کے بجائے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ کرائے داروں کا سامان وغیرہ رکھا جا رہا تھا۔ گلی میں ان کا سامان ادھر اُدھر یوں رکھا کہ راستہ تقریباً بند تھا۔ وہ بچتے بچاتے، چیزوں کو پھلانگ کر گھر آ گئی تھی۔
صبح وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتا کرنے آئی تو اماں نے الگ سے تھرماس میں چائے اور آلو والے پراٹھے قیوم کے ہاتھ ساتھ والوں کے گھر میں بھجوائے۔
"اماں کیا ضرورت ہے نہ جانے کیسے لوگ ہیں؟ کون ہیں؟ اور آپ کی میزبانیاں شروع ہو گئی ہیں۔" شاندانہ چڑ گئی۔
"بس ہو جاؤ شروع، تم سے مشورہ نہیں مانگا میں نے۔ آرام سے ناشتا کرو۔" عارفہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ منہ بسور کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

شاندانہ اپنی بھتیجی کو کمر پر ٹکائے اپنے پورشن

میں آئی تو اماں کے پاس ایک اجنبی عورت کو بیٹھے دیکھ کر دروازے میں ہی رک گئی۔ وہ ابھی پلٹنا چاہ رہی تھی کہ اس خاتون کی اس پر نظر پڑی۔

"ارے آجاؤ بیٹا! رک کیوں گئی؟" وہ ناچار اندر داخل ہوئی اور سلام کیا۔

"یہ میری بیٹی ہے شاندانہ!" عارفہ نے تعارف کروایا۔

"ماشاءاللہ بہت پیاری بچی ہے۔ دیکھو تو مہینہ ہوگیا ہے ہمیں آپ کا پڑوسی بنے مگر اس بچی کو تو میں آج دیکھ رہی ہوں۔" ان کی باتوں سے شاندانہ کو اندازہ ہوگیا کہ یہ ان کی نئی ہمسائی زرینہ خاتون ہیں۔ شاندانہ نے بھی اس کو پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر شاندانہ کو عجیب سی کوفت ہوئی۔ وہ خاتون اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے آنکھوں میں ایکسرے مشین فٹ ہو۔ ان کی نظریں سارے گھر میں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں اور بات کرنے کا انداز بھی خوشامدی سا تھا۔ وضع دار سی عارفہ بیگم اس کی زیادہ تر باتوں پر مسکرا رہی تھیں۔

عارفہ بیگم ایک دو ملاقاتوں میں ہی زرینہ کی عجیب طبیعت سے خائف ہوگئی تھیں۔ وہ خود بھی ان کی طرف جانے سے حتی الامکان گریز کرنے کا ارادہ کر چکی تھیں مگر زرینہ خود ہر دوسرے دن ان سے ملنے کے بہانے آدھمکتیں اور پھر سارے محلے کی رپورٹ سنانا شروع کر دیتیں۔

"بس زرینہ بہن! ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہے کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔" عارفہ بیگم ان کی بات کاٹ کر نرمی سے کہتیں۔

"ہاں اب آپ کا گھر بھی تو ہے نا، دیکھیں کتنا سلوک ہے آپ کا آپ کی بہوؤں کے ساتھ۔" وہ ان کی تعریفوں میں قلابے ملانے لگتیں۔ عارفہ بیگم کو انھیں برداشت کرنا بھی مشکل ہونے لگا اور انھیں اپنے ہاں نہ آنے کا بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔

زرینہ کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ ایک بیٹا سب سے بڑا تھا۔ پھر دو بیٹیاں اور پھر دو بیٹے۔ بیٹیاں اور دونوں چھوٹے بیٹے تو اکثر آتے جاتے نظر آتے تھے۔ بقول زرینہ کے ان کا بڑا بیٹا عاطف جاب کرتا تھا۔ اس لڑکے کو کم ہی کسی نے دیکھا تھا۔ بیٹیاں اور چھوٹے بیٹے پڑھتے تھے۔

☆☆☆

نماز فجر کے بعد روشنی پھیل رہی تھی۔ چند پرندا دانے دنکے کی تلاش میں گھونسلوں سے نکل چکے تھے۔ شاندانہ نماز اور تلاوت قرآن کے بعد پرندوں کو دانہ ڈالنے چھت پر آئی۔ اس نے مٹی کی کٹوریوں میں دانہ ڈالا۔ پیڑوں اور منڈیروں پر بیٹھے پرندے جھٹ سے اُڑ کر آئے اور دانہ چگنے میں مصروف ہوگئے۔ شاندانہ نے پانی کا کٹورا بھر کر رکھا اور کافی دیر وہیں بیٹھ کر پرندوں کو دیکھتی رہی۔ پھر سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئی۔ یک دم کچھ خیال آنے پر وہ بڑے بھائی جلال کے پورشن کی طرف مڑ گئی۔ شاندانہ کا بڑا بھائی جلال اور اس کی بھابھی ناشتے کے بعد چائے پی رہے تھے۔

"بھائی سردیاں آرہی ہیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے میری پسند کے کپڑے دلوائیں گے۔" شاندانہ نے لاڈ سے فرمائش کی۔ اس کے انداز پر بھائی تو دل سے مسکرا دیا مگر بھابھی نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر اپنی ناگواری کو اپنے اندر اتارا۔

"شاندانہ چائے پیو گی؟" بھابھی لبوں پر منافقانہ مسکراہٹ سجا کر پوچھنے لگیں۔

"ضرور بھابھی۔ چائے بھی پیوں گی اور آپ کے ہاتھ کا بنا ناشتا بھی کروں گی۔" بھابھی فوراً اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔

"ہنہ پتا نہیں کتنی لالچی طبیعت ہے اس کی ہر

یہاں ہی دفن ہیں۔" وہ چائے کا کپ بڑا
رہی تھیں۔ بہن کی بھائی سے معصوم فرمائش میں
انہیں لالچ نہ جانے کہاں سے نظر آرہا تھا۔
اگلے دن اس کی دونوں بھابھیاں اکٹھے بیٹھ
کر اپنی نند کے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔
"تم کیا سمجھ رہی ہو کہ ہمیں چھوڑ دیا اس
نے۔" شاندانہ کے چھوٹے بھائی طارق کی بیوی
نے طنزیہ کہا۔
"بیگ اور جوتوں کی فرمائش ڈالی گئی ہے،
ہماری طرف۔"
دونوں بہت تنگ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔
پتا نہیں بعض اوقات ہم انسان اتنے کم ظرف کیوں
ہو جاتے ہیں۔ وہ بیاہ کر یہاں آئی تھیں انہیں پوری
عزت اور مرتبہ ملا۔ مگر بدلے میں وہ ان گھر والوں
کو خلوص تک نہ دے سکی تھیں۔ منافقت سے لبریز
رشتے نبھا رہی تھیں۔

☆☆☆

"شاندانہ بیٹا! چلو مارکیٹ چلتے ہیں تمہیں
اپنا جو سامان لینا ہے وہ بھی لے لینا۔" عارفہ بیگم
نے چادر اوڑھ کر شاندانہ کو آواز دی۔
"جی امی! میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" شاندانہ
جلدی سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔
دونوں ماں بیٹی گیٹ سے باہر نکل کر زرینہ
کے دروازے کے سامنے پہنچی ہی تھیں کہ زرینہ
دروازہ کھول کے باہر نکلیں۔ ان کے پیچھے ان کا بڑا
بیٹا عاطف تھا۔ زرینہ انہیں دیکھ کر حسب عادت
شروع ہو چکی تھیں۔
"ارے تم دونوں کہاں جا رہی ہو؟"
"ذرا مارکیٹ تک جا رہے ہیں۔"
"آؤ نا، اندر آؤ، کوئی چائے پانی۔" زرینہ
نے مصنوعی محبت سے کہا جبکہ ان کا بیٹا اپنی سرخ

ارے نہیں، پہلے ہی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔
پھر کبھی سہی۔ چلو شاندانہ!" عارفہ نے زرینہ کی
بات کا جواب دے کر شاندانہ کا بازو پکڑا اور آگے
بڑھ گئیں۔
"تو کیا یہاں جم گیا ہے، دفع ہو رہے۔"
زرینہ نے عاطف کو دروازے میں جما دیکھ کر غصے
سے کہا۔ پھر بھی اس کی نظریں ابھی تک گلی کے نکڑ پر
تھیں جہاں سے شاندانہ اور عارفہ گئی تھیں۔ اس
نے اس مداخلت پر ماں کو اپنی سرخ آنکھوں سے
گھورا اور پلٹ کر اندر چلا گیا۔
"زرینہ کا بیٹا کیسا عجیب سا تھا۔ آنکھیں کتنی
سرخ سی تھیں اس کی اور کیسے گھور کے دیکھ رہا تھا
ہمیں۔" عارفہ بیگم نے شاندانہ سے کہا۔
"واقعی اماں! عجیب خبطی سا لگ رہا تھا۔"
دونوں ماں بیٹی باتیں کرتے کرتے مارکیٹ پہنچ
گئیں اور اپنا مطلوبہ سامان لے کر واپسی کی راہ
اختیار کی۔ دونوں سامان اُٹھائے اپنی گلی میں داخل
ہوئیں تو زرینہ کا بیٹا عاطف گلی میں ہی کھڑا تھا۔
"لائیے آنٹی، میں سامان لے جاتا ہوں۔"
وہ یوں آگے بڑھا کہ دونوں کا راستہ رک گیا۔
"نہیں بیٹا رہنے دو۔" عارفہ بیگم کو ناگواری سی
محسوس ہوئی پھر بھی خود کو کنٹرول کر کے اسے منع کیا
۔مگر عاطف نے زبردستی ان سے سامان لیا اور ان کے
گھر پہنچا کر لوٹ گیا۔ دروازے سے باہر نکلتے وقت
اس نے شاندانہ کی طرف عجیب سے نظروں سے دیکھا
کہ شاندانہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
"کیا چیز ہے یہ؟" وہ سر جھٹک کے رہ گئی۔

☆☆☆

"امی! میری شادی کروا دو۔" عاطف نے
زرینہ سے کہا۔
"بڑا وزیر لگ گیا ہے تو جو تیری شادی کروا

دوں۔" زرینہ نے طنز سے کہا۔
"شادی کروادو پھر جو کہو گی کروں گا۔" اس کے منت کرنے پر زرینہ جی بھر کر حیران ہوئیں۔
"ارے، مجھ جیسے گھٹیا شرابی کو کون دے گا اپنی بیٹی؟" زرینہ نے بیٹے کے کرتوت ذہن میں رکھ کر کہا۔
"اماں! اب ایسی بھی بات نہیں ہے، کئی لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر۔"
"ہونہہ!" زرینہ نے سر جھٹکا۔
"اگر میں لڑکی پسند کرلوں اور لڑکی بھی راضی ہوجائے تو پھر۔" عاطف نے پوچھا۔
"دیکھیں گے پھر۔" زرینہ نے جان چھڑوائی اور عاطف سپنوں کی حسین وادیوں میں پہنچ گیا۔

☆☆☆

"اماں! آج میں تھوڑا لیٹ ہو جاؤں گی۔ فائنل اسائنمنٹ جمع کروانی ہے۔" شاندانہ بیگ اور سامان سنبھالے کھانے کی میز تک آئی۔ ایک کرسی پر اپنا سامان رکھا اور دوسری پر خود بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔
"اماں دعا کرنا کے میرے پیپر اچھے اچھے ہو جائیں۔" مہینے بعد ہونے والے پیپر ابھی سے اس کے حواسوں پر سوار ہونے لگ گئے تھے۔ اچھی خاصی ذہین اور محنتی ہونے کے باوجود وہ امتحانات کی بہت ٹینشن لیتی تھی۔
"اچھے ہو جائیں گے، اب جان نہ دینے لگ جانا۔" عارفہ بیگم نے فکرمندی سے کہا۔ وہ اس کے امتحانات کے خوف سے واقف تھیں۔
شاندانہ اپنے گھر سے نکلی تو عاطف اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔ شاندانہ اپنے دھیان میں آگے بڑھ گئی۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آرہا ہے۔ اس نے یک دم مڑ کر دیکھا تو عاطف اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ وہ رک گیا۔ اس نے شاندانہ پر ایک گہری نظر ڈالی اور آگے نکل گیا۔
"اُف توبہ! میں بھی نا، مجھے لگا کہ پیچھے آرہا ہے مگر وہ تو اپنے کسی کام سے جارہا ہے۔" شاندانہ نے گہری سانس بھر کر سر جھٹکا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ اسٹاپ پر پہنچی تو دور سے یونیورسٹی کی بس آتی دکھائی دی۔ بس قریب آئی تو وہ فوراً اس میں سوار ہوگئی اس بات سے بالکل بے خبر کہ عاطف کی سرخ آنکھوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔
یونیورسٹی سے واپسی پر شاندانہ اپنے اسٹاپ پر اتری تو عاطف پہلے سے وہاں موجود تھا۔ شاندانہ کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ شاندانہ تیزی سے چلنے لگی اور اپنے گھر داخل ہو کر دروازہ بند کرلیا۔
چند دن یہی روٹین رہی وہ گھر سے نکلتی تو اپنے دروازے میں کھڑا ہوتا پھر اس کے پیچھے پیچھے اسٹاپ تک جاتا اور واپسی پر وہیں موجود ہوتا اور اسے گھر تک چھوڑتا۔ سارا راستہ وہ سر جھکا رکھتا۔ جب شاندانہ بس سے اترتی یا چڑھتی اپنے گھر سے نکلتی یا داخل ہوتی تو وہ اپنی سرد آنکھیں اس پر جما دیتا۔ شاندانہ عجیب کشمکش کا شکار تھی کہ اس کے بارے میں اماں سے بات کرے نہ کرے۔

☆☆☆

"کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے؟" عارفہ بیگم نے پوچھا۔
"نہیں اماں بس پیپرز کی ٹینشن ہے۔" شاندانہ مسکرائی۔
"نظر انداز ہی کرتی ہوں اسے کچھ کہا نہیں ہے نا۔" شاندانہ نے سوچوں کو جھٹک کر

درمیان پڑھائی کی طرف لگا دیا۔
شاندانہ نہیں جانتی تھی کہ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں جو بات اس کے نزدیک ذرا اہمیت کی حامل نہ تھی وہ کیا رخ اختیار کر جائے گی، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ شاندانہ حسب معمول یونیورسٹی جانے کے لیے نکلی تو عاطف اپنے دروازے میں کھڑا تھا۔ آج اس نے اپنے معمول سے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔ شاندانہ اس اچانک صورت حال کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ گھبرا گئی اور غیر ارادی طور پر اپنے اردگرد دیکھنے لگی۔ شکر تھا کہ گلی میں اس وقت ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"کیا بات ہے؟ ہٹیں سامنے سے۔" شاندانہ نے لہجوں میں خود پر قابو پا کر سخت لہجہ اپنایا۔

"آپ کے راستے سے ہٹنا نہیں چاہتا اب میرا ہر راستہ آپ تک آتا ہے۔" عاطف نے یوں ہی کھڑے کھڑے کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہیں؟ راستہ چھوڑیں میرا۔" شاندانہ ہلکی آواز میں غرائی۔

"اب تو مر کر ہی جان چھوڑوں گا، دل آ گیا ہے آپ پر، شادی کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔" وہ دایاں ہاتھ سینے پہ رکھ کر تھوڑا سا جھکا۔ شاندانہ کے تن بدن میں تو جیسے آگ سے لگ گئی۔

"جاؤ، رستہ ناپو اپنا، آیا بڑا مجنوں میاں۔" شاندانہ سارے ادب و آداب بھلا کر اسے جلی کٹی سنا کر سائیڈ سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ شاندانہ کی بڑی بھابھی نے چھت پر کھڑے ہو کر سارا منظر دیکھا تھا۔ ان کی آوازیں تو ان تک نہ پہنچ سکی تھیں۔ شاندانہ کی ان کی طرف پشت تھی مگر عاطف کے چہرے کے رنگ انہوں نے بڑے غور سے دیکھے اور معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

کالج پہنچ کر بھی شاندانہ گم صم سی رہی۔ اس کے ساتھ یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کہاں کھوئی ہو؟" منال نے شاندانہ کے سامنے زور سے چٹکی بجائی تو وہ چونک کر کھڑی ہوئی اور دھیرے سے اسے آج کا سارا واقعہ سنایا۔

"او، دفع کرو۔ ایسے لوگوں کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں اگنور کرو اسے۔" منال نے اسے تسلی دی تو وہ سر ہلا کر وہ گئی۔

☆☆☆

شام کو اچانک بادل آئے اور تیز ہوا چلنے لگی۔ بادل اتنے گہرے ہو گئے کہ دن میں رات کا گمان ہونے لگا۔ بارش اب ہوئی کہ تب۔ کمرے میں امتحانات کی تیاری میں مصروف شاندانہ کو بدلتے موسم کی چنداں خبر نہ ہوئی۔

"شاندانہ بیٹا! دیکھنا ذرا نیلہ کپڑے دھو کر ڈال گئی ہے۔ بارش ہونے لگی ہے۔ تم جلدی سے جا کر کپڑے سمیٹ کر اوپر کمرے میں رکھ دو۔" عارفہ بیگم نے کچن سے آواز لگائی تو شاندانہ نے چونکی۔

"جی امی۔" شاندانہ کتابیں چھوڑ کر چپلیں پاؤں میں اڑسیں اور دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سارے کپڑے سمیٹ کر اس نے ایک چادر میں باندھے اور گٹھری اٹھا کر کمرے میں رکھ آئی۔ تھوڑی دیر چھت پر ٹہل کر خوش گوار موسم کا مزا لینے لگی۔ معاً اس کے قریب ایک پتھر آ کر گرا، اس نے پتھر کو دیکھا اور اس کی سمت کا تعین کرنے کے لیے گردن اٹھائی تو عاطف اپنی چھت پر کھڑا نہ جانے کب سے اسے تاڑ رہا تھا۔ شاندانہ نے لب بھینچے اور نیچے جانے کے لیے مڑی اور اپنے پیچھے چھوٹی بھابھی کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر نیچے اتر گئی۔ چھوٹی بھابھی آگے بڑھیں تو عاطف بھی غائب ہو گیا۔

"ہوں تو بڑی بھابھی جو کہہ رہی تھیں وہ سچ ہی تھا۔" وہ پرسوچ انداز میں سیڑھیوں کو دیکھنے لگیں جہاں سے ابھی ابھی شاندانہ نیچے گئی تھی۔

"ہمیں کیا؟ جب کوئی چاند چڑھے گا تو سب دیکھیں گے۔" چھوٹی بھابھی نے طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بے رحمی سے سوچا۔

☆☆☆

شاندانہ کے پیپر شروع ہو چکے تھے اور وہ سب کچھ بھلا کر پیپر دینے میں مصروف تھی۔ عاطف کی وہ ہی روٹین تھی شاندانہ کے پیچھے آنے جانے والی۔ آج شاندانہ کا آخری پیپر تھا اور وہ بہت خوش تھی۔

"آج پیپر دے کر آؤں گی تو خوب لمبی تان کر سوؤں گی۔" شاندانہ نے جلدی جلدی ناشتا کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ناشتا آرام سے کرو، پھندنا لگوا لینا۔" عارفہ بیگم نے اس کے چمکتے چہرے کو محبت سے دیکھا۔ شاندانہ چیزیں اور بیگ سنبھال کر گھر سے نکلی تو عاطف حسب معمول وہاں کھڑا تھا۔ وہ گلی کا نکڑ مڑی تو وہ یک دم اس کے سامنے آ گیا اور اس کی طرف ایک پرچا بڑھایا۔ شاندانہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"یہ کیا ہے؟"

"پڑھ لینا اور اس کا جواب ضرور دینا، میری محبتوں اور بے تابیوں کے قصے ہیں اس میں۔" وہ لوفرانہ انداز میں کہنے لگا۔

شاندانہ نے چیل کی طرح جھپٹ کر وہ پرچا اس سے پکڑا اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے منہ پر دے مارا۔

"یہ ہے جواب تمہارے گھٹیا پن کا۔ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ چنگھاڑی۔

"میری محبت کو ٹھکرا رہی ہو تم؟"

"کون سی محبت میں تو تمہیں نفرت کے قابل بھی نہ سمجھوں۔"

"تم اچھا نہیں کر رہی میری محبت کو ٹھکرا کر ورنہ!"

"ورنہ کیا؟" شاندانہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔" عاطف نے دھمکی دی۔

"تو شوق سے کرو خودکشی تم، کس نے روکا ہے، خس کم جہاں پاک۔" شاندانہ نے ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی اور وہ فریز سا وہیں کھڑا رہ گیا۔

پچھلے پیپروں کی طرح شاندانہ کا یہ پیپر بھی بہت اچھا ہو گیا تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔

"چلو چل کر پہلے کچھ پیٹ پوجا کریں۔ ٹینشن میں صبح ٹھیک طرح سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا تھا۔" منابل نے ریلیکس سے انداز میں کہا۔ دونوں کا رخ کینٹین کی طرف تھا۔ کھا پی کر وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئیں۔

شاندانہ اپنے اسٹاپ پر پہنچ کر بس سے اتری تو بس اسٹاپ پر عاطف کو نہ پا کر اطمینان کا سانس لیا۔

"لگتا ہے صبح کی کلاس کا اثر ہوا ہے۔" وہ سوچ کر مسکرائی اور پیدل گھر کی طرف چلنے لگی۔

جوں ہی وہ اپنی گلی کا نکڑ مڑی تو گلی میں لوگ ہی لوگ تھے۔ زرینہ کے گھر کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ غیر ارادی طور پر ان کے گھر کا دروازہ پار کر گئی ان کا صحن عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور سامنے عاطف کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ شاندانہ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر خود کو چیخنے سے روکا۔

جیسے ہی زرینہ کی نظر اس پر پڑی وہ چیل کی

طرح اس پر جھپٹیں۔

''ارے یہ حرافہ ہے، میرے بیٹے کی موت کا سبب، پہلے اس نے میرے بیٹے کو اپنے جال میں پھنسایا اور پھر راستہ بدل لیا۔ میرے بچے نے بددل ہو کر دنیا سے منہ موڑ لیا۔'' وہ شاندانہ کو باقاعدہ پیٹنے لگیں۔ عارفہ بیگم وہاں پہنچیں تو بھاگ کر شاندانہ کی ڈھال بنیں۔

''معاف کرو بہن لگتا ہے صدمے نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' ساتھ والی ہمسائی جو سالوں سے ساتھ رہ رہی تھی اور شاندانہ سے اچھی طرح واقف تھی اس نے دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر زرینہ کو قابو کیا۔

''ارے میں کیا کروں۔ یہ دیکھو میرے بیٹے کی آخری تحریر..... کوئی مرتے ہوئے بھی جھوٹ بولتا ہے بھلا۔'' زرینہ نے اپنے دوپٹے کے پلو سے وہ خط نکالا جو مردہ عاطف کے سینے پر پڑا ہوا ملا تھا۔

''یہ دیکھو، اس خط میں اس نے سب کچھ لکھا ہے۔'' خط ایک کے بعد ایک عورت کے پاس پہنچا سب پڑھ کر منہ پر حیرت سے ہاتھ رکھ لیتیں۔ آخر میں وہ خط عارفہ بیگم تک پہنچا جو ان کے ساتھ ساتھ شاندانہ نے بھی پڑھا۔

''میں عاطف شاندانہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میں روز اس کے پیچھے جاتا تھا۔ اس نے کبھی مجھے منع نہیں کیا اور نہ کسی کو بتایا تو یہ بھی تو محبت ہی ہوئی نا۔ جب میں نے اسے شادی کے لیے کہا تو اس نے مجھے دھتکار دیا۔ اس لیے میں اس کے بدلنے کی وجہ سے خودکشی کر رہا ہوں۔ شاندانہ میری قاتل ہے۔ میری محبت کی قاتل ہے۔'' عارفہ بیگم نے وہ خط پڑھا تو خط مٹھی میں دبائے گنگ کھڑی شاندانہ کو گھسیٹتے ہوئے گھر لے آئیں۔ ہر طرف عاطف کی خودکشی کا شور مچ گیا تھا۔

☆☆☆

''کم ظرف، تجھے یہ تربیت دی تھی میں نے کہ تو ہمارے سروں میں خاک ڈال دے۔ کہاں کمی رہ گئی تھی ہماری محبت میں جو تو اِدھر اُدھر منہ مارنے چل نکلی۔'' شاندانہ کا سارا خاندان اس کے اردگرد کھڑا تھا مگر اس کی ڈھال بن کر نہیں بلکہ اس کی اُس خطا کی جواب طلبی کرنے کے لیے جو اس نے کبھی کی ہی نہیں تھی جس میں اس کا ذرہ برابر قصور نہیں تھا۔ پھر بھی پھر بھی وہ مجرم بن گئی تھی۔ شاندانہ نے ماں کی بات پر انہیں تڑپ کر دیکھا۔

''اماں.....!'' ماں کے تاثرات دیکھ کر وہ آگے بات کرنا جیسے بھول گئی۔

''کیا اماں؟ بتا۔'' اس کا بھائی غرایا۔

''یہ جھوٹ ہے سب۔'' وہ بمشکل کہہ پائی۔

''اچھا ایک مرتا ہوا شخص جھوٹ کیوں بولے گا۔'' وہ لوگ مرے ہوئے کے جھوٹ پر اعتبار کر کے سامنے کھڑی زندہ کا سچ سننے کے روادار نہیں تھے۔ پھر اس نے ایسے چپ سادھ لی جیسے اس کا منہ سی دیا گیا ہو۔

''ارے جھوٹ کیا ہے اس میں اور میں کیوں جھوٹ بولوں گی؟ میں نے کئی بار تمہیں اس کے ساتھ گلی میں کھڑے ہو کر باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔'' بڑی بھابھی نے اپنا سچ جھوٹ ملا کر اپنے اندر کا زہر باہر نکالا۔ ایسا زہر جو اس گھر کے در و دیوار کو نیلوں نیل کر گیا تھا۔

''تو بتایا کیوں نہیں پہلے؟'' بھائی غرایا۔

''آپ تو بڑا یقین کرتے نا میرا۔'' وہ طنزیہ گویا ہوئیں۔

''سچ کہہ رہی ہیں بھابھی، میں نے بھی شاندانہ اور عاطف کو چھت پر کھڑے ہو کر باتیں کرتا دیکھا ہے۔ پہلے اسے چکر دیا اب خود بے گناہ بن رہی ہے۔'' چھوٹی بھابھی کیوں پیچھے رہتیں۔

باہر والے تو بعد میں آتے اس کے تو گھر والے ہی سنگ باری شروع کر چکے تھے۔ صرف مقدم صاحب خاموش کھڑے تھے۔ جس طرح وہ اپنی خاموشی کا زہر اس کی رگوں میں اُنڈیل رہے تھے اس سے تو بہتر تھا کہ وہ بول کر اپنے زہریلے جذبات کا اظہار کر دیتے۔ سب اس پر سنگ باری کر کے چلے گئے۔

اجنبی کبھی پتھر نہیں مارتے۔ پتھر ہمیشہ اپنوں کی بھیڑ سے آتے ہیں۔ اسے صفائی کا موقع بھی نہ دیا گیا اور سب کی سچی جھوٹی گواہیاں معتبر ٹھہریں اور اس پر فرد جرم عائد کر کے سزا سنا دی گئی۔ وہ بے بس اور مجروح ہو کر زمین پر گر پڑی۔ تلخ اور ہمت شکن الفاظ نے اس کے سارے حوصلوں کو آگ میں جھونک دیا تھا۔ اس کا سب سے چھوٹا بھائی عبد القیوم سہما ہوا اس کے پاس آیا۔

''آپا!'' اس نے پتھرائی ہوئی شاندانہ کے بازو پر ہاتھ رکھا تو گویا پتھر میں جان پڑی اور وہ اسے خود میں بھینچ کر رو دی۔

پورا محلہ جو سالوں سے مقدم صاحب اور ان کی فیملی کو جانتا تھا سب بھول گیا۔ یاد رہا تو بس اتنا کہ شاندانہ ایک بدکردار لڑکی ہے اور وہ اس کا اظہار بلند آواز کرنے لگے۔ اتنا بآواز بلند جو اس خاندان کے ہر فرد کے کانوں میں پڑنے لگا۔ عبد القیوم کے کسی دوست نے اسے شاندانہ کے حوالے سے طعنہ دیا تو اس نے اشتعال سے بے قابو ہو کر اس لڑکے کی خوب دھلائی کی۔

''میری آپا نے کچھ نہیں کیا، کچھ نہیں کیا سمجھے۔'' وہ اسے مارتا جاتا اور کہتا جاتا۔

''ارے ہٹ۔ بڑا آیا، بہن سنبھالی نہیں جاتی اور بڑا پہلوان بنا پھرتا ہے۔'' پٹنے والے لڑکے کی ماں نے آ کر عبد القیوم کو دھکا دے کر پرے گرایا۔ وہ وہیں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''کیوں اس کے پیچھے اپنی جان گنوا رہے ہو۔'' بڑی بھابھی نے بظاہر عبد القیوم سے پر پھاہا رکھتے ہوئے در پردہ ان پر نمک چھڑکا۔

''آپ لوگ کیوں نہیں سمجھتے، آپا نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ بھابھی کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ گیا۔

''لو جی نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔ سارے زمانے میں شور ہے اور اس کے لیے بہن ابھی تک معصوم ہے۔'' بڑی بھابھی کی زبان تلوار بن گئی۔

بڑی بھابھی طنز کا تیر پھینک کر چلی گئیں اور عارفہ بے بسی اور ہتک کے احساس سے رونے لگیں۔

☆☆☆

شاندانہ کے باپ بھائی باہر جاتے تو ان کے لیے لوگوں کی زبانوں کے نشتر سہنا مشکل ہو جاتا۔ دونوں بھائیوں نے گھر بیچ کر کہیں اور جانے کا کہا تو مقدم صاحب نے گھر بیچنے سے صاف انکار کر دیا کہ یہ گھر ان کے ابا کی نشانی تھا۔ کئی دن کے بحث تکرار کے بعد بھی جب مقدم صاحب نہ مانے تو اس کے دونوں بھائی بدنامی سے بچنے کے لیے گھر چھوڑ کر اپنے اپنے علیحدہ گھروں میں شفٹ ہو گئے۔ انھیں اپنے بچوں کے مستقبل کا خوف تھا اور وہ ان پر کسی بدکردار کا سایہ نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے۔ بھائیوں کے چلے جانے سے گھر سائیں سائیں کرنے لگا۔ زرینہ کے گھر والے بھی گھر چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو گئے تھے۔

''میرے ماں باپ نے مجھ سے بہت محبت کی مگر مجھ پر اعتبار نہ کیا۔ کاش وہ محبت سے زیادہ اعتبار کرتے ہوتے میرے اوپر۔'' شاندانہ کڑھ کڑھ کر سوچتی اور سوچ سوچ کر کڑھتی۔

جب سب حتیٰ کہ اس کے ماں باپ بھی اس سے منہ موڑ چکے تھے ایسے میں صرف ایک اللہ ہی اس کے ساتھ اور اس کے بعد عبد القیوم تھا جو اس کا غم

گسار اور سہارا بن کر اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے ماں باپ کی مجبوری تھی کہ وہ اسے گھر سے نہیں نکال سکتے تھے، دونوں نے اسے یوں نظر انداز کر دیا تھا جیسے وہ اس گھر میں رہتی ہی نہیں اور فی الحال وہ اس کی شادی بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جو کچھ ہو چکا تھا اور شاندانہ کی جتنی شہرت اڑ چکی تھی تو کوئی بھی اس سے اپنے بیٹے کا تعلق جوڑنا پسند نہ کرتا کہ اس کی تو سگی پھوپھی جو اسے اپنے بیٹے کی دلہن بنانے کا عندیہ کئی بار دے چکی تھیں، منہ بھر کر انکار کر گئی تھیں انھیں ایک بدکردار لڑکی بہو کے روپ میں کسی صورت قبول نہیں تھی۔

وہ پھوپھی سے کیا گلا کرتی کہ وہ حق پر تھیں جس لڑکی کی بدکرداری پر اس کے ماں باپ نے یقین کی مہر ثبت کر دی تھی تو اس پر انھیں تو یقین کرنا ہی تھا۔ پھر بھی نہ جانے کس آس پر اس نے وقار کی طرف دیکھا تھا جو تنفر سے منہ پھیر کر چلا گیا تھا۔ شاندانہ کی آنکھوں کے سامنے کتنے ہی منظر گھوم گئے تھے۔ جب وقار بہانے بہانے سے اس کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔

"ارے آپ یہاں کیوں آ گئے ہیں؟ کمرے میں بیٹھیں نا۔ سب کے ساتھ۔" ان کی آمد پر شاندانہ کچن میں مصروف ہوتی تو وہ سب کی نظر بچا کر کچن میں آ جاتا۔

"وہ پانی پینے آیا تھا۔" وہ گلاس اُٹھا کر فریج کی طرف بڑھ جاتا اور شاندانہ مبہم سا مسکرا کر اپنے کام میں مصروف رہتی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے اسے فرصت سے تکے جاتا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" اس کے مسلسل تکنے پر شاندانہ ٹوکتی۔

"دیکھ ہی تو رہا ہوں کچھ کہہ تو نہیں رہا نا۔ اب اس پر بھی پابندی ہے۔"

"ہاں۔" وہ اتراتی۔

"اچھا کرتا ہوں امی سے بات، تمہارا بندوبست کرواتا ہوں۔" وہ دھمکی دیتا تو شاندانہ کھل کر ہنس دیتی۔

اب وقار کی اس بے اعتباری پر اس کا دل جیسے کٹا تھا اور آنسوؤں کی صورت بہنے لگا تھا۔ نظروں کی مار سہنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی وقار کی بے اعتبار نظروں کی مار سہہ نہیں پا رہی تھی۔ سب کی بے اعتباری اس کے لیے ایک ایسا غم بن گئی تھی جس کے ماتم کو دو ہاتھ اور ایک سینہ کم پڑ جائے..... اور..... رونے کو دو آنکھیں ناکافی ہو جائیں۔

☆☆☆

اس بیچ شاندانہ کا رزلٹ آ گیا اور وہ شان دار طریقے سے پاس ہو گئی تھی مگر اس کی خوشی میں شریک ہونے والا کوئی نہیں تھا سوائے ایک عبد القیوم کے۔ وہ اس کے لیے اس کی فیورٹ چاکلیٹ لے کر آیا تھا۔

"مجھے رزلٹ لینے جانا ہے۔" شام کو شاندانہ نے عارفہ اور مقدم کے سامنے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے گھر سے باہر جانے کی۔ اب کوئی اور چاند چڑھانا چاہتی ہو۔" عارفہ بیگم کے لہجے کا تلخی اس کا جگر کاٹ گئی۔ مقدم صاحب البتہ خاموشی کی مار مار رہے تھے۔ اس کا گھر سے نکلنا بند تھا۔ گھر والوں کے سلوک نے شاندانہ کے دل میں یوں سناٹا بھر دیا تھا جیسے قبرستان میں شام کے وقت خاموشی اور ویرانی پھیلی ہوتی ہے۔

مناہل اس کا رزلٹ لے کر آئی تھی۔

"آنٹی شاندانہ بے قصور ہے۔" مناہل نے جاتے ہے عارفہ بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اسے ٹوک گئیں۔

"بس کرو مناہل اتنے سارے لوگ کیا جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم کس کس کو اس کی بے گناہی کا یقین دلائیں گے۔ گھر والوں نے بھی

اسے اس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا ہے۔ رائی تھی تو ہی پہاڑ بنا ہے نا۔'' عارفہ بیگم تلخ سی ہو گویا ہوئیں۔ انہیں لوگوں کے آنکھوں دیکھے کا یقین تھا مگر اپنی بیٹی نا قابل اعتبار تھی۔ ماں کی باتوں سے شاندانہ کا دل دکھا مگر اب ہر ایسی بات اسے تکلیف تو دیتی تھی مگر پہلے جیسی نہیں شاید وہ بے حس ہو رہی تھی یا اس سب کی عادی۔

''آنٹی آپ کیسی ماں ہیں؟ آپ کو اپنی بیٹی کا پتا نہیں ہے کیا؟ آپ نے اس سے ایک دفعہ بھی پوچھا کہ وہ عاطف سے بات کیوں کرتی تھی۔'' ان کے انداز پر مناہل کے دل میں تاسف سا اُتر گیا۔

''اس کے دل میں چور نہیں تھا تو اس نے ان باتوں کا ذکر مجھ سے کیوں نہیں کیا۔'' عارفہ بیگم شاندانہ کو کسی صورت بے گناہ ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ انہیں اس بات کا ملال تھا کہ ان کی ناک کے نیچے یہ سب ہوتا رہا اور ان کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ذرا گہرائی میں جا کر سوچتی تو پتا چلتا کہ کچھ تھا ہی نہیں تو انہیں کیا پتا چلتا بھلا۔ اپنی لاڈوں پلی کے لیے اپنا دل بڑا سخت کر لیا تھا انہوں نے، کہ اس کی سختی شاندانہ کی روح کو کچلتی تھی۔

''مناہل تم جاؤ پلیز۔'' شاندانہ نے آکر اسے چپ کروایا اور وہ خاموش ہو گئی۔

''آپ لوگ اپنے رویوں میں تھوڑی لچک پیدا کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وقت شاندانہ کی بے گناہی ثابت کرے تو وہ آپ لوگوں کے رویوں کو معاف بھی نہ کر سکے۔'' مناہل اپنی بات مکمل کر کے ان کے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔

☆☆☆

پورا ایک سال شاندانہ نے بے اختیاری اور مدکرداری کے طعنوں کے ساتھ کسی قیدی کی طرح گھر میں تنہا ہو کر گزارا۔ سورج کی حیات آفریں شعاعیں اس کے کمرے کے باہر ہی ٹھہر کر چلی جاتی تھیں۔ تازہ ہوا بھی کمرے کے دروازے سے پھیر کر واپس ہو لیتی تھی کہ اُسے کمرے کی گھٹن سے ڈر لگتا تھا۔

عبدالقیوم اور مناہل کو دیکھ کر شاندانہ کا چہرہ ہوا تھا کہ دکھ اور تکلیف میں کام آنے والے رشتے ہوتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں۔ مناہل دوست کی اس تکلیف پر خود بھی بے چین رہتی تھی۔ وہ شاندانہ کے گھر والوں کے سرد رویے باوجود شاندانہ سے ملنے آتی اور اس کا حوصلہ بڑھاتی۔ وہ روتی تو اس کے آنسو پونچھتی۔ اُسے اچھے دن کی اُمید دلاتی۔

''وقت بہت بڑا منصف ہوتا ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتا ہے..... صحیح غلط سب دیتا ہے..... بس تھوڑا انتظار کرنا پڑتا ہے۔'' مناہل سسکتی ہوئی شاندانہ کو گلے سے لگا لیتی۔

''مگر یہ تھوڑا انتظار بہت دشوار ہوتا ہے مناہل!'' شاندانہ کا لہجہ بین کرتا ہوا ہوتا۔

عبدالقیوم اس کا ماں جایا، سب گھر والوں کے ڈانٹنے ڈپٹنے کے باوجود شاندانہ کے ارد گرد منڈلاتا رہتا۔ اپنا کھانا اس کے ساتھ اس کے کمرے میں کھاتا۔ اس سے پوچھتا اسے کوئی چیز نہیں چاہیے۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے اپنے اس بھائی کو دیکھتی رہتی جو اس کے دفاع میں مار کھاتا تھا، دھتکارا جاتا تھا مگر باز نہیں آتا تھا۔ وہ اس کو گلے سے لگا لیتی۔

''تم نہ ہوتے تو اس گھر میں میرا دم گھٹ جاتا عبدالقیوم!'' وہ اسے گلے سے لگائے لگائے کہتی۔ آواز رندھ جاتی، آنسو آنکھوں کے کناروں پر پہنچتے اور بالآخر گالوں پر لڑھک جاتے۔

''آپا!'' جواب میں وہ اس کے ہاتھ تھام کر بس اتنا ہی کہہ پاتا مگر اس کے ہاتھوں کی گرفت شاندانہ پر اس کے سب جذبات، سب الفاظ واضح

اور جاں کردیتے تھے۔
کیسے بے مہر حالات تھے جس نے اس سے ہر شے اور اس کی ذات کا مان چھین لیا تھا۔ نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔ وہ ساری ساری رات تڑپتی۔ اس کو تڑپتا دیکھ کر تارے بھی ساری رات اس کے ساتھ جاگتے رہتے تھے۔ وہ یوں بکھر جاتی جیسے دانوں سے بھری گٹھڑی کھل جائے مگر اس وقت اس کو سمیٹنے والا کوئی نہ ہوتا۔ وہ خود ہی بکھرتی خود ہی سمٹتی اور ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔

''ارے شاندانہ تو میری جان ہے۔'' اس کا تھن سے بھر جاتا تو وہ بڑے بھائی کے پورشن میں چلی جاتی اور وہاں گھنٹوں ننگے پاؤں پھرتی رہتی۔ ان کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی۔

''اور آپ نے اپنی جان کو بے جان کردیا۔'' دل کا دل کرلاتا۔

''شاندانہ جیسا کوئی نہیں جی.....'' چھوٹے بھائی کے پورشن میں جاکر گھنٹوں تنہا بیٹھی رہتی۔

''واقعی شاندانہ جیسا بدقسمت کوئی نہیں ہے بھابھی۔'' وہ خودترسی کی انتہا پر پہنچ جاتی۔

وہ گھنٹوں تنہا بیٹھی اپنے خوش گوار ماضی کی باز گشت سنتی رہتی۔ مگر گیا وقت لوٹ کر کبھی واپس نہیں آتا۔ آنسو تو گناہ گار کے بھی سفید اور شفاف ہوتے ہیں وہ تو پھر بے گناہ اور معصوم تھی۔ اس کے آنسو گنتے ہی نہ تھے صاف شفاف شبنم کے قطروں کی طرح قطار قطار بہتے چلے جاتے۔ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے شام کردیتی۔ اترتی شام اُداسی کا آنچل ہاتھوں تلے دبائے اس کے ساتھ سسکتی رہتی۔

☆☆☆

وقت چلتا رہتا ہے بھلے اس کی چاپ کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ پھر وقت نہ صرف آگے بڑھا بلکہ اس نے بلا کھایا اور شاندانہ کی بے گناہی ثابت کرنے کی طرف دوڑنے لگا۔ شاندانہ اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد بہت دیر تک اللہ سے اپنے دل کی باتیں کرتی تھی۔

اللہ کا قانون انصاف یہی ہے کہ جو برا نہیں کرتا اُسے سزا بھی نہیں ملتی اور جو اچھا نہیں کرتا اُسے بھی انعام نہیں ملتا۔ بس قانونِ انصاف پر یقین ہونا چاہیے اور شاندانہ نے اس قانون پر یقین کیا تھا۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز پورے گھر میں گونجی۔ کوئی مہمان آیا تھا شاید شاندانہ اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔ اس کی نیند اس سے روٹھ چکی تھی۔ اب بھی وہ سوئی جاگی کیفیت میں تھی جب اسے عارفہ بیگم کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر ننگے پاؤں باہر کی طرف بھاگی اور باہر کھڑی زرینہ کو دیکھ کر اپنی جگہ پر جم سے گئی۔ زرینہ آنکھوں میں آنسو لیے خاموش کھڑی تھیں اور عارفہ بیگم ابھی بھی بول رہی تھیں۔

''تماشا دیکھنے آئی ہو ہمارا تو دیکھ لو، ہم ابھی بھی بے غیرت بن کے جی رہے ہیں۔'' عارفہ بیگم چلائیں۔

''آپ بس ایک دفعہ میری بات سن لیں۔'' زرینہ نے جیسے مقدم صاحب کی منت کی۔

''جو بھی بات ہے آپ اندر بیٹھ کر کریں۔ پہلے بھی ہم کم بدنام نہیں ہو چکے۔'' مقدم صاحب نے عارفہ بیگم کو مخاطب کیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عارفہ بیگم نے زرینہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھالیا۔ شاندانہ بھی ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر سائیڈ پر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

''آپ لوگ شاندانہ کو بلا دیں۔ مجھے اس سے معافی مانگنی ہے۔'' زرینہ نے نظریں جھکا کر کہا۔

''معافی؟'' عارفہ اور مقدم نے زیرلب دہرا کر پہلے ایک دوسرے کو پھر زرینہ کو دیکھا۔

''ہاں میں مجرم ہوں آپ کی بچی کی۔ میں نے ناحق ایک بیٹی کو بدنام کیا تو قدرت نے میرے کرم میرے منہ پر دے مارے۔ میری بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اس کے بعد ہمیں لوگوں کے جن رویوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اس سے مجھے آپ لوگوں کی تکلیف کا اندازہ ہوا ہے۔ شاندانہ کی اذیت کا تو میں شاید اندازہ بھی نہ کرسکوں کہ وہ بے چاری تو بے قصور تھی۔'' زرینہ آنسوؤں کے درمیان بولیں۔

مقدم اور عارفہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور باہر دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑی شاندانہ کی آنکھیں بھل بھل بہنے لگیں۔

''تو پھر اس وقت وہ سب کیوں کہا؟'' عارفہ نے روتے لہجے میں پوچھا۔

''میرا عاطف شرابی تھا اور جذباتی عدم استحکام کا شکار بھی۔ شروع سے ہی وہ ایسا تھا کہ جو چیز پسند آجاتی وہ اسے ہر صورت حاصل کرتا۔ نہیں تو دوسری صورت میں اپنی جان کے درپے ہوجاتا۔ ہم لوگ مجبور تھے اس کی خواہشات پوری کرنے میں۔ یہاں آکر اسے شاندانہ پسند آگئی۔ ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ شاندانہ کا رستہ روکتا ہے، مرنے سے کچھ دن قبل اس نے مجھ سے اپنی اسی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے اسے ٹال دیا۔ پھر شاید اس نے شاندانہ سے بات کی تھی اور اس کے منع کرنے پر اس نے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کر لی۔'' زرینہ کے آنسو میں روانی آگئی۔

''پھر اس وقت اتنا ہنگامہ کیوں کیا؟'' مقدم سرسراتے لہجے میں گویا ہوئے۔

''وہ خط اس نے شاندانہ کو بدنام کرنے کے لیے لکھا تھا اور میری کم عقلی یا کم ظرفی دیکھیے کہ میں نے جانتے ہوئے وہ خط سب کو دکھا کر شاندانہ کو بدنام کردیا۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے رو دیں۔

''اس وقت مجھے بس اپنے بیٹے کی میت [illegible] کر کچھ ہوگیا تھا، اور میں نے خودغرضی سے سوچا اگر شاندانہ راضی ہوجاتی تو کیا تھا میرا بیٹا [illegible] اس کی اک ہاں ہے۔ مگر میں بھول گئی تھی شاندانہ کوئی چیز نہیں تھی۔ جسے اُٹھا کر اس کی جھ میں ڈال دیا جاتا۔ میں نے اس معصوم بچی کا دکھایا تو اس کی سزا قدرت نے مجھے میری بیٹی ذریعے سے دلوائی۔''

مقدم اور عارفہ کے سامنے شاندانہ کا گھومنے لگا جو ''یہ سب جھوٹ ہے'' کہہ کر ایک بھی اپنی صفائی میں نہیں بولی تھی۔ بولتی بھی کیا۔ کون سا اس کی کسی بات پر یقین کیا جاتا۔ زر کب کی اُٹھ کر جا چکی تھیں۔ شاندانہ بے دم برآمدے کے تخت پر بیٹھی تھی۔

''بچہ روئے تو گہری نیند سوئی ماں فوراً اُٹھ اسے اپنی پناہ میں لے لیتی ہے۔ پھر کیسے ممکن کہ وہ رب جو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے اور جسے نیند آتی ہے نا اونگھ، وہ ہمارے رو اور گڑگڑانے پر ہمیں نظرانداز کردے۔'' وہ دل دل میں اللہ کے حضور سربسجود تھی جس نے اسے انداز نہیں کیا تھا۔ جس نے اسے بامراد کیا تھا۔ نے اس کی بے گناہی ثابت کی تھی۔ اس کے میں یک دم بہت شکستگی در آئی۔

مقدم اور عارفہ اسے ایسے بیٹھے دیکھ کر طرف بڑھے۔ عارفہ نے اس کے کندھے رکھا تو وہ چونک سے گئی اور پھر پھرتی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ لاک کر دونوں اسے آوازیں دیتے ہی رہ گئے۔

''آپ لوگ اپنے رویوں میں تھوڑی پیدا کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وقت شا بے گناہی ثابت کرے تو وہ آپ لوگوں کے

کو معاف نہ کر سکے۔'' عارفہ کے کانوں میں مناہل کی بات گونجی۔

''اب ہم کس منہ سے اپنی بچی سے معافی مانگیں گے۔ ہمیں اپنی بچی سے زیادہ اپنی نام نہاد عزت اور ساکھ کیوں پیاری ہوگئی۔ کیوں؟'' مقدم صاحب پچھتائے۔

''ہم نے پالا تھا اپنی بیٹی کو اتنے سال، پھر بھی ہم نے اس کی بات کا یقین تو دور کی بات ہے اسے اس کی صفائی کا موقع تک نہیں دیا۔'' دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غلطاں پچھتا رہے تھے۔

شاندانہ اب تک کمرے میں بند تھی۔ اس کی بے گناہی کا سن کر اس کے بھائی بھابھی سب آئے تھے۔ مگر شاندانہ کو اب کسی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس کا دل خاندان کی بے اعتباری کے خنجر سے لہو لہان ہو چکا تھا۔ ان سب نے اس سے ایسی محبت کی تھی جو اعتبار سے خالی تھی اور اعتبار سے خالی محبت بے روح جسم کی مانند ہوتی ہے۔

''ہمیں پتا تھا ہماری بہن کچھ غلط نہیں کر سکتی۔'' اس کے دونوں بڑے بھائی اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ جنھوں نے پہلے اپنی بیویوں کی گواہیوں پر اسے گناہ گار اور اب رزینہ کی گواہی پر اس کو پاک باز مان لیا تھا۔ شاندانہ کے ہونٹوں پر ہلکی طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ اس کی بھابھیاں بھی شرمندہ کھڑی تھیں۔

''ہمیں کیا پتا تھا کہ وہ ہی ہماری شاندانہ کو بلیک کر رہا تھا۔''

شاندانہ نے اپنے اردگرد اپنے خونی رشتوں کو دیکھا جو اپنی عزت بچ جانے پر خوش تھے۔ شاندانہ کو لگا وہ ان سے خون کا رشتہ تو ختم نہیں کر پائے گی مگر یہ ایک حقیقت تھی کہ ان سب سے اس کا دل کا رشتہ ختم ہو گیا تھا۔ اسے اب ساری زندگی ان سے صرف خون کا رشتہ نبھانا تھا۔ وہ ان سب کو معاف کر چکی تھی مگر دل کا رشتہ ختم کر کے۔

''بیٹا تمہیں یہ بات نہیں چھپانی چاہیے تھی۔'' عارفہ کا ملال ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کوئی پچاس دفعہ یہ بات کہہ چکی تھیں۔

''میں نے چھپایا نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ بات کوئی زیادہ اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ سو میں نے ذکر نہیں کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا میری خاموشی میرا جرم بن جائے گا۔'' پچاسویں دفعہ شاندانہ نے جواب دیا۔

''بیٹیوں کو ماؤں سے کوئی بات نہیں چھپانی چاہیے۔ سب بتانا چاہیے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی تاکہ ماں مشکل وقت میں اپنی بیٹی کی ڈھال بنے نہ کہ میری طرح اسے ہی مجرم سمجھے۔ مجھے معاف کر دو بیٹی۔'' عارفہ بیگم روز معافی مانگتی تھیں آج تو انھوں نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''نہ کریں اماں مجھے گناہ گار مت کریں۔ میں اولاد کی حیثیت سے اپنے سارے فرائض ادا کرنے کی کوشش کروں گی مگر پتا نہیں میں پہلے جیسی شاندانہ بن پاؤں گی یا نہیں۔'' شاندانہ دکھ سے کہہ کر اٹھ گئی اور عارفہ بیگم سکتے میں آ گئیں۔

☆☆☆

جسم پر لگے زخم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھر جاتے ہیں مگر روح اور دل پر لگے ہوئے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں..... بھرتے ہی نہیں..... لاکھ چارہ کرو، رستے ہی رہتے ہیں۔ سب کچھ معمول پر آ گیا مگر شاندانہ بہت بدل گئی تھی۔ سنجیدہ جو ہنسنا بھول گئی تھی۔ وہ موم کی طرح پگھلی تھی اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو گئی۔ اس کے لہجے میں عجیب سے سختی آ گئی تھی۔

''ابو میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔'' مقدم صاحب نے اجازت دے دی۔ حالانکہ ان کے خاندان میں لڑکیاں جاب نہیں کرتی تھیں۔ مگر

اجازت دے کر شاید وہ اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ مقدم صاحب کے توسط سے اسے ان کے ایک دوست کی این۔ جی۔ او میں جاب مل گئی۔ یہ این۔ جی۔ او کم آمدنی والے علاقوں میں لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے حوالے سے کام کرتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی این جی او تھی۔ چند مہینوں میں شاندانہ یہاں سیٹ ہوگئی تھی۔

ان ہی دنوں این جی او کے نئے جی۔ ایم کا تقرر ہوا۔ نئے جی۔ ایم کو دیکھ کر اسٹاف کی اکثریت اس کو سراہتی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھی کیونکہ محمد مساعد خاصا کم عمر اور ڈیشنگ پرسنالٹی کے مالک تھا۔ ہلکے پھلکے انداز میں سلجھا ہوا مزاج اس کی گفتگو کا حصہ تھا۔ جب اس کے ساتھ کام کیا گیا تو پتا چلا کہ وہ اتنی عمر میں ہی کتنا ٹیلنٹ ہے ساری ٹیم کو ساتھ لے کر چلنے کے ہنر سے مالا مال ہے۔ ساری ٹیم اس کے ساتھ خوش تھی کہ وہ سب کو ساتھ لے کر چلتا تھا۔ غلطی کی نشاندہی بھی ایسے کرتا تھا کہ غلطی کرنے والا نہ صرف اپنی غلطی درست کر لیتا بلکہ آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہ کرتا۔ اس کی شخصیت ندی کی مانند تھی جو سبک روی سے بہتی جاتی ہے۔ جہاں سے گزرتی ہے وہاں سبزہ اور پھول اُگاتی ہے سب کی پیاس بجھاتی ہے اور گنگناتی ہوئی بہتی رہتی ہے۔ وہ شاندانہ کے کام سے بہت خوش تھا جو کبھی بھی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی۔

''مس شاندانہ!''

''یس سر!''

''آپ آیئے مجھے ہمارے نیوز لیٹر کے حوالے سے بات کرنی ہے۔''

''جی سر!''

ڈیڑھ گھنٹے کی گفتگو کے بعد وہ نیوز لیٹر فائنل کر چکے تھے۔ اب شاندانہ کو یہ نیوز لیٹر پریس بھیجنا تھا۔

''اس نیوز لیٹر نے میرے کوئی بیس بال تو سفید کر دیے ہیں۔ اب بال تو کالے نہیں سکتے مگر کافی پی کر تھکن ضرور اتاری جا سکتی ہے اب بیٹھیے میں کافی منگواتا ہوں، آپ پی کر جایئے گا۔'' محمد مساعد کے انداز پر شاندانہ کے لبوں پر خفیف سے مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''آئی سوئیر، یہاں ہنسنے پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔'' محمد مساعد نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔ شاندانہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر شرارت دیکھ کر مسکرا دی۔

''تھینکس گاڈ۔ ورنہ میں سمجھتا تھا کہ شاندانہ کو شاید مسکرانا نہیں آتا۔ آپ مسکرائی کریں اچھی لگتی ہیں۔'' کافی آچکی تھی۔ اس خوشبو نے کمرے کو مہکا دیا تھا۔ دونوں کافی لگے۔ شاندانہ صرف کافی انجوائے کر رہی تھی مساعد کافی پیتے ہوئے کسی گہری سوچ میں تھا۔

☆☆☆

دو سال ہو گئے تھے شاندانہ کو یہاں کرتے ہوئے۔ محمد مساعد کی دوستانہ طبیعت باوجود شاندانہ بہت لیے دیے رہتی تھی۔ محمد سا ہی کیا وہ سب سے بہت لیے دیے رہتے تھے البتہ کام کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتی تھی وہ خاموش سی لڑکی کب محمد مساعد کے دل میں اُ اُسے خود خبر نہ ہوئی اور جب خبر ہوئی تو اس شاندانہ کو ڈائریکٹ پرپوز کر دیا۔

''مجھے شادی ہی نہیں کرنی، آپ سے نہ اور سے۔'' شاندانہ نے رکھائی سے جواب دیا۔

''وجہ جان سکتا ہوں اس انکار کی؟''

''میں آپ کو وجہ بتانے کی پابند نہیں ہوں میں دوبارہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہوں

گی۔ وہ فائل اٹھا کر باہر نکل گئی اور اور وہ اس کے اس رویے پر حیران بیٹھا رہ گیا۔

شاندانہ نے محمد مساعد سے بچنا شروع کر دیا۔ ایک دن محمد مساعد نے شاندانہ سے پوچھ ہی لیا۔

''مجھ سے بچ کیوں رہی ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اچھا۔'' محمد مساعد نے استہزائیہ کہا تو وہ خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''مس شاندانہ یا تو آپ کو اپنے انکار کی کوئی ٹھوس وجہ بتانا ہوگی یا میرا پروپوزل قبول کرنا ہوگا۔'' آج پھر اس نے وہی موضوع چھیڑ دیا تھا۔ عجیب وحشی بھرا لہجہ تھا اس کا۔

''کوئی زبردستی ہے کیا؟'' وہ تنک گئی۔

''یہی سمجھ لیں۔'' سابقہ لہجے میں کہا گیا۔

''پلیز۔ آپ جائیں یہاں سے۔'' شاندانہ نے چڑ کر کہا۔

''مسئلے حل کرنے سے ختم ہوتے ہیں۔ مسئلوں سے بچنا نئے مسائل کو جنم دیتا ہے۔'' محمد مساعد اپنی بات مکمل کر کے اُٹھا۔

''یاد رکھیے گا میں ''مساعد'' ہوں جو نا موافق حالات کو سازگار اور موافق بنانے کی طاقت رکھتا ہوں۔'' محمد مساعد نے معنی خیزی سے کہا اور پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

خزاں کے موسم کی سہانی ایک شام تھی۔ شاندانہ مغرب کی نماز کے بعد حسب معمول گھر کے سامنے سڑک پر واک کر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے ٹاہلی کے درختوں کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے اس کے راستے میں بچھے جا رہے تھے۔ وہ بے خیالی میں پتوں پر قدم رکھ کر آگے بڑھتی رہی مگر اس کے کان ان پتوں کے چرمڑانے کی آواز نہیں سن رہے تھے کیونکہ اس کے کانوں میں تو محمد مساعد کی آواز گونج رہی تھی۔ مگر اس کا دل اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا۔

☆☆☆

شاندانہ فیلڈ میں تھی اس کے ابو اسے لینے آفس آئے تھے مگر وہ ابھی تک آفس نہیں پہنچی تھی۔ محمد مساعد کسی کام سے ویٹنگ روم میں آیا تو ان سے سلام دعا کے بعد اسے معلوم ہوا کہ یہ شاندانہ کے والد ہیں۔ تو اس کے ذہن نے اسے جیسے ایک نئی راہ دکھائی۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں ذاتی نوعیت کا ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟'' اپنا تعارف کروانے کے بعد محمد مساعد نے مقدم صاحب سے اجازت چاہی۔

''مس شاندانہ اتنی سنجیدہ کیوں ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ان کی عمر کی لڑکیاں زندگی سے بھرپور اور چلبلی ہوتی ہیں۔'' مقدم صاحب خاموشی سے اسے دیکھنے لگے کہ جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ بتائیں یا نہیں۔

''دیکھیں اگر نہیں بتانا چاہتے تو اٹس اوکے، ویسے آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں۔''

مقدم صاحب نے جھجکتے ہوئے سب کچھ بتا دیا اور آخر میں اس کی شادی کے حوالے سے اپنی فکر بھی۔ آپ گھبرائیں نہیں اللہ بہتر کرے گا۔ تمام حالات جان کر محمد مساعد کا دل جیسے شاندانہ کے لیے دکھ سے بھر گیا۔ اس نے اس کے والد کو تسلی دی۔ شاندانہ کے دکھ پر اس کا دل بے چین ہو گیا تھا۔

''ہوں اب سمجھ میں آئی اس کے رویے کی مگر بے قصور ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو سزا کیوں دے رہی ہے۔'' وہ پر سوچ انداز میں چھت پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

''اب میں اسے خوشیوں کی طرف واپس

لاؤں گا۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔" محمد مساعد ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

سورج اپنا نارنجی آنچل احتیاط سے سمیٹ رہا تھا اور شام اپنا سرمئی آنچل دھیرے دھیرے ہر طرف پھیلا رہی تھی۔ پرندے اپنے گھروں کی جانب محوِ پرواز تھے۔ محمد مساعد لان چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں سامنے رکھی میز پر پھیلا رکھی تھیں۔ اس کا سارا دھیان دونوں ہاتھوں میں پکڑے موبائل پر تھا۔ اس کا انہماک اور دونوں ہاتھوں کے حرکت کرتے انگوٹھے اس بات کے گواہ تھے کہ وہ کسی ضروری کام میں مصروف ہے۔

"مسٹر مساعد! کیا بات ہے بھئی، آج کل بہت ہی مصروف ہو گئے ہیں۔ کیا اب آپ سے ملنے کے لیے مجھے اور تمہاری ماما کو اپائنٹمنٹ لینا پڑے گی۔" محمد مساعد کے والد محمد داؤد نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"بابا! آئیے پلیز۔" محمد مساعد نے باپ کی آواز سن کر ٹانگیں جھٹ سے نیچے کیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ موبائل اس نے سامنے رکھی میز پر رکھا اور ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بابا۔"

"تو پھر کیسی بات ہے؟ تمہاری ماں کو پریشانی ہے کہ تم آج کل کچھ الجھے الجھے سے ہو۔"

"یہ مائیں بھی نا۔ اللہ نے ان کے اندر نہ جانے کوئی ریڈار لگایا ہوا ہوتا ہے جو یہ اولاد کی ہر کیفیت کو پوری شدت سے محسوس کر لیتی ہیں۔" محمد مساعد نے سوچا۔

"کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔"

"نہیں بابا، ایسا کچھ نہیں ہے۔ بابا ایک بات بتائیں آپ شاندانہ سے ملے ہیں نا۔" شاندانہ کی محمد داؤد سے ایک دو بار سرسری سی ملاقات ہو چکی

"ہاں ایک دو بار تمہارے آفس میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"وہ آپ کو کیسی لگی؟"

"اچھی ہے، جیسے سب بچیاں ہوتی ہیں۔" محمد داؤد نے قدرے اُلجھ کر بیٹے کو دیکھا۔

محمد مساعد نے ایک فیصلہ کیا اور شاندانہ کے بارے میں بابا کو سب کچھ بتا دیا جو اس پر بیتا، اس کے بارے میں اپنے احساسات اور اس سے شادی کی خواہش۔ سب تفصیل سے بتا دیا کھول کر کچھ بھی چھپائے بغیر۔

"ہوں! دیکھو بیٹا عورت کی سب سے قیمتی چیز اس کی انا اور اس کی عزتِ نفس ہوتی ہے۔ جانتے ہو اس کی انا اور عزتِ نفس کی تسکین کب ہوتی ہے؟ تب جب اس سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر اعتبار بھی کیا جائے۔ اگر تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ تم اس پر ہمیشہ اعتبار کر سکو گے اور اس کو اپنی محبت کی چادر میں لپیٹ کر رکھ سکو گے تو ہی اس سے شادی کرنا ورنہ نہیں۔ وہ بے اعتباری کا دکھ وہ سہہ نہیں پائے گی۔ اس لیے بھی فیصلہ کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔ میں اور تمہاری ماں تمہارے ہر فیصلے کا احترام کریں گے۔" محمد داؤد نے متانت سے کہا۔

"شکریہ بابا۔" محمد مساعد طمانیت سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

"مس شاندانہ! پھر آپ نے کیا سوچا؟" محمد مساعد پھر آن موجود تھا۔

"کوئی بہت ہی ڈھیٹ انسان ہے۔" وہ دل ہی دل میں گویا ہوئی۔

"کس بارے میں؟"

"آپ کی یادداشت اتنی کمزور ہے نہیں لگتا

آپ ظاہر کر رہی ہیں۔ پھر بھی پھر بھی بتا دیتا ہوں میں پردپوزل والی بات کر رہا ہوں۔'' محمد مساعد نے فرصت سے اسے دیکھا۔

''ایک بات بتائیں، آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''

''سمجھ لیں محبت کا معاملہ ہے۔''

''او..... تو آپ بھی سب کی طرح صرف محبت کے دعوے دار ہیں۔'' ''اگر کبھی مجھ پر کوئی الزام لگے تو آپ کی یہ محبت کسی کونے میں جا کر سو جائے گی۔ ہے نا۔''

شاندانہ نے طنز سے کہا۔

''نہیں..... میرے نزدیک اعتبار محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔ میں پہلی سیڑھی چڑھ کر یہاں تک آیا ہوں۔''

''خالی خولی دعوے۔''

''آپ ثابت کرنے کا موقع نہیں دیں گی تو خالی خولی دعوے ہی رہیں گے۔'' محمد مساعد تھوڑا جز بز ہوا۔

''ایک دفعہ غلط ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر دفعہ ہی ہمارے ساتھ غلط ہوگا۔ اعتبار کرنا سیکھیں۔ ایک غم کو سینے سے لگا کر باقی خوشیوں سے منہ موڑنا عقل مندی نہیں ہے۔ گزری مصیبتوں اور دکھوں کو پورے سیاق وسباق کے ساتھ ماضی میں دفن کر دینا چاہیے۔ ان کو ساتھ لے کر چلنے سے حال اور مستقبل دونوں مصیبت زدہ اور دکھی ہو جاتے ہیں۔'' محمد مساعد نے ناصحانہ انداز اختیار کیا جواب میں شاندانہ کے پاس صرف لب سلی چپ تھی۔

''اب میں ڈائریکٹ آپ کے والدین سے بات کروں گا۔'' محمد مساعد نے فیصلہ سنا دیا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''آپ کہن لگے چاند کی چاہ کیوں کر رہے ہیں؟'' محمد مساعد جانے کو اٹھا تو شاندانہ نے سوال کیا۔

''گرہن صرف چاند اور سورج کو لگتا ہے۔ ستاروں کو نہیں اور آپ میرے نصیب کا ستارہ ہیں۔''

وہ اٹھ کر چلا گیا تو شاندانہ نے کھڑکی کے پار، املتاس کے درختوں پر نظریں جما دیں۔ گرم ہواؤں نے املتاس کی شاخوں کو چھو کر ان پر پیلے پھولوں کا سحر پھونک دیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے املتاس کے درخت پیلے پھولوں کے ہار تھامے اس کے انتظار میں کھڑے ہیں کہ وہ آگے بڑھ کر انھیں تھام لے اور خوشیوں کی راہ پر قدم رکھ دے۔ یکا یک ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ اس نے املتاس کے پھولوں سے نہ جانے کیا سرگوشی کی کہ وہ درختوں سے جھڑ جھڑ کر جھومتے ہوئے یوں گرنے لگے جیسے زرد پھول آسمان سے بارش کی صورت برس رہے ہوں۔ وہ تھوڑی دیر ان پیلے پھولوں کے سحر میں کھوئی رہی۔ پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

☆☆☆

محمد مساعد نے شاندانہ کے امی ابو سے رابطہ کر کے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو ان لوگوں نے اس شرط پر آنے کی اجازت دی کہ اگر شاندانہ راضی ہوئی تو ٹھیک ورنہ وہ زبردستی نہیں کریں گے۔

''شاندانہ بعض اوقات برے حالات ہمیں کسی اچھے انسان سے ملوانے کے لیے آتے ہیں۔ تم نے جو تکلیف اٹھائی ہے اس کا ثمر محمد مساعد جیسا شخص ہی ہو سکتا ہے جو تمھیں اپنا کر تمہارے ہر دکھ کا ازالہ کر دے۔ اس لیے پلیز، اپنی ضد چھوڑ دو۔'' مناہل نے اسے سمجھایا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''محمد مساعد کے گھر والے آئیں گے اور تم کوئی بے وقوفی نہیں کرو گی، سنا تم نے؟'' مناہل

نے اس کی خاموشی پر چڑ کر تبصرہ کی۔ اس کی چڑی ہوئی شکل دیکھ کر شاندانہ مسکرا دی۔

"میں آنٹی کو بتاتی ہوں تم راضی ہو۔" منائل جلدی سے بیڈ سے اُتری۔

"میں نے کب کہا؟" شاندانہ حیران ہوئی۔

"تم مسکرائی ہو ابھی اور مسکراہٹ کا مطلب بھی رضامندی ہوتی ہے۔" منائل نے جلدی سے کہا اور بھاگ کر باہر چلی گئی۔ شاندانہ کے موبائل کی میسج ٹون بجی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میرا اعتبار کریں مس شاندانہ بس ایک موقع ضرور دیں۔" مساعد کا میسج آیا تھا۔

"ہم لڑکیاں وہ نازک آبگینہ ہوتی ہیں جو کسی اجنبی کی ٹھوکر پر تو ریزہ ریزہ ہو کر دوبارہ جڑ سکتی ہیں..... مگر..... اپنوں کی بے اعتباری کے سنگ کھا کر جب ہم ٹوٹتی ہیں تو پھر ہمارا جڑنا بہت مشکل بلکہ کبھی کبھار تو ناممکن ہو جاتا ہے۔ مجھے ابھی یہ سب بہت مشکل لگ رہا ہے۔" اس نے جوابی میسج بھیجا۔

"ارے! میں اپنی محبت کی طاقت اور اپنائیت سے آپ کو جوڑ کر اپنی حفاظت میں لے لوں گا اور میرا وعدہ ہے کہ آئندہ کبھی کوئی سنگ آپ تک نہیں پہنچنے دوں گا۔"

اور شاندانہ کا دل جیسے ایک رسک لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن ابھی اسے کچھ وقت چاہیے تھا۔

مجھے کچھ وقت دو گے تم؟
بہت ممکن ہے ایسا ہو
تمہارا ساتھ دے پاؤں
تمہارے ہاتھ میں، میں ہاتھ دے پاؤں
سنور جاؤں
نکھر جاؤں
نئے رنگوں میں ڈھل جاؤں
بہت ممکن ہے ایسا ہو
مگر.....!
کچھ وقت دو گے تم؟

شاندانہ نے نے جوابی میسج میں اپنا مدعا بیان کرتی نظم ٹائپ کر کے بھیج دی۔

"ارے ہم تو آپ کو پوری زندگی دینے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور آپ بس کچھ وقت چاہ رہی ہیں ہم سے۔ آج سے وقت بھی آپ کا، ہم بھی آپ کے، سب آپ کا۔ بس آپ رضامندی کا اظہار کر کے مجھ پر احسان کر دیں۔" میسج کا جواب آیا تو وہ کھل کر مسکرا دی۔ اس کے الفاظ اس کے لیے ایسے تھے جیسے آدھی رات کو صبح کا ستارہ چمکنے لگے۔ اس کے دل سے جیسے سارے ملال ایک ایک کر کے ڈھلنے لگے تھے۔

شاندانہ کی رضامندی پا کر مساعد کے امی ابو آئے اور مساعد کے لیے بہت محبت سے شاندانہ کا رشتہ طلب کیا۔

"زندگی میں اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ خزاں اگر باغ اُجاڑتی ہے تو بہار میں نئی کونپلیں بھی پھوٹتی ہیں۔ پھول بھی کھلتے ہیں۔ زندگی میں غم ملتے ہیں، نوحے سنائی دیتے ہیں تو خوشیاں بھی ملتی ہیں۔ خوشیوں کے گیت بھی سنائی دیتے ہیں۔" جاتے وقت محمد مساعد کی امی نے شاندانہ کے سر پر ہاتھ رکھ نرمی سے کہا تھا۔ محمد مساعد کے ابو نے اس کے سر پر صرف ہاتھ رکھا جس میں مان، محبت اور عزت ہر چیز کا احساس تھا۔

"محمد مساعد ایسے ہی اعلا ظرف والدین کی اولاد ہو سکتا ہے۔" شاندانہ نے ان باوقار محبت کرنے والے انسانوں کو دل ہی دل میں سراہا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک بااعتبار محبت کی معراج پر پہنچے گی۔

☆☆

فسہ کی آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج چکے تھے۔ اپنے پہلو میں سوئی فاریہ کو اس نے ہولے سے پیار کیا اور آہستگی سے اٹھ کر باہر روم سے فریش ہو کر باہر چلی آئی۔ سامنے مسہری پر اس کی ساس، نند بچی پنڈلیاں کاٹ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

"السلام علیکم مامی!" جماہی روکتے ہوئے اس نے سلام کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"فاریہ سو رہی ہے؟"

"جی۔ رات میں وہ بچے تک کھیلتی رہی، مجھے سونے دیا اور نہ احمد کو۔ میں تو چلو صبح دیر تک سو کر نیند پوری کر لیتی ہوں لیکن احمد بے چارے تو نیند میں جھومتے ہوئے آفس جاتے ہیں اور سارا دن دماغ کھپاتے ہیں۔" اب وہ بچن میں کھڑی ناشتا کم دوپہر کا کھانا بنا رہی تھی۔

"ایسے ہی ہوتا ہے بیٹا۔ بچے پالنا اتنا آسان تھوڑا ہی ہوتا ہے۔"

"بہت تنگ کرتی ہے۔ رات میں سونے کا نام ہی نہیں لیتی اور پھر فیڈ کے لیے بار بار اٹھتی ہے۔ میں تو پوری رات اٹھتی بیٹھتی ہی رہتی ہوں۔" ہر ماں کی طرح اس کے بھی اولاد سے شکوے تھے۔ رابعہ نرمی سے مسکرا دیں۔

"بچے سب ہی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ کم کچھ زیادہ لیکن تنگ سارے ہی کرتے ہیں۔ ماؤں کے قدموں تلے جنت یوں ہی تو نہیں رکھی گئی اگر بچے پالنا اور پالنا اتنا ہی آسان کام ہوتا تو....." وہ نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے ساتھ ساتھ سبزیاں کاٹ رہی تھیں تب ہی بڑے کمرے سے رقیہ آپی لاڈلی سی بچی باہر نکلیں۔

"اٹھ گئی میری لو (پیو)۔" کاٹ دار لہجہ فسہ کو دیکھتا پانی پانی کر گیا۔ ساس بھلے نفی بھی اچھی کہی، دادی ساس ساری کسر پوری کر لیتی تھیں۔

"ہاں اٹھ گئی اے تے بچ تم دی کرے (اب اٹھ گئی ہو تو کچھ کام بھی کر لو)۔" وہیں مسہری پر ٹک کر

چار چار پائے ہیں۔ ساس سسر کو بھی دیکھا اور
گھر بھی سنبھالا۔ میری ساس تو چلی جاتی تھیں
صبح گھومنے پھرنے۔ کبھی کسی کے ہاں تو
ہاں۔ پھر گھر ہوتا تھا میرے حوالے۔ انہوں نے
کام کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ میں تو سب اکیلے
اور آج کل کی لڑکیاں....." اماں پنجابی میں
مزے سے مسہری پہ لیٹی تبصرے کیا کرتیں۔ سنانا
مقصود ہوتا تھا۔ اس کا دل دکھی سا ہو جاتا۔ کیا تھا اگر
بہو کی صحت کے پیش نظر اس کا کچھ خیال کر لیتیں
تو..... الٹا وہ بہو کے ساتھ وہی سب دہراتیں جو
کی ساس نے ان کے ساتھ کیا تھا۔

رابعہ نے کبھی ساس سے مدد کی درخواست نہ
کی تھی جو سارا دن چارپائی پہ پڑی حقہ پیتی رہتیں
دل بہلانے کے لیے اڑوس پڑوس میں نکل جاتیں
زیادہ دل گھبراتا تو بیگ اٹھایا اور کبھی بہن کے
لاہور چلی جاتیں تو کبھی جیٹھانی سے ملنے حیدر آ
پھر وہاں سے ایک بیٹے سے ملنے تو کبھی دوسرے
ملنے۔ ایک بار جو جاتیں تو مجال ہے کہ دو ہفتے
پہلے لوٹنے کا نام لیتیں۔ پیچھے امجد رو رو کر اس کا
حال کر دیتا۔ اس کی نیند بھی عام بچوں کے مقا
میں بہت کم تھی۔ رابعہ کو تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ
سنبھالے یا بچہ۔ تنگ آ کر خود بھی رونے بیٹھ جاتی۔

"اس سے اچھی تو ماں باپ کے ہاں تھی۔ ا
بے فکری تھی وہاں۔ شادی کر کے تو عجیب مشکل
پھنس گئی ہوں۔" روتے ہوئے امجد کو چپ کراتے
بکھرے گھر کو دیکھتی۔ بھوکی بیٹھی ہی رہتی کہ امجد چپ
ہوتا تو وہ اپنے لیے کچھ بناتی اور کھاتی نا۔ کام بکھر
رہتے اور وہ امجد کو بہلانے میں سارا دن بتا دیتی
کامران گھر آتے تو اسی پہ برس پڑتے۔

"تم سارا دن کرتی ہی کیا ہو؟ ایک گھر تم سے
نہیں سمیٹا جاتا۔" بکھرا ہوا گھر انہیں بری طرح

تب ہی اندر سے فاریہ کے رونے
شمہ نے وہیں سب چھوڑا اور اندر کی جانب دوڑ
لگا لی۔ فاریہ یقیناً جاگ گئی تھی اور جاگتے ہی بھوک کی
وجہ سے رونا لازم و ملزوم تھا۔

رابعہ اب سارا کام چھوڑ کر شمہ کے لیے ناشتا
بنانے اٹھ گئیں۔ پہلا بچہ، فیڈ لیتا ہوا رات بھر جاگ
کر فیڈ کروانے سے، بہو بھوکی ہوگی..... انہیں ان تمام
باتوں کا بخوبی احساس تھا۔

"تو اپنی نوسے کم نہیں لیتی (تم اپنی بہو سے کام
نہیں لیتی)۔" رقیہ بی بی نے ناگواری سے ناک
بھوں چڑھائیں۔ انہیں رابعہ کا اس طرح سارا دن کام
کرنا اور شمہ کا بچی ہی اٹھائے رکھنا سخت ناگوار گزرتا
تھا۔

"وہ بے چاری کیا کرے، اس کی بچی اسے
ستاتی بھی تو بہت ہے نا اماں۔" بہو کی حمایت میں
بولتے وہ رقیہ بی کو اور بھی بری لگ رہی تھیں۔

"کیوں بچے ہمارے بھی تو تھے۔ ہم نے کیا نہ
سنبھالے؟ یہ کوئی انوکھی ہے۔"

"میں اپنا مقابلہ اپنی بہو سے نہیں کرنا چاہتی، نہ
میں یہ چاہتی ہوں کہ جو میں نے کاٹا وہ میری بہو بھی
کاٹے۔" مسموم لہجے میں کہتی وہ ساس کو بہت کچھ یاد
دلا گئی تھیں۔ رقیہ بی نجانے کیوں بہو کی بات سن کر
خاموش ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

رابعہ کی نوعمری میں ہی کامران جلیل کے ساتھ
شادی ہو گئی تھی اور شادی کو ابھی سال بھی نہ گزرا تھا
کہ بیٹا بھی گود میں آ گیا۔ ایک تو کم عمری کی شادی
پر سے جسمانی کمزوری۔ امجد کو سنبھالنا ان کے لیے
خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر وہ سارا دن روتا بھی رہتا تھا
گرا کیلے بالکل نہیں رہتا تھا۔ اس پہ مستزاد اسے گھر کا
سارا کام بھی سنبھالنا پڑتا۔ کبھی جو مدد طلب نظروں
سے ساس کو دیکھتی تو وہ ایسے بن جاتیں کہ جیسے انہیں تو
کچھ پتا ہی نہیں، ان کا انداز ایسا ہوتا کہ تم

"مجھ سے سارے کام نہیں سنبھالے جارہے کامران! آپ اماں سے کہیں کہ وہ اپنے آجائیں۔ اپنے کو دیکھیں تو میں گھر دیکھوں نا۔" وہ بے بسی سے رونے لگتی۔

"اماں نے کیا تمہارا ٹھیکا اٹھا رکھا ہے۔ وہ اب تمہارے لیے گھر کی دہلیز پکڑ کر تو نہیں بیٹھ سکتیں نا۔" کامران نکا سا جواب دیتے۔ اس کا شوہر اس کی مشکل نہیں سمجھ رہا تھا تو اور کسی نے کیا سمجھنا تھی۔ کسی نے صحیح کہا تھا شوہر سے سسرال کی شکایت کرنا ایسا ہے جیسے مچھر سے ملیریا کے بارے میں بات کرنا۔

"سسرالی رشتے اتنے بے حس کیوں ہوتے ہیں کہ آنے والی کو انسان نہیں، کوئی خلائی مخلوق سمجھتے ہیں جو سب سنبھال لے گی۔ اسے درد نہیں ہوتا، کوئی تکلیف نہیں ہوسکتی، کوئی مشکل نہیں آسکتی اس پہ۔" بخار میں تپتے ہوئے، صحن میں جھاڑو لگاتے وہ سوچ رہی تھی۔

"اللہ میرے لیے تو آسانی والا معاملہ کردے۔ میں تیری آنے والی بندی کے لیے ایسی ساس نہیں بنوں گی، جیسی ساس میری ہیں۔ میں اپنی تکلیفوں کا بدلہ اس سے نہیں لوں گی۔" بھرائی آنکھوں سے آسمان کو تکتے وہ فریاد کررہی تھی۔ پھر کچھ تو اللہ کی طرف سے آسانی ہوئی کہ کامران نے گھر میں کل وقتی ملازمہ رکھ لی اور کچھ وہ کام نبٹانے کے گر سیکھ گئی۔

وقت کی اچھی بات، ایک پل کو مشکل ہوتا ہے تو اگلے پل سہل بھی ہو ہی جاتا ہے۔ اس کا بھی ہوگیا تھا۔

☆☆☆

حال میں لوٹتی رابعہ کی آنکھیں آج بھی اپنی نئی ازدواجی زندگی کی تکلیفوں کو سوچتے ہوئے بھرا گئی تھیں۔ برا وقت گزر ہی گیا لیکن اپنے پرائے کا فرق سمجھا گیا۔ آنکھوں کی نمی پونچھتے سوچا اور مسکرادیں۔

رات کا کھانا سب کھا کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ دسترخوان پہ محض رقیہ بی، کامران اور رابعہ ہی رہ گئے تھے۔ کھانے کے بعد وہ تینوں سبز قہوہ پیتے تھے۔ رابعہ وہی بنا کر لائی ہی تھیں کہ کامران نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اماں کہہ رہی ہیں کہ تم شمسہ کو کام میں نہیں لگاتیں۔ وہ دن چڑھے تک سوئی رہتی ہے۔ ایسے تو اسے کاہلی کی عادت پڑجائے گی۔" رابعہ نے رقیہ بی کی طرف دیکھنے سے اجتناب کیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ ملامتی نظریں اس پہ ہی جمی ہیں۔

"اماں ٹھیک کہتی ہیں۔ میں شمسہ سے کام نہیں لیتی کیونکہ ابھی اسے کتنے برس بیتے ہیں اس آنگن میں بھلا؟ بچی چھوٹی ہے، رات میں جگاتی ہے، تنگ کرتی ہے۔ ایسے میں کیا ہوگیا اگر میں اس کے آرام کا خیال رکھ لوں تو.....؟ وہ بھی انسان ہے، بھلے میری بہو ہے لیکن کسی کی تو بیٹی ہے۔ یوں بھی میں کب تک اس گھر کو سنبھالوں گی۔ گھر سنبھالنا تو آخر میری بہو۔۔۔ نے ہی ہے۔ ابھی اس کا مشکل وقت ہے تو میں اس کے لیے آسانی پیدا کررہی ہوں۔ میں نے سسرال میں مشکل وقت گزارا، میں ویسا برا وقت اپنی بہو۔۔۔ کو نہیں دکھانا چاہتی۔" انہوں نے بات مکمل کرکے رقیہ بی کی طرف دیکھا جواب خاموش سی نظریں جھکائے بیٹھی تھیں۔

"اماں جی! میں اپنی بہو۔۔۔ کے سامنے اپنی اور ساس کی کہانی نہیں دہرانا چاہتی۔ میں اپنی اور اس کی ایک نئی کہانی رقم کرنا چاہتی ہوں جس میں بہو انسان سمجھی جاتی ہے اور ساس اس کی مددگار۔ اگر میں غلط ہوں تو چلیں غلط ہی سہی۔" کامران اور رقیہ بی کو چپ لگ گئی تھی اور رابعہ اب کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھیں۔

☆☆

ام طیفور

سراب گزار

پندرھویں اور آخری قسط

اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر فریش کیسے تھا۔ حالانکہ جس وقت وہ دادا کے اصرار پر مومن کو شاپنگ کے لیے پک کرنے گیا تھا، خاصا جبر کر کے گیا تھا۔ آج کل پریشان رہنے لگا تھا اس لیے کسی کام کے کرنے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مگر اب اسے یہ ماننے میں معمولی سا بھی تامل نہیں تھا کہ وہ اگر آج نہ جاتا تو یقیناً اپنی زندگی کا سب سے بہترین وقت گنوا دیتا۔ زندگی کے رنگوں سے آشنائی اور

بناوٹ سے پاک رویے، وہ برت کر آ رہا تھا۔ اگر اس کی کلاس کا کوئی شخص یا اس کا دوست اسے یوں بازار میں مومن اور شاویز کے ساتھ تماشے کرتا دیکھ لیتا تو خود کو چٹکی ضرور کاٹتا۔ وہ اتنا ہی ٹھہرے مزاج کا بندہ تھا۔ اس نے تو قریبی دوستوں کے ساتھ ایک تکلف ہمیشہ قائم رکھا تھا۔ مگر آج جیسے ہر بندش توڑ کر اس نے خود کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ واپسی پر مومن اور شاویز کو گھر اتارتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مزید ان سب میں بیٹھے، وقت گزارے۔ اپنی اس خواہش کا بمشکل گلا گھونٹتے ہوئے وہ محض ابی کے خیال سے واپس ہو لیا تھا۔

نائمہ پاشا کے گھر سے چلے جانے کے بعد وہ بہت عجیب سے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار اس قدر پرسکون دکھائی دیتے جیسے سبک سا بہتا پانی تو کبھی طوفانی چیخ چنگھاڑ شروع ہو جاتی۔ ایسے میں وہ سوائے اس کے کسی سے بھی نہیں سنبھلتے تھے۔ ان کے لیے رکھا گیا میل نرس بھی گھبرا کر فوراً سالک پاشا کو بلوا لیا کرتا تھا۔ وگرنہ عام حالات میں وہ ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ شروع شروع کے دنوں میں سالک نے دو میل نرس رکھے تھے کیونکہ عادل پاشا نے بالکل ہمت ہاری ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹرز کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون نہیں کر رہے تھے۔ نہ فزیوتھراپی کراتے نہ میڈیسنز لیتے تھے۔ ایسے میں

ان کو اٹھانے بٹھانے سے لے کر نہلانے دھلانے، کپڑے بدلوانے اور ضروریات سے فارغ کروانے کے لیے دو میل نرسز سے بے حد آسانی تھی مگر پھر گھر آجانے کے بعد جب چند دن میں انہیں یقین ہو گیا کہ ناعمہ پاشا واقعی انہیں چھوڑ کر جا چکی ہیں تو وہ لاشعوری طور پر تھوڑا سنبھل گئے تھے، تب سالک نے ایک میل نرس کو فارغ کر دیا تھا۔

عادل پاشا الیکٹرک وہیل چیئر کا استعمال کرنے لگے تھے۔ وہ سارا سارا دن ناعمہ پاشا کے اس کمرے میں گزار دیتے تھے جہاں وہ گھر چھوڑ کر جانے سے پہلے مقفل ہو گئی تھیں۔ ان کی چیزوں کو چھو چھو کر دیکھتے رہتے۔ اور جب ضبط کرنا محال ہو جاتا تو چلانے لگتے۔ اونچی آواز میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے، ہر اس شخص کا نام لے لے کر معافی مانگتے جس جس کا دل دکھا چکے تھے یا نقصان کر چکے تھے۔ ناعمہ پاشا کو پکارا کرتے اور پھر نڈھال ہو کر رونے لگتے۔ ناعمہ پاشا سے دوری ان کی روح کھینچے دے رہی تھی۔ انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی ناعمہ سے دور بھی ہوں گے جسے پانے کی خاطر انہوں نے کیا کیا نہ کھویا تھا۔ اپنے رشتے، اپنا اعتبار، اخلاقیات، اقدار اور کردار۔ سب کچھ.....

سالک نے لاؤنج میں قدم رکھا تو دل کو جکڑنے والا سناٹا پھیلا تھا۔ نوکر ابھی اپنے کوارٹرز میں نہیں گئے تھے مگر پھر بھی اس قدر خاموشی اور سرد ماحول تھا کہ اسے لگا جیسے کسی قبر میں اتر آیا ہو۔ اس نے بازو پر ڈالا ہوا کوٹ کندھے کی پشت پر ڈالا اور تھکی تھکی سی سانس پھیپھڑوں میں بھر کر ناعمہ پاشا کے کمرے کا رخ کیا۔ عادل پاشا یقیناً وہیں ملتے۔ اس نے بنا آواز پیدا کیے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی وہ ناعمہ پاشا کی تصویر ہاتھ میں تھامے کسی بت کی مانند بیٹھے تھے۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ان کے قریب آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"آپ ابھی تک سوئے کیوں نہیں ابی! ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آپ کو حد نو بجے تک سو جانا ہے اور اب ٹائم دیکھیں کیا ہو رہا ہے..... ایسے تو آپ....."

"سالک! تم نے مجھے معاف کیے کر دیا؟" عادل پاشا، سالک کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

"ابی.....! میں بھلا آپ کو معاف کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ آپ بھی سب بھول جائیں اب۔"

"کیسے..... کیسے بھولوں....." وہ ہیجان انگیز لہجے میں بولے۔ "میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو عقیل مغل اپنے ماں باپ کے ساتھ مجھے مارنے آ جاتا ہے..... خواب میں کئی بار اس نے مجھے مارا ہے..... سالک! وہ مجھے اتنا مارتا ہے مگر مجھے درد نہیں ہوتا پتا ہے کیوں؟" وہ عجیب سے انداز میں بات کرتے سالک کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

"کیونکہ وہ میری ان بے جان ٹانگوں پر مارتا ہے..... بھلا یہاں مار کر اسے کیا حاصل ہوتا ہوگا، یہ میں کئی دن تک سوچتا رہا۔ پھر ایک رات اس نے مجھے کہا کہ تیری ٹانگوں کی معذوری تیرے کالے اعمال کی سب سے ہلکی سزا ہے۔ تجھے لمحہ لمحہ مرنا ہے ابھی..... انتظار کر..... اس وقت کا جب تو اکیلا بستر پر سسک سسک کر مرے گا۔ سالک! کیا واقعی میں ایسے مروں گا؟" وہ سالک کی طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ سالک نے ان کے ہاتھ تھام کر چومے اور انگوٹھے سے ان کے ہاتھ کی پشت سہلاتا ہوا بولا۔

"نہیں ابی۔ آپ وہم مت پالیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے آپ۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اگر آپ علاج میں دلچسپی لیں گے تو جلد از جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"سالک..... بیٹا مجھے معاف کر دو میں نے بڑے گناہ کیے ہیں..... میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میری گرفت بھی ہو سکتی ہے۔ اب جب پکڑ ہوئی ہے تو ایسی کہ میرا پورا وجود اس شکنجے میں پھڑپھڑاتا ہے مگر نکل نہیں پاتا..... میرا اپنی ہی سانسوں سے دم گھٹتا ہے..... میرا دل اسی سینے میں مسلا جاتا ہے اور

میں سہتا ہوں، بس سہتا ہوں۔" سوال گندم جواب چنے کے مصداق وہ بولے۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ..... اس طرح مت سوچیں ابی..... اور ریلیکس رہیں ورنہ طبیعت بگڑ جائے گی آپ کی۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم بھی مجھے معاف نہیں کرو گے۔ جیسے عقیل مغل نہیں کرتا۔ جیسے نائمہ نے نہیں کیا۔ ایسے ہی تم بھی مجھے سزا دو گے۔"

سالک کے تھکے ہوئے اعصاب مزید کشیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ عادل پاشا جب ایسی باتیں شروع کر دیتے تھے تو اس کی عقل ماؤف ہونے لگتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنی آنکھوں کو مسلا اور باپ کے ہاتھ کی پشت کو تھپتھپا کر کھڑا ہو گیا۔ عادل پاشا نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے۔"

"میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔ پھر ہم دونوں مل کر ڈنر کرتے ہیں۔"

"نہیں..... تم نہیں آؤ گے..... تم بھی مجھے چھوڑ جاؤ گے سالک! مجھ سے جھوٹ مت بولو..... تم بھی عقیل مغل کے ساتھ ملے ہوئے ہو..... تم سب مل کر مجھے سزا دینا چاہتے ہو..... لیکن یاد رکھنا کہ میرا نام بھی عادل پاشا ہے..... میں نے کبھی ہار نہیں مانی..... سمجھے تم سب۔" عادل پاشا ہذیان بکنا شروع ہو گئے تھے۔ سالک بے حد دل گرفتہ ہوا۔ اس نے دکھ سے باپ کو دیکھا جو اپنے ہی بوئے ہوئے گناہوں کی فصل کو پچھتاووں کی صورت کاٹ رہے تھے۔

"مراد..... مراد....." سالک نے ان کے اٹینڈنٹ کو پکارا۔ وہ فوراً اندر کمرے میں داخل ہوا تو سالک اسے ان کے پاس رہنے اور مکمل خیال رکھنے کا کہہ کر تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے تک اس کے کانوں میں عادل پاشا کے چلانے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔

☆☆☆

دادا کے گھر کا گیٹ چوپٹ کھلا تھا اور ایک بڑا لوڈر سامنے کھڑا تھا جس میں سے چمکتا دمکتا فرنیچر مزدور بے حد احتیاط سے نیچے اتار اتار کر گھر کے اندر لا رہے تھے۔ شاویز مسلسل ان کے سر پر کھڑا انہیں بے تکی ہدایات دے دے کر کنفیوز کیے دے رہا تھا۔

"اوئے..... ادھر سے اونچا کرو..... دھیان سے پکڑو۔ اگر کچھ ہوا نا تو یہیں باندھ دوں گا تمہیں سے..... جھٹکے مت دو، ڈریسنگ کا شیشہ تڑخ جائے گا..... ابے آرام سے بے....."

تنگ آ کر دادا نے انٹری دے کر شاویز کی بے نقط چلتی زبان بند کروائی۔

"جس طرح رولا لپا ڈال کر تو انہیں جھاکے کروا رہا ہے اگر نہیں بھی کچھ ہاتھ سے چھوٹنا تو تیری بکواس نے کام دکھا دینا ہے۔ بند کر بک بک اور آرام سے لانے دے انہیں سامان۔"

"دادا آپ کو میری قدر میری شادی کے بعد آئے گی جب میں اپنی بیوی کو مستقل پیارا ہو جاؤں گا۔ دن سے رات کرنا مشکل ہو جائے گا آپ کا میرے بنا۔"

"وہ ابھی بھی مشکل ہے۔ ستی سویرے منہ اندھیرے ٹپک پڑتا ہے۔ گھر میں گھستے ہی ڈھول کی طرح بجنے لگتا ہے۔ تجھے بھی پتا چلے گا جب تو صبح صبح بیوی کی فرمائش پر باقر خانیاں لینے نکلا کرے گا۔"

شاویز نے شرماتے ہوئے دادا کی بغل میں گھسنا چاہا مگر انہوں نے پہلے ہی چھڑی کو لہرا کر اس کی گردن پر ٹکا کر اسے روک لگائی۔

"خبردار۔ میرے ساتھ چھچھورا بننے کی ضرورت نہیں..... سمجھا....."

چھٹی کا دن تھا، مومن دیر تک سوتا رہا تھا، ابھی بھی کسل مندی سے بستر پر پڑا تھا جب بھانت بھانت کی آوازیں سن کر آنکھیں مسلتا باہر آیا۔ سارا صحن نئے نکور فرنیچر سے بھرا تھا۔ ڈبل بیڈ، ڈریسنگ، الماری، صوفہ سیٹ، سینٹرل ٹیبل، خوب صورت

دیوان اور بھی چھوٹی بڑی کتنی ہی چیزیں تھیں۔ وہ حیرت سے ایک ایک چیز دیکھتا جا رہا تھا اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے دل میں اٹھتے وہم کو دباتے ہوئے دادا سے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے دادا۔ اتنا سارا سامان آپ نے کب آرڈر کیا..... اور کیوں.....؟"

"مجھے باؤلے کتے نے کاٹا ہے جو میں آرڈر کروں گا۔ میں تو خود کے لیے کفن نہ آرڈر کروں۔"

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ دادا وقت گھڑی دیکھ لیا کریں..... خدا کا نام لیں۔"

"تو میں نے کون سا غلط کہا..... بچپن سے تیرا دادا ہوں میں..... اچھی طرح جانتا ہے کہ تیرے دادے کو خرچے کے نام پر غلجان ہونے لگتا ہے پھر بھی مجھ پر اتنی بڑی تہمت لگا دی۔" دادا نے تاسف سے صحن میں بکھرے سامان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شاویز بھی موڑھا گھسیٹ کر وہیں آ بیٹھا۔ دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"ویسے دادا کیا خیال ہے لڑکی والوں سے ڈائننگ ٹیبل کی بھی فرمائش نہ کر دیں۔ اب دیکھیں نا سب کچھ آ گیا، بس وہی رہ جائے گی تو کتنا ادھورا ادھورا سا لگے گا۔"

"ویسے کہہ تو ٹھیک رہا ہے۔ ملا فون ذرا مومن کی سسرال۔ لگے ہاتھوں اس کی بھی بات کروا دوں بلکہ یہ خود ہی رعب سے ڈائننگ ٹیبل کی فرمائش کرے۔ میں تو کہتا ہوں موٹر سائیکل بھی کہہ دے مومن۔" وہ بہت بردباری سے شاویز کو جواب دینے کے بعد مومن کی طرف متوجہ ہوئے جو انتہائی افسوس اور دکھ سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے سوچ بھی کیسے لیا دادا کہ میں جہیز مانگوں گا..... اور یہ سب آپ نے لڑکی والوں سے فرمائش کر کے لیا ہے..... اُف! دادا بہت دکھ کی بات ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا اوقات دکھی ہو گی انہیں ہماری؟"

"یہی والی، جو ہے تیرے پاس سارا کچھ اوقات پڑی ہے تو وہ دکھا دیتا۔ میرے پاس یہی تھی۔ اور زیادہ فیخ غورث نہ بن..... سامان ٹھکانے لگانے کا سوچ۔ ابھی تو بہت سامان بھی آنے والا ہے۔ اوون، فرج، واشنگ شوکیس..... اور وہ..... وہ کیا کہتے ہیں شادی اسے۔"

"شرم..... شرم کہتے ہیں دادا اسے، جو اس وقت مجھے بے حد آ رہی ہے۔" مومن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بال نوچ ڈالے خود کے۔

"شرم آ رہی ہے تو شرما کے اندر بھاگ۔ یہاں کھڑا ہمیں کیوں بے شرموں کی طرح گھور رہا ہے۔ ایک تو تیری شادی نے ہلکان کر رکھا ہے اوپر سے باتیں بھی تیری سنو۔"

شاویز نے اپنا دس کلو کا سر ہلا ہلا کر دادا کی تائید کی۔ مومن تاسف سے انہیں دیکھتا پیر پٹخ کر اندر چلا گیا۔ باہر دادا اور شاویز کے سر مشورے کے لیے دوبارہ جڑ چکے تھے۔

☆☆☆

مسز راٹھور خاص ماحور سے ملنے ابرش کے ہمراہ آئی بیٹھی تھیں۔ ماحور کا مزاج ان کو دیکھ کر خاصا عجیب ہوا تھا۔ ان کا آنا اس کے لیے کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ بلاشبہ وہ بہترین عادات اور فطرت کی مالک تھیں۔ اپنے ساتھ ڈھیروں تحائف لائی تھیں جو بہترین پیکنگ میں بھی اپنی قیمت کا پتا دیتے تھے۔ وہ بے حد محبت سے ماحور سے ملیں۔ اسے گلے لگا کر اس کے اپنے گھر نہ آنے کے ڈھیروں شکوے کیے۔ ماحور شرم سے پانی پانی ہوتی رہی۔ لاؤنج میں رونق سی لگ گئی تھی۔ اتفاق سے سیف اور ریان بھی گھر میں تھے جنہوں نے انواع و اقسام کے لوازمات لا کر ان کی خاطر مدارت کے لیے میز سجا دیے تھے۔

"ماحور..... ابرش کے پاپا نے بھی تمہارے

لیے بہت سی دعائیں اور نیک خواہشات بھیجی ہیں۔ ابھی تمہاری بے حد قدر ہے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ ماحور کی وجہ سے ہماری ابرش میں خوب سدھار آیا ہے۔" ان کے ہلکے پھلکے لہجے میں کہی بات پر ابرش سمیت سب ہی ہنس دیے۔

"آپ کی مہربانی ہے مسز راٹھور، کہ آپ میری بیٹی کی اتنی پروا کرتی ہیں۔ ورنہ آج کل کے دور میں تو سگی ماں بھی دیکھ بھال سے قاصر رہتی ہے۔" نائمہ پاشا کا انداز بجھا ہوا تھا۔ نجانے کیسے کیسے قلق جاگ اٹھے تھے اب۔ مسز راٹھور نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی سی دی۔

"وقت لوٹایا نہیں جا سکتا نائمہ۔ مگر گزرتے وقت کو خوش گوار بنا کر بیتے وقت کے اثرات کو مدھم ضرور کیا جا سکتا ہے۔ ماں سے بڑھ کر مجبور رشتہ کوئی نہیں ہوتا۔ یہ ہر ہر شکل میں آزمائش کی بھٹی میں جلتا ہی آیا ہے۔"

"بہت خوب بیٹی..... بڑی پیاری بات کہی۔ میرے اختیار میں ہوتا تو تمہاری بات کو موتیوں سے تول دیتی۔" زلیخا دادی نے جذبات سے پُر بھرائے لہجے میں کہا۔ ماں تو وہ بھی تھیں۔ بڑی کڑی سزا کاٹ چکی تھیں پردیس میں۔ دل آج بھی روتا تھا۔

"چلیں آپ مائیں اپنی باتیں کریں، ہم دونوں ذرا اپنی باتیں کر کے آتے ہیں۔" ابرش اپنی جگہ سے کھڑی ہوتی ہوئی بولی، ساتھ ہی اس نے ماحور کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں اندر کمرے میں چلی آئیں۔ باہر دوبارہ سے گفتگو کا آغاز ہو چکا تھا۔ ابرش نے دروازہ بند کر دیا۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے ماہی..... شکل دیکھو ذرا اپنی۔ تمہاری شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں پاگل اور تم جیسے سوگ میں ڈوبی ہوئی ہو۔" ابرش نے تعجب کی سے ماحور سے استفسار کیا۔ جواباً اس نے اپنی روئی روئی آنکھوں کو میچ کر بالوں سے کچر نکالا، ان میں انگلیاں چلا کر انہیں دوبارہ ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی شکل میں باندھا جیسے اس سے ضروری کام اس وقت اور کوئی نہیں تھا۔ ابرش اسے گھورتی رہی یہاں تک کہ ماحور زچ ہو کر خود ہی پوچھ بیٹھی۔

"کیا ہے تمہیں..... یہاں میرا پوسٹ مارٹم کرنے آئی ہو کیا۔ مت پوچھو مجھ سے ایسے سوال جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

"کیوں نا پوچھوں۔ کیا مجھے اپنی دوست نہیں سمجھتی ہو..... یا مجھ پر اعتبار نہیں رہا؟"

"میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں، کاش دل کھول کر دکھا سکتی۔ اور اعتبار کی بھی خوب کہی ابرش۔ مجھے بس اپنی قسمت پر اعتبار نہیں وگرنہ لوگوں سے اب امید رکھنی چھوڑنا سیکھ رہی ہوں۔"

"زیادہ بک بک نہ کرو۔ دوستوں کو لوگوں میں شمار کرو گی تو خود کو خیر خواہوں سے دور کر لو گی۔ جنہوں نے تمہارے لیے اچھا سوچا اور اچھا کیا ہوا نہیں اپنے دامن سے گرد کی طرح مت جھاڑو۔"

"تو اگر تم میری خیر خواہ ہو ابرش۔" ماحور نے آگے ہو کر ابرش کے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی ہتھیلیوں میں ایک ساتھ لے کر دبائے اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ "یہ شادی رکوا دو پلیز۔ ابرش مجھے سالک پاشا سے شادی نہیں کرنی۔ اگر تمہارے دل میں اس کے لیے ذرا سی بھی محبت ہے تو اس کی شادی مجھ سے ہونے سے روک لو ابرش کیونکہ میں اسے کبھی خوش نہیں رکھ پاؤں گی۔ میں اسے شوہر کی حیثیت میں تسلیم ہی نہیں کر پاؤں گی۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا ماہی۔" ابرش بدک کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ اسے ماحور کی ذہنی حالت مخدوش لگ رہی تھی۔ "تم عین شادی سے بیس بائیس دن پہلے کون سا تماشا کھڑا کرنے جا رہی ہو ماہی..... ہوش کرو ہوش....."

"کیوں..... بس نکل گئی نا ہوا میری دوست کی۔ رائنہ کی بھی نکلی پڑی ہے۔ اب بتاؤ کہ کیا اعتبار کروں میں کسی پر....."

"ماہی۔ دوست ڈرامے کرنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ یہ ہماری اصل زندگی کا ایک روپہلا کردار

ہوتے ہیں۔ تم نے تو مجھے لگتا ہے رائنہ سے بھی لازماً ایسی ہی ڈیمانڈ کی ہوگی۔ اُف! ماہی۔ تم نے تو میرے چودہ طبق روشن کردیے ہیں۔ خوف آرہا ہے مجھے تم سے۔"

"ہاں اتنی ہی تو میں خوف ناک ہوں نا۔ رائنہ کی بچی بھی مجھ سے بات نہیں کررہی۔ اسے بھی میں نے کہا تھا کہ مجھے یہ شادی نہیں کرنی، تب سے ناراض ہے مجھ سے۔ بات تک نہیں کررہی مجھ سے۔ بس گھر آتی ہے اور زلیخا دادی کی مدد کروا کر چلی جاتی ہے۔ اچھی دوست نکلی وہ بھی....." ماحور کے لہجے میں بلا کی بیزاری تھی۔ وہ رائنہ کو مس کررہی تھی اور وہ تھی کہ دیکھتے ہی منہ پھیر کر نکل جاتی تھی۔

"بالکل ٹھیک کررہی ہے وہ ماہی۔ تمہاری جذباتیت کو کوئی کب تک پانی دے گا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ مومن کی شادی ہورہی ہے اور رائنہ بتارہی تھی کہ اس کی ہونے والی دلہن بہت بہت خوب صورت ہے۔ ماہی! وہ موو آن کرچکا یار۔"

اس بات پر ماحور کے چہرے پر کرب سا پھیل گیا۔ اس نے بمشکل اپنی آنکھوں کو بھیگنے سے روکا۔

"تم بھی اب اس بکواس ٹاپک سے نکل آؤ پلیز۔ سالک پاشا کو اپنے لیے وبال مت بناؤ۔ اس سے کھیلو مت، ورنہ خود کھلونا بن جاؤ گی۔ اب جاؤ اور سیف سے کہو رائنہ کو بلا کے لائے۔ میرے آنے کا کہے گا تو لازماً آئے گی۔"

ماحور میکانکی انداز میں اٹھی تھی کہ بیڈ پر اوندھے پڑے اس کے سیل پر کال ہوئی۔ اس نے ایک نظر سیل فون کو دیکھا اور ابرش سے بولی۔

"تم اٹھانا ذرا۔ کینیڈا سے دادی کے بیٹے کی کال ہوگی۔ آج کل سارا دن کال کرتے رہتے ہیں اور دادی بات تک نہیں کرنا چاہتیں۔ میری آواز پہچانتے ہیں، تم پک کرکے رانگ نمبر کہہ دو شاید دوبارہ نہ کریں۔" اتنا کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ بیل مسلسل ہورہی تھی، ابرش نے اوندھا پڑا موبائل اٹھایا اور کال پک کرلی۔

"جی فرمایئے..... کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟" وہ دادی کا بیٹا جان کر نارمل انداز میں مخاطب ہوئی جب اس کے کانوں میں پہچانی سی مقابل کی آواز نے سارے وجود میں بجلیاں بھر دی۔

"میں سالک پاشا بات کررہا ہوں۔ کون ہیں آپ ابرش۔"

اور ابرش کے منہ میں زبان تالو سے چپک گئی۔ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر ہی دل کی دھڑکنیں تھم گئیں۔

"ہیلو ابرش! آر یو دیئر..... ہیلو....." مکمل خاموشی پر سالک نے دوبارہ سے پکارا۔ ابرش نے تھوک نگل کر گلا تر کیا اور حواس مجتمع کرتی ہوئی بولی۔

"جی..... جی کہیے..... میں سن رہی ہوں۔"

اس نے اپنے ماتھے کو تین انگلیوں سے سہلایا۔ "لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں بات کررہی ہوں۔" دل نادان کو خوش فہمیاں ہمیشہ کیچ کرمارنی رہتی ہیں۔

"میں ماحور کی آواز پہچانتا ہوں ابرش۔" خوش فہمیوں کا قلعہ ایک جھٹکے میں زمین بوس ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں یک دم پانی سے بھر گئی تھیں۔

"اچھی بات ہے..... ماحور روم میں نہیں ہے..... ابھی آتی ہے تو میں کال بیک کرنے کا کہہ دیتی ہوں۔"

"جی ضرور۔ ویسے آپ کیسی ہیں۔ آپ کے سڈنی جانے میں تو کچھ ہی دن رہ گئے ہیں نا..... آئی گیس....."

"جی۔ جس دن ماہی کی شادی ہے اسی دن مجھے فلائی کرنا ہے۔ آپ کو بتایا تو تھا میں نے۔"

"بتایا تھا مگر یونہی دوبارہ پوچھ لیا، سوچا شاید میں غلطی نہ ہوئی ہو۔"

"نہیں سالک صاحب! آپ غلطی نہیں کرتے۔ آپ ہر معاملے میں پرفیکٹ ہیں۔ آپ کی ٹائمنگز اور سٹنگز بالکل ایکوریٹ رہتی ہیں۔" ابابچے

ہوئے بھی ابرش کے لہجے میں طنز کی آمیزش گھل گئی۔ گلے کو رندھنے سے بچانے کے لیے وہ ضبط کے کڑے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ دوسری طرف سالک پاشا کچھ دیر کے لیے مکمل خاموش ہوگیا۔ دونوں جانب چپ چھا گئی تھی۔ ایک دوسرے کی سانس کی آواز سے کال پر موجود ہونے کا پتا چلتا تھا بس۔ ابرش کو وحشت سی محسوس ہوئی اس لیے بالآخر بول پڑی۔

"میرا خیال ہے مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی سالک صاحب۔"

"لیکن اگر میں غلطی کر بھی لوں تو اسے سدھارنا تو جانتا ہوں مگر دہرانا نہیں جانتا۔ ٹیک کیئر اینڈ گڈ بائے۔"

سالک پاشا کا بے حد بھاری اور جتاتا لہجہ اس کے حواس مزید سلب کر کے خاموش ہو چکا تھا۔ وہ ساکت سیل فون کانوں سے لگائے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

سیف دادی کی دوائیاں لینے میڈیکل اسٹور تک آیا تھا جب اندر سے ہاتھ میں دواؤں کا شاپر تھامے مومن سے ٹکرا گیا۔ دونوں کافی دنوں بعد آمنے سامنے تھے اس لیے جوش سے گلے ملے۔ سیف کے چہرے پر مومن کو دیکھ کر ہمیشہ رونق سی جاگ اٹھتی تھی۔ ابھی بھی طبیعت ایک دم ہشاش بشاش سی ہوگئی۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ کر مومن اسے پیار سے گال پر چپت لگاتا ساتھ لیے چائے پینے کھوکھے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں دونوں اپنی اپنی پینٹ کی پاکٹس میں ہاتھ گھسائے دھیمی چال سے قدم اٹھاتے چپ چاپ چل رہے تھے۔

"لگتا ہے جونیئر کے پاس بات چیت کا کوٹا ختم ہوا پڑا ہے۔" مومن اس کی عادات میں اپنی جھلک ہونے کی بنا پر اسے جونیئر کہا کرتا تھا۔

سیف اس کی بات سن کر مسکرایا اور پاؤں سے راستے میں پڑے پتھر کو ٹھوکر سے پرے اچھالتے ہوئے بولا۔

"مومن بھائی زندگی ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں چپ رہوں تو سوچ گلے لگتی ہے بولوں تو زبان پر چھالے پڑتے ہیں۔"

"او میرا شیر۔ فلسفی ہوگیا تو تو۔" مومن نے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا مگر سیف سنجیدہ تھا۔

"فلسفی نہیں ہوا، زندگی کو سمجھنا شروع ہوگیا ہوں۔ خیر جانے دیں۔ آپ اپنی سنائیں، سنا ہے شادی کر رہے ہیں؟"

"دادا کروا رہے ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔ ہو تو رہی ہے نا۔"

"ہاں ہو تو رہی ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں سیف۔ تم سے اس سے زیادہ کچھ بھی کہنا نامناسب ہوگا کہ ماحور کی بھی اسی میں بھلائی ہے۔"

"اپیا کی بھلائی کا ٹھیکا کسی اور نے لے لیا..... ٹینشن ناٹ....." سیف کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اور اس نے ایک آنکھ میچ کر اپنی زبان دانتوں میں بھی دے لی تھی۔

"کیا مطلب اس بات کا سیف..... کس نے لے لیا اس کی بھلائی کا ٹھیکا۔ کیا کہنے لگے تھے سیف..... بولو....."

"کچھ خاص نہیں مومن بھائی۔" مومن کی بے چینی دیکھ کر سیف نے رسان سے کہا۔ "سالک بھائی نے اور کس نے۔ آخر اپیا سے شادی کر رہے ہیں تو اب سے ان کی تمام ذمہ داریاں بھی تو انہی کی ہیں۔"

"ہاں یہ سچ کہہ رہے ہو۔ میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ اب ماحور کی ہر ذمہ داری سر سالک کی ہے۔" اس کا لہجہ ایک دم بجھ گیا تھا۔

اب تک لاشعوری طور پر وہ ماحوز کے لیے حفاظتی خول بنا ہوا تھا۔ اس کی ہر مشکل اور ہر مصیبت کو فیس کرنے کی عادت ہو چکی تھی اسے۔ ایسے میں

اچانک سے اس کی من پسند ذمہ داری کسی اور کے نام تفویض ہونے جا رہی تھی تو دل میں لجانے کیوں بگولے اٹھنے لگے تھے۔ سیف نے مومن کا اترا ہوا چہرہ کن انکھیوں سے دیکھا اور بات بدلنے کی غرض سے پوچھا۔

"آپ کے زخم کیسے ہیں اب مومن بھائی۔"

"ہرے ہیں۔"

"ہرے وہ کیوں۔ کیا ڈاکٹر کو نہیں دکھا رہے باقاعدگی سے۔"

"نہیں۔ جس کے پاس میرا علاج ہے وہ طبیب میری پہنچ سے باہر ہے۔"

"اب آپ قلفے کا بگھار لگا رہے ہیں مومن بھائی۔"

"اچھا واقعی ـــ چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ کڑک سی چائے پیتے ہیں۔"

وہ چائے کے کھوکھے تک پہنچ چکے تھے۔ مومن اس کے کندھے پر بازو پھیلائے پہنچ کی جانب بڑھا۔ چائے پیتے ہوئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے بھی سیف کے چہرے پر معنی خیز تاثرات موجود رہے تھے۔

☆☆☆

سارا گھر ایک دم سے نیا ہو گیا تھا۔ ہر کمرے کا نقشہ بدل گیا تھا۔ مومن کا بیڈروم تو نئے فرنیچر سے سجا ہی تھا، باقی کے کمروں میں بھی نیا گھر فرنیچر اور کچن میں نئے برتن اور الیکٹرک کا ساز و سامان بہار دکھا رہا تھا۔ دادا بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے۔ شاویز کی مدد سے پوزیشنیں کرنے کے بعد وہ صحن کے وسط میں کرسی رکھے ناقدانہ نگاہوں سے اطراف میں دیکھ رہے تھے۔ مومن کی شادی ان کی باقی رہ جانے والی مختصر زندگی کا طویل ترین خواب تھی۔ جو وہ اب دیکھ رہے تھے جب ابھی مومن کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ تبھی بھار وہ تصور کیا کرتے کہ مومن کی اولاد کو جب وہ باہوں میں لیں گے تو کیسا محسوس کریں گے۔ کیا انکی اس تمنا سے بھی زیادہ خوشی ملے گی جب انہوں نے پہلی بار مومن کو اپنی باہوں میں لیا تھا۔ جواب اثبات میں ملتا تھا۔ ان احساسات کو ماپنے کا کوئی پیمانہ بنا ہی نہیں۔

شاویز کچن میں گھسا بڑے ذوق و شوق سے نئے چولہے پر چائے بنا رہا تھا۔ انداز میں اعتماد کے باعث اس قدر نزاکت تھی کہ اسے خود پر کسی ناز نخرے کا گمان ہو رہا تھا مگر کیا کرتا کہ دادا نے کھوکا کر اسے بھیجا تھا کہ اگر ایک چھینٹ بھی چولہے پر پڑی تو تین لٹوں کو تیلی لگا دوں گا۔ آج کل وہ اس کے لئے ہیرو کٹ سے بڑا خار کھا رہے تھے۔ گردن کو چھوتے اور چہرے پر آتے لمبے گھنے سیاہ بال دیکھ کر دادا کو طغیان ہونے لگتا تھا۔

اس نے احتیاط سے چائے نئے مگوں میں ڈالی اور ٹرے میں رکھ کر ایک جھٹکے سے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے پھینکا اور ٹرے تھامے باہر آ گیا۔ عصر کے بعد کا وقت تھا اور دھوپ ڈھل رہی تھی مگر صحن کے کافی حصے میں ابھی دھوپ پہنچ رہی تھی۔ دادا بھی آنکھیں موندے، چہرہ دھوپ کی جانب اونچا کیے مزا کشید کر رہے تھے جب شاویز نے ٹرے تپائی پر رکھ کر انہیں پکارا۔

"لیں دادا چائے۔ کیا یاد کریں گے نئے چولہے پر کیسی شاندار چائے بنا کر لایا ہوں۔ نئی نئی سی۔"

دادا نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں تو سامنے بالوں سے چہرہ ڈھانپے ڈائن دیکھ کر اپنی جگہ سے ایک فٹ اچھل پڑے۔

"اللہ اکبر..... استغفراللہ..... یااللہ رحم....."

ان کے یوں اچھلنے پر شاویز بھی ڈر کر اپنی جگہ سے کھسک کر پرے ہوا۔

"کک..... کک..... کیا ہوا دادا۔ کیوں ڈرا رہے ہیں.....؟"

"میں ڈرا رہا ہوں.....؟ دل میرا اچھل کر حلق میں آ گیا بن مانس کی اولاد اور تو کہہ رہا ہے کہ ڈرا کیوں رہے ہیں۔ شاویز تیرے یہ چائے (بال)

ٹ سیٹ کر کیاری میں لگا دیتے ہیں۔ کالی ترئی تو
ی خا آئے گی بے حیا۔"
شاویز کو صورتحال سمجھ میں آئی تو سانس خارج
کرتا پرسکون ہو کر دوسری کرسی پر ٹک گیا۔
"دادا۔ آفرین کو پسند ہے یہ ہیر کٹ۔ وہ تو
کہتی ہے کہ میں پرانے زمانے کا ہیرو لگتا ہوں۔"
"سلطان راہی کی وگ بالکل ایسی ہوتی تھی یا
پھر میں ایک ملنگ ہمارے ہاں آتا مانگنے آیا کرتا
تھا اس کے بال ہو بہو ایسے ہوا کرتے تھے.....
ہونہہ..... بڑا آیا۔ آفرین کو پسند ہے۔ جتنی موٹی اس
نالائق کو عینک لگی ہوئی ہے اسے تیری بوتھی ہورے
کیے دکھ جاتی ہے جو مینڈھیاں بنانے کے لیے بال
رکھوا دیے۔"
اس بات پر تسلی سے چائے کا گھونٹ بھرتے
شاویز کو اچھو لگتے لگتے بچا۔ اپنا آپ "کریں کیل"
جیسا لگا جو لگنے میں اسے ہرگز دلچسپی نہیں تھی۔ اس
نے دادا کا موڈ فریش کرنے کے لیے کہا۔
"بس دادا مومن کی شادی تک کے لیے ہیں۔
شادی گزرتے ہی کٹوا دوں گا۔"
"ان بوددں کو کسی سیانے بچے نے ہاتھ میں
پکڑی مہندی کی پلیٹ اونچی کر کے موم بتی دکھا دی نا
تو تیری کھوپڑی آپوں آپ ہی انار بن کر جل جانی
ہے۔ تیرے جیسے ہوتے ہیں جو عین خوشی کے موقع پر
ایسا کوئی پوا ڑہ ڈال کر "سبز قدم" کہلواتے ہیں۔"
دادا اور شاویز کی تکرار بڑھی اور گیٹ کے پار
سنائی دینے لگی۔ گھر میں داخل ہوتے مومن نے
اپنے دونوں ڈیلے گھما کر خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش
کی اور سلام کر کے اندر کمرے کی جانب بڑھنے لگا تھا
کہ دادا نے آواز دے دی۔
"کدھر شہزادے..... تم تو ہمیں شادی سے
پہلے ہی منہ لگانا چھوڑ گئے ہو، بعد میں تو پہچانو گے بھی
نہیں۔"
"دادا۔ بات وہ کیا کریں جو ہوئی ہو۔ آپ
جانتے ہیں مجھے اچھی طرح سے۔ میری شادی اپنی
مرضی سے بھی ہو رہی ہوتی تب بھی میں مجنوں نہ
ہو جاتا، اب تو معاملہ ہی بس خانہ پری کا سمجھیں۔"
وہ نجانے کیوں چڑ رہا تھا۔ گھر اتنا زیادہ سج گیا
تھا سامان سے کہ پرایا پرایا لگنے لگا تھا۔ آنے والی
سارے گھر میں چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ فرار
کی سب راہیں مسدود ہوتی جا رہی تھیں لمحہ بہ لمحہ۔ دادا
کو اسے دیکھ کر ہنسی آ گئی تو وہ اور زیادہ چڑ گیا۔ خود کو
بمشکل کچھ کہنے سے روکا اور اندر جانے لگا تو دادا کی
ٹوک نے دوبارہ اس کے قدم جکڑے۔
"خانہ پری نہیں پتر۔ وہ اتنی دھان پان سی
نہیں کہ ایک خانے میں سما جائے۔" دادا اور شاویز
ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے تو مومن کی
آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھٹنے کو آ گئیں۔
"کیا مطلب ہے دادا؟ کیا موٹی ہے
بہت..... خدایا! آخر کہاں پھنسا مارا ہے آپ نے
مجھے.....؟"
"اب تجھے کہیں نہ کہیں تو بیاہنا تھا نا
مومن..... لڑکی ہے تو کچھ موٹی....." انہوں نے اپنا
کان کھجایا۔ "اچھا کچھ نہیں کافی موٹی ہے..... لیکن
خاندان اچھا ہے..... یہ بس اپنی ماسی شوکت کی
کاربن ہی سمجھ لے تو، لیکن خاندان اچھا ہے.....
سارے گھر میں چلتی پھرتی اے دا دکھائی دے گی
لیکن خاندان اچھا ہے۔ رنگ بھی نیالا ہے تو اچھا
ہے نا، کسی کی نظر ہی نہیں لگنی لیکن....."
"خاندان اچھا ہے۔" مومن جھنجلایا ہوا بیچ
میں سے ہی بات اچک کر بولا۔ "خاندان کو چاٹوں گا
کیا۔ دادا آپ نے میرے ساتھ کیسا ظلم کیا ہے۔
میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ آج امی ہوتیں
تو آپ سے پوچھتیں۔"
وہ حقیقتاً دل گرفتہ ہوا تھا۔ ماحور سی تو کوئی بھی
نہیں ہو سکتی تھی وہ ایک ہی تھی مگر اب جب کسی
کھونٹے سے دادا باندھ ہی رہے تھے تو اس کے دل
کے کسی کونے میں یہ خواہش ضرور تھی کہ ایسی تو ہو جو
اسے ماحور کو بھولنے میں مدد دے، اسے اپنی محبت

سے باندھ لے اور اس کے دل میں نقش ماحور کی چاہت دھندلا جائے۔ مگر دادا نے تو اسے کالے پانی کی سزا سنا ڈالی تھی۔

وہ پیر پٹختا اندر کمرے میں چلا گیا اور دھم سے دروازہ مارا۔ شاویز نے چھچھوری لڑکیوں کی طرح دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر زناکت سے کمر لچکائی۔

"مجھے تو ہمیشہ سے شک تھا کہ تیرے میں کوئی نا کوئی کسر ہے۔ تیرا سسٹم بگاڑ کا شکار ہے۔"

دادا کی چوٹ پر شاویز کھسیا کر رہ گیا۔ اس کی ایکٹنگ اسی کے گلے پڑ گئی۔ وہ شرافت سے کرسی پر ٹک گیا۔

"سوچ رہا ہوں کہ تیرے بیڈ روم کو مرچوں والی لائٹوں سے سجاؤں اور تیری مسہری بھی مرچوں سے بھر دوں..... کیا کہتا ہے مومن؟" دادا نے اونچی آواز میں ہانک لگائی تاکہ بند کمرے میں کڑھتا مومن سن لے۔ جواب میں کوئی چیز زوردار آواز کے ساتھ فرش پر پھینکی گئی تھی۔

☆☆☆

آج بڑے دن بعد وہ اکیلی گھر سے بنا بتائے نکلی تھی۔ رائنہ کو بھی ساتھ لینے کو دل نہیں کیا۔ دل میں اس کے لیے بھی اس قدر گلے تھے کہ اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی مبادا کوئی سخت بات نہ منہ سے نکل جائے آخر کو رائنہ وہ ہستی تھی جس نے اسے ہر طرح کی پوزیشن میں سپورٹ کیا تھا۔ مگر اب تو آنکھیں ماتھے پر رکھے اسی کے سامنے بے رخی سے دندناتی اسی کی شادی کی تیاریوں میں مشغول دکھائی دیتی تو اس کا خود پر سے اختیار ختم ہونے لگتا۔

امی کے آجانے سے گھر کے کونے کونے میں رونق بھر گئی تھی۔ ہر طرف سے سارا دن امی امی کی آوازیں آتی رہتیں۔ کوئی اس کی حالت کو نوٹس بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ اداس کیوں ہے، وہ روئی روئی سی کیوں ہے، وہ سر درد کا بہانہ کر کے بستر میں کیوں پڑی ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا اور اس بات کا اسے دکھ بھی تھا۔ سیف جو اس کے پل پل سے باخبر رہا کرتا تھا اور اپنی بھی ایک ایک بات اسے بتاتا تھا، یک دم اس سے لاتعلق سا ہو گیا تھا۔ عمران بہن بھائیوں کے لیے جان مارتی تھا محنت کی تھی۔ اب اسے دیوار سے لگا کر بیٹھیں بیچ محفل جمائے بیٹھے ہوتے تو اذیت جاتی۔ مانا اس کی ضرورت نہ سہی کسی کی حیثیت تو تھی۔ اس لیے وہ بنا کسی کو بتائے نکل کر وہ تمام راستے ماپتی پھری جن پر وہ سنگ چلی تھی۔ وہ پارک جہاں وہ دونوں بیٹھا کرتے تھے، وہ شاپ جہاں سے مومن نے اسے دلوائے تھے، وہ سڑک جہاں اس نے اور مومن نے شاپو کھیلا تھا۔

وہ ہر جگہ پر بے مقصد پھرتی پھراتی نہر کنارے آ بیٹھی۔ یہ نہر اس کی اور مومن دونوں کی پسندیدہ تھی۔ ابھی سورج ڈوبنے میں خاصا وقت تھا پھر بھی پانی کی گود میں اس کا عکس خاصا بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ دھوپ بڑی مسحور کن تھی۔ وہ نیم نم سی گھاس پر سورج کی سیدھ میں آ بیٹھی اور چہرہ اونچا کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ نرم گرم سی دھوپ نے اس کے گالوں کو سہلانا شروع کیا تو سکون سا سارے وجود میں سرایت کر گیا۔ زندگی میں اچھا ساتھ بالکل سرما کی دھوپ کی طرح ہوتا ہے، جاں فزا اور دل ربا۔ سکون کی ردا اوڑھا کر میٹھی نیند سلانے والا۔

کچھ ہی فاصلے پر درخت تلے ایک پینٹر پریکٹس لگائے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا سالک بانو حیرت سے اس اتفاق کو دیکھ رہا تھا جو اس کے دل کی خواہش کے عین مطابق ماحور بھی وہاں آموجود ہوئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسی کے متعلق خوش آئند خیالات میں گھرا تھا اور اب اس دودھ اور کانچ سے بنی مورت کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر دل بے اختیار ہوا جا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھا اور چلتا ہوا ماحور سے ذرا سے فاصلے پر آ بیٹھا۔ قریب سے اسے دیکھنے کا احساس بے حد اچھوتا تھا۔ وہ کتنے ہی پل یک ٹک جھپکے اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ماحور کو بھی اس

کی گرفت نے آنکھیں کھول کر اطراف میں دیکھا پھر کروٹ لی۔ اپنی بائیں جانب نگاہ ڈال کر پھر دائیں جانب کروٹ لی۔ دائیں جانب دیکھا، پھر بائیں جانب کا جائزہ لیا۔ پھر بے زار سا ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ ایسے شوق سے اسے دیکھ رہا تھا، کوئی اور ہوتی تو خوش ہوتا۔ ناچاہتے ہوئے بھی اسے غصہ سا ہو گیا۔

اس وقت وہ موسن کو سوچ رہی تھی، کیا ردعمل ہو اس شخص کا اگر اسے پتا چلے کہ اب سے دو ہفتے بعد ہونے والی اس کی بیوی بننے والی ہے وہ اپنے پچھلے منگیتر کی یاد میں آہیں بھرنے کو یہاں بیٹھی ہے؟ پہلی بار اسے سالک سے تھوڑی سی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ مگر وہ بھی کیا کرتی، موسن کو بھلانا اس کے اختیار میں ہوتا تو اس کی تمام تر روی اور بے اعتنائی کے بعد وہ اسے یاد کرتا تو دور کی بات، اس کا تصور بھی اپنے دل و دماغ سے کھرچ ڈالتی مگر۔۔۔۔

"سوری۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ ویسے میں آپ سے پہلے کا یہاں آ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بار موسن تراب کے ساتھ آیا تھا یہاں تو اچھی لگی تھی یہ جگہ۔"

اس نے بلاوجہ صفائی دی۔ جواباً ماحور نے سپاٹ تاثرات کے ساتھ اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی تھی اور واپس سامنے نہر کے پانی کو دیکھنے لگی تھی۔ سالک پاشا نخص ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ نجانے یہ لڑکی کب پگھلنے والی تھی، پگھلتی بھی یا نہیں کون جانے۔

"ماما کیسی ہیں؟" اس نے ناصمہ پاشا کے متعلق سوال کیا مگر پھر ماحور کے ماتھے پر پڑنے والے بلوں کو دیکھ کر سوال کا انداز بدلا۔ "میرا مطلب تھا آپ کی امی کیسی ہیں۔۔۔۔ اور گھر میں باقی سب لوگ کیسے ہیں؟"

"آپ کا سیل فون کہاں ہے؟" ماحور نے سنا ہی نہیں تھا جیسے الٹا سوال پوچھا تھا۔ سالک نے ہیلمٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ہی ہے۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔ کیا کال کرنے کے لیے چاہیے آپ کو؟"

"جی نہیں۔ مجھے نہیں چاہیے۔ آپ کو یاد کروانا ہے کہ آپ کے پاس میری امی اور گھر والوں سے رابطے کا ذریعہ موجود ہے تو ان کا حال احوال بھی معلوم کر لیجیے نا۔" اس نے پھیکے لہجے پر سالک پاشا کھسیا سا گیا مگر پھر بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ اس کے اس لب و لہجے پر ہی تو نثار تھا۔

"اچھا چلیں شادی کی تیاریاں کیسی جا رہی ہیں۔ اب ایٹ لیسٹ یہ تو بتا دیں کی کہ کہیں۔"

"نہیں۔ کیونکہ میں کر رہی نہیں تو بتاؤں کیا۔۔۔۔ جو کر رہے ہیں، یہ سوال بھی آپ کو انہی سے پوچھنا چاہیے۔"

"کیوں۔ آپ کیوں نہیں کر رہیں ماحور۔ شادی آپ کی ہے تو تیاری میں حصہ تو لینا چاہیے نا۔ روز روز تو نہیں آتے یہ مواقع زندگی میں۔"

"پہلی اور آخری بار کا آنا ہی جان پر بنا ہو تو کون کافر روز روز کا مرنا مانگے گا۔" ماحور کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اور سالک پاشا کے چہرے کی رنگت یک دم ماند پڑی تھی۔ وہ خاموش ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ ماحور کو اپنے اوپر افسوس ہوا تھا۔ اسے اس حد تک روڈ ہو کر بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ موسن کا غصہ وہ ہر ایک پر اتارتی پھرتی تھی آج کل۔

"آئم سوری۔ وہ اصل میں طبیعت کچھ اچھی نہیں تو بس منہ سے بھی الٹا سیدھا نکل گیا۔۔۔۔ آپ پلیز برا نہ منائیے گا۔۔۔۔ میری عادت سی ہے یوں اول فول بک جاتی ہوں اور پھر پچھتاتی ہوں۔" وہ سچ میں شرمندہ تھی۔ اس کی پنچائی نیلی سبز آنکھوں میں پانی کا عکس جھلملاتا اس قدر منفرد لگ رہا تھا کہ سالک چند پل۔ کو بالکل کھو سا گیا۔ بمشکل اس نے نگاہ پرا کر لہجے کو نارمل بناتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہو جاتا ہے۔ آخر چند دن بعد آپ اپنی فیملی سے دور ہو جائیں گی، اداسی تو ایک بات ہے فکر بھی ہو گی مگر یہ ہوتا تو ہے ہی۔۔۔۔ آپ کو

شادی تو کرنی ہی ہے — ہر حال میں کرنی ہے ماہ۔" اس کا لہجہ حتمی ہوتا یک دم سرسراہٹ میں بدلا۔

ماہور کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس نے چونک کر سالک پاشا کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر فوراً نگاہ چرا گئی۔

"اپنی شادی کی تیاری دل سے کیجیے ماہور — ورنہ آپ جیتا بچتا نہیں گی۔"

ماہور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے سالک پاشا سے عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ تو کیا جن باتوں سے رائحہ اسے ڈراتی تھی وہ سچ ہونے والی تھیں۔ سالک پاشا کو وہ واقعی انڈر اسٹیمیٹ کر رہی تھی کیا؟

"میں چلتی ہوں۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"میں چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ میری ذمہ داری ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر راستے میں مجھے ٹیلر کے پاس رکنا ہے اور پھر ایک چکر پارلر کا لگانا ہے۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ کافی دیر ہو جائے گی۔" وہ نیم ہکلاہٹ میں اوندھے سیدھے بہانے تراش رہی تھی جن پر بہر حال اسے عمل نہیں کرنا تھا مگر سالک پاشا سے جان چھڑانے کا اور کوئی طریقہ اسے سوجھ نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ جائیے۔ مگر احتیاط سے۔ بس چند دن کی بات ہے پھر آپ کو اپنے ہسبنڈ کی اجازت درکار ہوا کرے گی۔" سالک نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا مگر ماہور کو لگا اس نے جتایا ہے۔ وہ خدا حافظ کہتی فوراً وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ سالک کی گہری نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ اس کا ہر عکس وہ اپنی پتلیوں میں قید کرتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

گھر کے پورچ میں گاڑی کے رکتے ہی گارڈ تیزی سے اس تک پہنچا تھا۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا اور پریشان بھی۔ سالک فوراً گاڑی سے اترا۔

"سر۔ بڑے صاحب کی طبیعت [illegible] ہے۔ وہ تو کروں پر بھی چلا رہے ہیں [illegible] اپنے اٹینڈنٹ کو بھی واز خینچے مارا [illegible] پریشان سا لاؤنج میں بیٹھا ہے کب سے [illegible]

"تو تم نے مجھے کال کیوں نہیں کی؟ [illegible] بار بولا ہے کہ ابی کی طبیعت خراب ہونے [illegible] مجھے اطلاع کرو۔" اس نے کہتے ہوئے [illegible] اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

"کیا تھا سر۔ پر آپ کا موبائل [illegible] گارڈ اس کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا بولا تھا [illegible] کہ نہر پر جانے سے پہلے ہی اس نے [illegible] آف کر دیا تھا۔ وہ کچھ وقت بالکل [illegible] تھا۔

سر جھٹک کر وہ لابی میں داخل ہوا تو [illegible] چیخنے چلانے کی آوازیں ان کے کمرے سے [illegible] آ رہی تھیں۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی [illegible] اٹینڈنٹ فوراً اس کی جانب لپکا۔

"سوری سر۔ مگر میرے پاس یہاں بیٹھنے [illegible] علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ سر بہت ہائپر ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی واز خینچے مارا اور [illegible] کمرے میں جانے کی کوشش کر رہا تھا اسے [illegible] نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ وہ خود کو ہی کچھ کر نہ ڈالیں۔"

"اٹس اوکے مراد۔ تم نے اچھا کیا جو [illegible] آ گئے۔ کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟"

اس نے اٹینڈنٹ کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا [illegible] اس کے نفی میں سر ہلاتے ہی وہ تیزی سے [illegible] کے روم کی۔ جانب لپکا۔ دروازہ کھولتے ہی [illegible] تیز اور اونچی آواز کانوں میں پڑی۔

"میرا تماشا دیکھنے ہو تم سب۔ خبردار [illegible] بھی میرے کمرے میں آیا تو — میں جان [illegible] ہوں۔ مجھے کوئی ہرا نہیں سکتا۔ میں اب بھی تم سب [illegible] کھینچ سکتا ہوں۔"

"ابی..... کام ڈاؤن..... ریلیکس..... یہ میں ہوں سالک۔" وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ان کے ہاتھ تھام لیے جن میں اس وقت بھی وزنی ڈیکوریشن پیس تھا جو وہ یقیناً کسی کو مارنے کے لیے تھامے ہوئے تھے۔ سالک کو دیکھتے ہی ان کے کشیدہ اعصاب قدرے پرسکون ہوگئے۔ سالک نے احتیاط سے ان کے ہاتھ سے وہ ڈیکوریشن پیس پکڑا اور اسے ٹیبل پر رکھ کر دونوں گھٹنے ٹیک کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیوں ابی..... کیوں..... آپ خود کو سنبھالیں گے نہیں تو ٹھیک کیسے ہوں گے ابی۔ خدانخواستہ کسی کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو کیا کرتا میں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں کسی اور کسی مشکل میں پڑ کر حالات کی شکل دیکھوں..... ہے نا....."

"یہ سب میرا مذاق اڑاتے ہیں سالک..... انہیں لگتا ہے کہ میں اب بیکار گوشت کا لوتھڑا ہوں جو خود سے اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا..... کیا میں واقعی بیکار ہو چکا ہوں سالک..... کیا تمہیں لگتا ہے ایسا.....؟"

ان کی آنکھوں میں وحشت ناچتی تھی۔ وہ تیز تیز سانس لیتے بالکل مخبوط الحواس انسان محسوس ہو رہے تھے۔

سالک کو ان پر ڈھیر سارا ترس آیا۔ وقت کیسے روپ کر دیا کرتا ہے کوئی ان وقت کے سورماؤں سے پوچھے۔ اس نے ان کے ہاتھوں کو چوما اور بولا۔

"ہرگز نہیں ابی۔ آپ نہ پہلے کبھی بیکار تھے نہ اب ہیں..... مگر آپ کو یہ ثابت کرنے کے لیے سیلف کنٹرول کی ضرورت ہے بس۔ خود کو سنبھالے بنا آپ کسی پر بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ اس حادثے نے آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ آپ میں اب بھی اتنی ہمت و طاقت ہے کہ آپ ہر مشکل کا سامنا کر سکیں۔" وہ انہیں کسی بچے کی طرح بہلا رہا تھا۔

"اگر میں خود کو سنبھال لوں تو نائمہ آجائے گی واپس؟"

ان کے اچانک سوال نے سالک کو لاجواب سا کر دیا۔ اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکا جہاں آس و نراس کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ ان کے ہاتھ کی پشت کو سہلاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں گویا ہوا۔

"آئیں گی..... بالکل آئیں گی..... بھلا میری شادی پر نہیں آئیں گی کیا۔ اور جب شادی پر آئیں گی نا تو ہم کوشش کریں گے انہیں منانے کی..... گھر لانے کی....." بھلے سے اب شاید یہ ممکن نہیں رہا تھا مگر باپ کی ذہنی حالت کے پیش نظر اس نے دلاسا دینا ضروری سمجھا۔ عادل پاشا کے چہرے کے تاثرات فوراً نرم پڑ گئے۔ وہ بے حد شوق سے بولے۔

"تو کر دو نا شادی..... لے آؤ نا اس بچی کو..... وہ کیا نام ہے اس کا..... ماحور..... ماحور مغل کو..... مجھے کوئی اعتراض نہیں سالک..... نائمہ جس بھی طرح سے آئے جیسے بھی کر کے آئے بس آجائے۔ اس کی بیٹی یہاں بہو بن کر آجائے تو ہم اسے بھی مجبور کر دیں گے واپسی کے لیے..... بلکہ تم اس کے باقی بچوں کو بھی لے آنا..... پھر وہ کبھی بھی انکار نہیں کرے گی..... دیکھ لینا....."

سالک کوئی جواب دیے بنا بس دھیما دھیما مسکراتا رہا۔

"اور..... اور تمہاری شادی میں تو اب بہت کم دن رہ گئے ہیں سالک۔ گھر کو سجاؤ۔ رونق لگاؤ۔ مجھ سے گھر کی ویرانی اب سہی نہیں جاتی۔"

"لگ جائے گی رونق ابی۔ ضرور لگے گی۔ بس چند دن ہی کی تو بات ہے پھر اس گھر میں آپ کی بہو ہر طرف چلتی پھرتی دکھائی دے گی۔"

"وہ مجھے معاف تو کر دے گی نا سالک؟" عادل پاشا نے امید سے مزین لہجے میں استفسار کیا۔ ان کی آنکھوں میں ناقابل فہم سا خوف بھی تھا۔

"اگر معاف نہ کرتی تو شادی کیوں کرتی؟" سالک نے بھنویں اچکا کر مسکراتے ہوئے کہا تو عادل پاشا بھی مسکرا دیے۔ اس نے ان کے ہاتھوں کو نرمی

سے دبا کر چھوڑا اور کھڑا ہو گیا۔
"میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں تب تک آپ اپنا ڈنر لیں کیونکہ آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہے اور اب آپ ہائپر نہیں ہوں گے ابی۔ مراد کو بھی پریشان نہیں کریں گے، اس کی بات مانیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری شادی تک آپ ایک دم فٹ نظر آئیں۔"
عادل پاشا نے سر دھیمے سے اثبات میں ہلا دیا۔ وہ ان کی پیشانی چومتا کمرے سے باہر آ گیا۔ مراد کو تسلی دے کر اندر بھیجا اور خود تھکا تھکا سا نڈھال وجود لیے اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

وہ اب بلا ناغہ آفس آ رہا تھا۔ فی الحال سوچوں بلکہ وحشت ناک سوچوں سے چھٹکارے کے لیے یہی ایک جائے پناہ تھی۔ حالانکہ سالک نے اسے لیو اپلائی کر دینے کا کہا بھی تھا مگر گھر میں تو دادا اور شاویز نے اس کا ناک میں دم کر کے رکھ دیا تھا۔ اتنا ذلیل دادا نے اسے گزشتہ تمام زندگی میں نہیں کیا تھا جتنا اس ایک ماہ میں کر کے رکھ دیا تھا۔ اور اوپر سے شاویز کا چھچھورا پن۔ وہ آتے جاتے اسے ایسی نظروں سے دیکھتا کہ وہ خواہ مخواہ ہی پانی پانی ہونے لگتا۔ کمرے میں گھسا رہتا تو ماحور کی یاد سکون نہیں لینے دیتی تھی۔ اس لیے آفس کا کیبن بہترین پناہ گاہ تھی۔ وہ کافی دیر فائلز میں الجھا رہا اور پھر چند ضروری فائلز لے کر سالک پاشا کے آفس کی جانب چل دیا۔ آفس کا دروازہ نیم وا تھا۔ اسے اچنبھا ہوا۔ ناک کرنے ہی لگا تھا کہ اچانک کانوں میں نائمہ پاشا کی آواز پڑی۔
"میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں بیٹا۔ آپ ہی تو وہ واحد ہستی تھے جس میں مجھے اپنے ہر بچے کی شبیہ دکھتی تھی۔ پاشا نے جو بھی کیا ہو مگر میرا اور آپ کا رشتہ ہمیشہ ماں بیٹے کا ہی رہے گا سالک۔"
"تو بیٹے سے کوئی ماں دور کیسے ہو سکتی ہے ماما۔ میں آپ کو مس کرتا ہوں..... ابی مس کرتے ہیں۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ آپ پلیز واپس آ جائیں۔"
"میں نے اپنے بچوں کے چھوٹے سال دیے سالک۔ میں ان کا بچپن دیکھ ہی نہیں پائی جبکہ ان کا باپ بھی نہیں رہا میں کیسے انہیں نظر انداز کر دوں۔ قدرت نے مجھے ایک موقع فراہم کیا ہے میں نے اس کا فائدہ اٹھا لیا۔ میری خود غرضی کو معاف دینا سالک، مگر مجھے مجبور مت کرو واپس لے لیں۔ پلیز بیٹا۔"
مومن حیرت و استعجاب میں گھرا وہیں سے سوچ کر واپس ہو لیا کہ کچھ دیر میں دوبارہ آ جائے گا۔ اپنے کیبن میں آ کر بھی وہ یکسو نہیں ہو پایا تھا۔ ہر پاشا نے عادل پاشا کا گھر چھوڑ دیا تھا، یہ جان کر وہ ششدر تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یقیناً ماحور کے گھر آ چکی تھیں۔ سیف نے بھی اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر اتنا انتہائی ردعمل کہ وہ گھر چھوڑ آئیں۔
پندرہ بیس منٹ لیپ ٹاپ پر اور فائلز میں کھپا کر وہ دوبارہ اٹھا اور سالک کے آفس کی جانب چل دیا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اب تک نائمہ پاشا جا چکی ہوں گی۔ مگر وہ لابی کا موڑ مڑتے ہی فوراً تھم گیا۔ سالک اور نائمہ پاشا آفس سے باہر کھڑے الوداعی کلمات کہہ رہے تھے۔ سالک نے عقیدت سے ان کے ہاتھ تھام رکھے تھے اور وہ بے چینی سے مسلسل نفی میں سر ہلائے جا رہی تھیں۔
"پلیز ماما۔ میری خاطر آپ کو ایسا کرنا ہو گا..... اسی میں ہم سب کی خوشی اور بھلائی ہے۔ اور اب آپ کچھ بھی نہیں کہیں گی بس جلد از جلد شادی کی تیاریاں مکمل کریں گی اور ماحور کو رخصت کریں گی۔"
"آپ مجھے کس آزمائش میں ڈال رہے ہو سالک میرے بچے۔ مجھے ماں بھی کہتے ہو اور آزماتے بھی ہو۔ کیا ماں کو اپنی اولاد کی خوشی سے بڑھ کر کچھ عزیز ہوتا ہے؟"
"اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ کو میری خوشی

وزیر ہے تو میری بات ماننی ہوگی۔"

سالک پاشا نے نرمی اور بیان سے ناعمہ پاشا کو ہاروں سے تھام کر اپنی پیشانی ان کی پیشانی سے ایک دلکش تو وہ دھیرے سے ہنس دیں۔ مومن زاب اس کی سلجھانے سے قاصر تھا۔ کچھ تو عجیب خاص سب میں۔

☆☆☆

کنداں کچیاں نے جی
پرتاں بچیاں نے.....
گوٹھے چوندے نے جی
تڑپاؤندے نے جی
کنداں کچیاں نے جی
پرتاں بچیاں نے
تینوں ہر گل دساں گے
اکھاں چے وسا کے ماہیا
تیرے نال ہی ہنساں گے
لکی خوشیاں دی جھڑیاں نے
رب نے ملائیاں جوڑیاں
اج شکناں دی گھڑیاں نے

زلیخا دادی نے محلے اور خاندان میں جن جن سے واقفیت یا اچھے تعلقات بحال تھے ان کی بچیوں کو ماہر رقص لگانی شروع کر دی تھی۔ سارے صحن میں شور تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ یہ سب بہت خوش کن ہو سکتا تھا جو اگر دل کا موسم اچھا ہوتا۔ دل میں تو ویرانی اور اداسی نے ایسے ڈیرے ڈال رکھے تھے کہ جوں جوں شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے ماحور کا دل مر جانے کو کرنے لگا تھا۔ سالک پاشا سے لاکھ خار سہی مگر وہ اس کی اچھی عادات کی بھی قائل ہو چکی تھی۔ اسے ہرگز نہ چاہتی تھی نہ اندھیرے میں رکھنا چاہتی تھی۔ کہ گہرا سے خیال آیا کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے فرحت جواب دے جاتی تھی اور اب تو بس چند ان کی بات تھی پھر ہر شے ایک مقام پر آ کر تمام عمر کے لیے ٹھہر جانے والی تھی۔ کسی بھی تعلق میں دو رشتے بے حد اہم ہوتے ہیں۔ ایک پیار کا دوسرا اعتبار کا۔ ان میں سے کوئی ایک رشتہ بھی موجود ہو تو تعلق نبھ جاتا ہے مگر اگر دونوں ہی نہ ہوں تو پنپ بھی نہیں پاتا۔

سبز اور نارنجی جوڑے میں ملبوس ماحور زردی مائل سفید رنگت لیے کافی دیر تک باہر برآمدے میں خاص طور پر سجائے گئے تخت پر بیٹھی رہی تھی۔ بلکہ رائنہ نے زبردستی ڈنڈے کے زور پر بٹھایا تھا۔ کل اس کی مہندی تھی۔ ناعمہ پاشا نے ہر ہر رسم کے لیے دن مخصوص کر دیے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ پورا مہینہ اس کے چاؤ اور شگنوں میں گزار کر اسے رخصت کرتیں۔

اردگرد اتنا شور تھا مگر اسے جیسے کوئی آواز سنائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ کانوں میں کبھی مومن تراب کی سیٹی کی آواز گونجتی تو کبھی اس کی خوب صورت مردانہ ہنسی کی بازگشت سنائی دیتی۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکے ہوئے تھی۔ نگاہیں سامنے بیٹھی لڑکیوں کے جھرمٹ پر تھیں مگر ذہن مومن کی شرارتوں اور باتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

"مومن تمہیں نہ رومینس کرنا آیا نہ ہی محبت۔ تمہیں صرف درد دینا آتا تھا اور وہی ہنر مجھ پر آزما ڈالا۔"

اس کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ کچن کے دروازے سے نکلتی رائنہ نے کن انکھیوں سے اس کی گیلی آنکھوں کو دیکھا اور تاسف سے سر جھٹکتی ہاتھ میں تھاما تھال لیے چل دی۔ اسی وقت گیٹ سے ابرش ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھامے داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر رائنہ کو تسلی ہوئی، کم از کم ماحور کا کچھ تو دل بہلے گا۔ اس سے ملنے کے بعد وہ ماحور کو اور اسے اندر کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ جاتے جاتے ابرش کے کان میں کھسر پھسر کرنا نہیں بھولی تھی۔ ماحور نے دیوار گیر آئینے میں اسے ایسا کرتے دیکھا اور سر جھٹک کر کانوں اور ہاتھوں میں پہنا پھولوں کا زیور اتارنے لگی۔ ابرش گہرے سبز رنگ کے لباس میں

غضب کی حسین لگ رہی تھی۔ ماحور نے آئینے میں اس کا عکس دیکھ کر اسے دل سے سراہا اور داد دی اس کے حوصلے کی جو اتنی بڑی چوٹ کھا کر بھی مجسم ہمت تھی۔ وہ اگر دکھاوا بھی کرتی تھی تو کمال کا کرتی تھی۔

"آخر اسے بھی تو سالک پاشا نے ٹھکرایا ہی تھا جیسے مجھے مومن نے ٹھکرا دیا۔ تو پھر میرا دل سنبھلتا کیوں نہیں۔ میری روح سے اس ہرجائی کی یاد جونک بن کر کیوں چمٹ گئی ہے۔ کاش مومن میں تمہیں کبھی ملی ہی نہ ہوتی۔ کاش تم میرے راستے میں کبھی آئے ہی نہ ہوتے۔"

وہ آئینے کو اب بے دھیانی سے دیکھتے اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ ابرش کب سے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ ماحور کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اس قدر واضح ہوتے تھے کہ دوسرا بندہ صاف سمجھ جاتا تھا کہ اس کے اندر کیسی جنگ چھڑی ہے۔

"کیوں خود سے لڑ رہی ہو ماہی۔ کتنا لڑو گی اور کب تک۔ اب ہار مان کیوں نہیں لیتیں۔ قسمت سے اچھی امید رکھو۔"

"قسمت اچھی ہو تو امید اچھی باندھوں نا۔"

"تو کیا ہے تمہاری قسمت؟"

"یوں ہی اس کی یاد میں مر جانا۔"

"یہ تمہاری قسمت نہیں، تمہاری مرضی ہے۔"

اور ماحور سناٹے میں آ گئی۔ ہاں یہ واقعی اس کی مرضی تھی۔ یہ وہ اسی کے نام کا جوگ لے کر زندگی گزار دینا چاہتی تھی۔ نہیں تھا قسمت میں تو نہ ملتا مگر اسے تو کسی کے ساتھ نتھی نہ ہونا پڑے۔ اسے تو دل میں کسی کی تصویر سجائے پیشانی پر کسی اور کے نام کی بندی نہ لگائے نہ گھومنا پڑے۔

"دیکھو ماہی۔ زندگی گزارنے کے لیے طور طریقوں میں لچک ہونی چاہیے۔ نفع نقصان دیکھنا چاہیے۔"

"یہ تو خود غرضی ہوئی۔"

"نہیں یہ معاملہ فہمی ہے۔ مصلحت اندیشی ہے۔"

اور ہاتھ میں تھامے پھولوں کے [illegible] چمرا کر رکھ دیے۔ وہ [illegible] کر اس کے پاس آئی اور اس کا [illegible] کے گلے سے لگا لیا۔ اسے گلے لگاتے ہی ابرش راٹھور کی بھوری آنکھوں کے کونے [illegible] سے بھر گئے۔

☆☆☆

سارے صحن میں ہر طرف مہمان ہی [illegible] بھرے ہوئے تھے۔ گیٹ سے اندر آتے ہی [illegible] بچھی ہوئی تھی جس پر خاندان کے [illegible] (مومن کے لیے) براجمان تھے۔ اس سے [illegible] تین چار چارپائیاں تھیں۔ برآمدے میں [illegible] تھیں ہی اور کرسیوں کا رش الگ لگا تھا۔ کچھ [illegible] تھے۔ تین چار پائیاں خواتین نے قبضے میں [illegible] تھیں اور بقیہ پر مرد حضرات تھے۔ بچے آگے [illegible] کرسیوں کو ریل گاڑی بنائے گھسیٹتے ہوئے [illegible] رہے تھے۔ شور و غوغا ایسا غضب کا تھا کہ مومن کو [illegible] کسی پاگل خانے میں آ گیا ہے جہاں سب ایک دوسرے کو "پاگل ای اوئے" کہتے ہنس رہے ہیں۔ ایک پل کو تو اس کا دل کیا واپس ہو لے مگر پھر [illegible] جالی والے دروازے میں کسی بوڑھی سی خاتون کے ساتھ ٹھٹولیاں کرتے دادا نے اسے دیکھ کر دور سے [illegible] ہانک لگائی۔

"لودی بزرگو۔ لاڑا آ گیا ہے۔"

اور آدھے سے زیادہ مہمان اس کی طرف یوں لپکے جیسے بازار میں پبلک پاکٹ مار کی جانب [illegible] ہے۔ کوئی اسے کہیں سے کھینچ رہا تھا تو کوئی کہیں سے نوچ لینے کے درپے تھا۔ دادا نے سب کے چنگل سے چھڑوا کر خود ہی باری باری تعارف کروانا شروع کیا۔ ڈھیروں رشتے کے ماموں اور چاچے بھتیجے کے رشتے کے دادا اور نانا اس کی طرف آیا تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اللہ جانے کون سی اینٹیں اکٹھی کر [illegible] اتنے رشتے دار نکال لائے تھے۔ جنہیں اس

کے کان میں بڑبڑایا۔
"دادا۔ یہ سب کیا ہے دادا۔ کون ہیں یہ سب۔ کہاں سے آئے ہیں یہ سب؟"
"اپنے گھروں سے آئے ہیں یہ سب۔" دادا کی یہ ترکی جواب۔
"تو انہیں واپس ان کے گھروں میں بھیج دیں نا۔"
"لے۔ ابھی سے ایویں۔ ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔"
"پارٹی نہیں دادا..... پارٹی۔" اس نے بوکھلا کر تصحیح کی۔ شکر تھا کہ شور اس قدر تھا کہ ان کی بات کوئی جتن کر کے بھی سن نہیں سکتا تھا۔
"جب اتنے لوگوں کی سچ مچی ہونا تو وہی کہتے ہیں جو میں نے کہا۔" دادا اپنی ہی بات کا لطف لیتے ہوئے جی کھول کر ہنسے۔ مومن نے سر جھٹکا اور شاویز کا پوچھا۔
"وہ شتو گڑا چھت پر ہے۔ لائٹیں لگوا رہا ہے۔ چل آ تجھے تیری دادی کے بھائی سے ملواؤں۔ پاگل ہی سمجھا ہے۔ بڑی اوتری آئٹم ہے۔"
"دادا..... بری بات..... مہمان ہیں اور دادی کے بھائی ہیں۔"
"جب ہی تو کہا پاگلا۔ چل آ۔" وہ ایک بار پھر ہنسے اور اسے لیے ایک چارپائی پر بیٹھے سختی سے بزرگ کے پاس لے آئے جن کو موٹے موٹے تکیوں والی ٹیک لگی تھی۔ دادا نے اپنی چھڑی کے زور پر ذرا سا جھک کر انہیں کہا۔
"او بوتس۔ اس سے ملو۔ میرا پوتا۔"
"کیا دھوتا؟" ان بزرگ نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اونچا سا کہا تو دادا ایک بار پھر ہنس ہنس کر بے حال ہوئے۔ مومن کو اب سمجھ میں آیا کہ وہ انہیں آئٹم کیوں کہہ رہے تھے۔
دادا نے دوبارہ اونچی آواز میں دہرایا۔
"دھوتا نہیں پوتا..... پوتا۔"
"کتا..... کہاں ہے کتا.....؟"

"آ کے ملواتا ہوں تجھے کتے سے۔"
اور دادا ہنستے ہوئے اسے کچھ فاصلے پر لے آئے۔
"کتنی بری بات ہے دادا۔ کسی کو تو بخش دیا کریں۔"
"میرا دادا نہ بن۔" وہ اسے مصنوعی گھرکتے ہوئے بولے ورنہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں لال انار ہوئے جا رہے تھے۔ اتنے میں شاویز ہانپتا ہوا چھت کی سیڑھیاں اتر کر سیدھے ان کے پاس آیا۔
"دادا..... لگ گئیں سب لائٹیں۔ بس اب مومن کے کمرے کو سجانا ہے اور نیچے یہ صحن رہ گیا ہے۔"
"کوئی ضرورت نہیں میرے کمرے میں گند مچانے کی۔ ایسے ہی رہنے دو۔ مجھے نہیں پسند یہ سب کچھ۔" مومن بیزار سا ہو کر بولا۔ نجانے دل کو کیوں دھکے لگے ہوئے تھے۔
"ایویں ضرورت نہیں۔ اور تیرے بوتھے نے تو ایسے ہی سوجے رہنا ہے۔ اب جو مسکین تیرے لیے لا رہا ہوں، اس کے بھی دل کے ارمان ہیں کہ نہیں۔"
"ہر ارمان پورا ہو جائے تو رونا کاہے کا ہو۔"
"پتر جب وہ آئے گی تو خود ہی سب ارمان جاگ جائیں گے۔ وہمی چیز ہی ایسی ہے۔"
"تو آپ لے آتے نا اپنے لیے..... وہمی۔"
مومن غصہ ضبط کر رہا تھا۔ ورنہ دل تو سب کچھ ملیا میٹ کرنے کو کر رہا تھا۔
"دادا کو کس نے دینی تھی یار۔ نہ منہ میں دانت نہ سر پر بال۔ نظر انہیں ٹھیک سے نہیں آتا۔ چلتے بھی چھڑی پکڑ کر ہیں۔ تم بھی حد کرتے ہو مومن۔"
شاویز نے بے چارے سے لہجے میں کہتے ہوئے دادا کا کندھا یوں تھپتھپایا جیسے تسلی دے رہا ہو۔ دادا نے پلٹ کر ایک چماٹ گدی پر دھری اور دبنگ لہجے میں بولے۔
"آج بھی فضل تراب میں اتنا دم خم ہے کہ تجھ

جیسوں کو دھول چٹا سکوں..... سمجھا..... بڑا آیا میرے دانت اور بال گنوانے والا۔ چل نکل ادھر سے اب۔ باقی کی لائنیں بھی لگوا کر کام ختم کر ورنہ تیرے منہ کی حق گل کر دوں گا۔ اس کے بعد مہمانوں کے رات کے کھانے کا بندوبست بھی کرنا ہے۔"

شاویز گردن سہلاتا ہوا وو فٹ پرے ہو چکا تھا۔ دادا کے ہاتھ کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتا فوراً رفو چکر ہو گیا۔ مومن سامنے دیوار کو تکتا نجانے کیا سوچے چلا جا رہا تھا، اسے بھی دادا گھرکتے ہوئے بولے۔

"اور تو..... چپ کر کے یہیں کسی کے پاس ٹک کر بیٹھ جا۔ جب تک شاویز کمرہ سجا نہیں لیتا یہاں سے اٹھنا مت..... سمجھ گیا..... بڑا آیا مانی شکل بنا کر گھومنے والا۔ شادی کروا رہا ہوں کوئی بلی نہیں دے رہا تیری..... سمجھا....." سینہ اکڑا کر دادا آگے بڑھ گئے اور مومن بے دھیانی میں یونس نانا کے ساتھ ہی آ بیٹھا۔ یونس نانا نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنایا اور کان پھاڑ آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"مومن۔" اس نے بھی گلا پھاڑ کر جواب دیا۔

"دومن۔ کیا شے؟" یونس نانا نے کان قریب کیا

"آنا۔" اس نے جان چھڑائی۔

"کس نے کانا؟"

"جوتے نے۔"

"کتے نے؟ چودہ ٹیکے لگیں گے۔"

"یا اللہ۔" مومن نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ یونس نانا دوبارہ سے کچھ پوچھ رہے تھے مگر وہ رسا تڑا کر فوراً گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

سیف نے بارات کے لیے ہال کی بکنگ کروا لی تھی۔ ناعمہ پاشا نے وارن کیا تھا کہ سب کچھ شیڈول کے مطابق اور آن ٹائم ہونا لازمی تھا۔ ویسے وہ خود بھی خاصا ذمہ دار تھا۔ یہ تو پھر اس کی اپنی کی شادی تھی۔ اور اس نے اس شادی کو دل سے لیا تھا۔ جب نصیب میں یہی ہونا لکھا تھا تو ہونا تھا بلا وجہ ناپسندیدگی دکھاتا۔ ریان لائنگ کو سنبھالے ہوا تھا، زونی اسی کے ساتھ مدد کروا رہی تھی۔ اسے بڑوں والے کام کرنے کا پیسے بھی مل رہا تھا۔ اوپر نیچے بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ زلیخا دادی نجانے کون سی آثار قدیمہ کی سہیلیاں بلا لائی تھیں۔ تخت پر پھسکڑے مارے بیٹھی تھیں۔ وہ کل دن سے رہنے چلی آئی تھیں اور اب ہر بات میں ٹوک کر سب کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ زلیخا دادی نے پہناوؤنیوں کے سب ہی جوڑے ان کے آگے لا دھرے اور انہیں پیکنگ میں لگا کر سب کی گھوما پھرا کروائی۔

ناعمہ پاشا نے اپنے سب ہی بچوں کے شادی کے دنوں میں پہننے والے کپڑوں کو استری کر کے ہینگ کرنا شروع کیا تھا حالانکہ اب تو کئی ماہ سے زلیخا دادی نے سیف اور ماحور کے کہنے پر جز وقتی ملازمہ رکھ چھوڑی تھی مگر ناعمہ پاشا کو اپنے بچوں کے کام کرنے میں عجب ہی تسکین حاصل ہو رہی تھی۔ ایک مدت انہوں نے یہ سب مس کیا تھا اب وہ پاس ہوں دوبارہ مس نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ یہ کام اتنے چاؤ سے کر رہی تھیں جیسے کوئی مقدس فریضہ ہو جو انجام دے رہی ہوں۔ سب کے کپڑے انہوں نے خود بنوائے تھے۔ بیش قیمت اور شان دار۔

سالک پاشا نے ان کے منع کرنے کے باوجود انہیں شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں خطیر رقم مہیا کی تھی، اس کے علاوہ بھی وہ ہر ہر ضرورت کا ذاتی طور پر خیال رکھ رہا تھا۔

جنت، رائنہ کے آگے بال کھولے بیٹھی تھی جس نے اسے ایک بار کہا تھا کہ وہ اسٹیپ کٹنگ جانتی ہے اب جب جنت اس کے پاس قینچی کنگھی لے کر بال گیلے کیے بیٹھی تھی تو رائنہ تھوک نگلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ بھلا اسٹارٹ کیسے لے۔ زلیخا دادی نے ایک قریب ہی موڑھا گھسیٹ کر فرمائشی پروگرام جاری کر

بولی۔ "بیٹھ جا۔ میں تو اب اس عمر میں پارلر جانے سے رہی۔ تو گھر پر ہی میرے بالوں کی بیک بھی کر دینا۔ ذرا سر بھرا بھرا سا لگے گا۔"

بیٹی اور جنت کے بالوں سے نبرد آزما رائنہ نے ایک نظر ان کے منحنی بھربالوں کو دیکھا تو ہنسی ہی بھنچے پھونٹے رہ گئی۔

"دادی اگر آپ کے بالوں کی بیک کامبنگ کر دی تو سارے کے سارے بال گچھا بن کر آگے آجائیں گے، جوڑے کے لیے پیچھے کچھ نہیں بچنا۔"

"بکواس نہ کر۔ پیچھے نقلی جوڑا لگاؤں گی نا۔ تو دیکھتی جانا میری ٹور۔ تو نے ابھی زلیخا دادی کے فن دیکھے ہی کہاں ہیں۔"

رائنہ نے انہیں تسلی دلائی کہ جیسا چاہیں گی ہیر اسٹائل بنا دے گی وہ۔ ساتھ ہی کن انکھیوں سے کچن کے جالی والے دروازے سے نظر آتی ماحور کو دیکھا جو شدید بے چین سے کبھی اپنی ہتھیلیوں کو مسلتی تو کبھی اپنے چہرے کو۔ رائنہ نے خود کو بے نیاز ظاہر کر کے ساری توجہ جنت کی جانب مبذول کی۔ بلاوجہ کی مصروفیاں انسان کو بزدل بنا دیتی ہیں۔ وہ اپنی مصروفیوں پر قابو پانے کے بجائے ان پر پردہ ڈالنے لگتا ہے۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہو تو سب سے بہترین حل خود کو تقدیر کے حوالے کرنا ہے۔

☆☆☆

کسی بھی شخص میں عاجزی اور انکساری نمایاں ہونے لگے تو جان لیجیے کہ وہ خود احتسابی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ عادل پاشا پر یہ وقت گو خاصی دیر سے واقع ہو کر آیا گیا۔ آج کل رات دن اپنی بداعمالیاں مجسم ہو کر سامنے آ کھڑی ہوتی تھیں۔ ان کے ہر ایک چہرے انہیں پسینہ پسینہ کر دیتے تھے۔ ان کی آنکھیں دہشت و وحشت کا چولا اوڑھے اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتی تھیں۔ ہر اس شخص کا چہرہ نگاہوں میں پھرتا جو ان کی ایذا رسانی کے باعث سخت اذیت کا شکار ہوا۔ وہ کہاں سے شروع کرتے بھلے۔ ابھی تو سرا ہی پکڑ پائے تھے، انت نجانے کہاں تھا۔ کس کس سے معافی مانگیں گے۔ کون معاف کرے گا انہیں۔ کئی تو اس دنیا سے گزر گئے ان کے دیے دکھوں کا وبال سہتے سہتے۔ عقیل مغل..... عقیل مغل کا چہرہ اچک اچک کر سب سے زیادہ سامنے آتا۔ اس بھلے مانس سے کیونکر عداوت پالی انہوں نے۔ اس نے کیا بگاڑا تھا ان کا۔ لکھ سے کھ کا سفر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس کا۔ اور بے حد لطف اندوز ہوئے تھے۔ ایک نائمہ پاشا کو پانے کی خاطر۔ بس.....

تو نائمہ پاشا کو وہ بھلا کب پا سکے تھے۔ کیا وہ جانتے نہیں تھے کہ پندرہ سال کسی پنجرے میں قید بے بس پنچھی سی زندگی گزاری تھی انہوں نے۔ نہ کوئی امنگ نہ کوئی ترنگ۔ وہ راتوں کو جاگ جاگ کر دبے پاؤں کمرے سے نکل جاتی تھیں اور کسی کونے کھدرے میں جا کر بچوں کی یاد میں آنسو بہاتی تھیں۔ کتنا شاندار نظارہ ہوتا تھا یہ ان کے لیے۔ انہیں روتا تڑپتا اور سسکتا دیکھنا۔ وہ ان کے پیچھے آتے اور بنا کوئی آہٹ کیے ویسے ہی لوٹ جاتے بس سینہ فخر کے احساس سے بھرا ہوتا۔ عقیل مغل تو قصہ پارینہ بن چکا تھا مگر وہ ان کی اولاد کی یاد ان کے دل سے محو نہیں کر پائے تھے اور یہ بھی ان کی نظر میں اس انکار کی سزا تھی جو نائمہ پاشا نے ان کی پہلی پیش قدمی کے جواب میں بے حد حقارت سے کیا تھا۔ آخر عادل پاشا نام تھا ان کا۔

آج وہی نائمہ پاشا انہیں ٹھوکر مار کر ان کی زندگی سے یوں چلی گئی تھیں جیسے کبھی آئی ہی نہ ہوں۔ وہ جو کبھی ان کی خفگی بھری نگاہ سے دہل جایا کرتی تھیں، اب ان کے چیخنے چلانے پر بھی پلٹ کر خبر نہ لے رہی تھیں۔ آج جب انہیں ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تو وہ بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ آج جب وہ ان کی بیٹی کو جی جان سے اپنی بہو بنانے جا رہے تھے تو نائمہ پاشا ان کی سلطنت کی حدود سے دور جا چکی تھیں۔ یہ سزا ان کے لیے موت سے کڑی تھی۔ اس سے اچھا تو ان کی جان نکل جاتی کم از کم وہ

اس جان کنی کی مسلسل اذیت سے تو چھٹکارا پا لیتے۔ اوپر سے اپنے کیے ہوئے گناہوں کا بوجھ عفریت بن کر ان کے حواسوں پر مسلط تھا۔ وہ دل ہی دل میں توبہ کرتے اور پھر توبہ کے الفاظ زبان تک آتے آتے شرمسار سے منہ چھپائے دل میں ہی دبک کر بیٹھ رہتے۔ بھلا کس منہ سے توبہ کریں۔ کیا کہیں اللہ سے۔ یا اللہ مجھے معاف کردے تو کیا اتنا کہہ دینے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ زندوں سے تو پاؤں پڑ کر معافی مانگ لیں گے مرے ہوؤں کو کہاں سے لائیں۔ ان کی قبروں پر جا کر سر پٹخیں یا ویرانے میں جا چھپیں جہاں کوئی بھی ان کو پکڑ نہ سکے۔ ان سے پوچھ پڑتال نہ ہو۔ انہیں گرز تھامے انجان مخلوق نہ دکھائی دے۔

تھک ہار کر انہوں نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ دروازہ اندر سے لاک کر رکھا تھا اور مراد کو زبردستی لاؤنج میں سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ ویسے بھی رات کے اس پہر ان کی آواز سے کون جاگتا۔ وہ رو رو کر فریاد کر رہے تھے۔ اللہ سے امید در جا میں گھرے معافی کے طلبگار تھے۔ انہیں ہرگز بھی یقین نہیں تھا اللہ انہیں معاف کر دے گا۔ جب نڈھال سے ہو گئے تو وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے ہی سر پیچھے کو گرا لیا۔

"مجھے کیسے معاف کرے گا تو میرے رب۔ بھلا میرے گناہوں کی کثرت تیری رحمت کی حق دار کیوں کر ہو سکتی ہے۔"

آنسوؤں نے ان کی ٹھوڑی سے لپک لپک کر شہ رگ پر پھسلنا شروع کیا تو انہوں نے میکانکی انداز میں اپنی شہ رگ پر ہاتھ رکھا۔ نمی ہتھیلی میں جذب ہوئی اور باہر فضاؤں میں فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ وہ کان لگا کر اسی انداز میں اذان سننے لگے۔ حی علی الصلوٰۃ تک مؤذن کی صدا پہنچی اور انہوں نے وہیل چیئر کا رخ واشروم کی جانب کیا۔ بڑی دقت کے ساتھ وضو کر کے وہ واپس آئے اور قبلہ رخ ہو کر نیت کے لیے الفاظ تلاشنے لگے۔ عید بقر عید یا پھر جمعہ کی کبھی کبھی نماز پڑھنا انہیں نصیب ہوتی بڑے نصیب تھے کہ آج فجر کے لیے اللہ کے قابل جانا کہ اپنی بارگاہ میں کھڑا ہونے کی دی۔ انہوں نے خوب سوچ سوچ کر نیت کی پڑھنا شروع ہوئے۔ پہلی رکعت کے مکمل وہ ایک بار پھر آنسوؤں میں ڈوب چکے تھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی معافی تھی یا نہیں مگر تو طے تھی کہ زندگی اس طور ہی گزرنی تھی اپنے گناہوں پر شرمسار ہوئے بنا سانس لیتے یا پھر باقی کی زندگی ہر پل توبہ کرتے پہلی صورت میں تو بلاشبہ خسارہ جہنم کی صورت کے گلے کا طوق بن ہی جاتا مگر دوسری صورت آخری سانس تک آس کا جگنو معمولی سی روشنی صورت ان کی امید قائم رکھتا۔ یہی بہتر آپشن تھا۔

اور اللہ کی رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔

☆☆☆

یونس نانا کے ہتھے مومن دوبارہ چڑھ گیا نجانے کس بچے نے ان کی چھڑی شرارتاً کہیں چھوڑی تھی۔ وہ بے چارے اپنی چھڑی کی تلاش اسی کے کمرے میں آ گھسے تھے۔ ادھر ادھر ہاتھ بنائے چھڑی تلاش کر رہے تھے۔ مومن بیڈ پر یک دم اٹھ بیٹھا۔

"مارے گئے۔ یہ اس وقت کہاں آ گئے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر ان پوچھا۔

"خیریت ہے نانا۔ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"کیا کہا سونڈ۔" نانا نے خفگی سے ہاتھ کا آنکھوں سے ہٹا کر کان پر رکھا۔ "ہم کیا ہاتھی ہیں میاں جو ہماری سونڈ دکھائی دے گئی تمہیں۔"

"میرے کہنے کا مطلب ہے، کیا چاہیے آپ کو؟" اسے یاد آیا کہ انہیں اونچا سنائی دیتا ہے اس لیے تقریباً چلاتا ہوا بولا۔

"نہا ہیے؟" نانا نے اچنبھے سے نظریں مو پر گاڑیں۔ "کیوں نہاؤں میاں۔ یہاں نہانے آ

ہوں کیا؟"

"اُف..... کیا سیاپا ہے۔" مومن کو خود پر ترس آیا۔ "آپا..... کس کی آپا..... تمہاری آپا یا ہماری۔ ہماری کو تو تمہارے دادا بھی کے آگے روانہ کر چکے۔"

یونس نانا بھی خاصے کائیاں تھے۔ دادا کو رگیدنا نہیں بھولے تھے۔ مومن نے زچ ہوتے ہوئے روہانسے لہجے میں کہا

"معاف کردیں مجھے نانا..... معاف....."

"کیا کہا ناف..... تمہاری ناف مل گئی..... یہ تو بہت برا ہوا۔ کل تمہاری شادی ہے میاں۔ عین ایک دن پہلے ناف مل گئی تمہاری۔ سیدھے لیٹ جاؤ، میں ابھی بھیج کے دیتا ہوں۔" یونس نانا اسے چت لٹانے کو آگے بڑھے تھے اور دادا کمرے میں داخل ہوئے۔ مومن نے شکر کا کلمہ پڑھا اور ان سے یونس نانا کو باہر لے جانے کی درخواست کیا۔

"آ یار یونس۔ باہر چل تجھے ٹھنڈی بوتل پلاؤں۔"

"کیا کہا لنڈی کوتل۔ میں کیوں جانے لگا بھلا لنڈی کوتل۔ پگلا گئے ہو کیا فضل؟"

"سوچ تیری دادی اللہ بخشے مجھے کتنا پکاتی تھی۔" دادا نے مڑ کر مومن کو تائید طلب نظروں سے دیکھا تو اس نے سر جھٹک کر اسے دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔ دادا یونس نانا کو باہر بٹھا کر واپس اندر آئے اور مومن سے کڑک لہجے میں مخاطب ہوئے۔

"باہر محلے کی خواتین اور رشتے دار عورتیں سب انتظار کر رہی ہیں تیرا۔ باہر چل تیل مہندی کی رسم کرنی ہے انہوں نے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے نہیں کرنا ان سب خرافات کو۔ ان سے کہیں ایک دوسرے کو ہی مل لیں تیل اور لگا لیں مہندی۔"

دادا نے۔

"اگر پانچ منٹ کے اندر باہر صحن میں نکل کر نہ آیا تو میں یونس کو تیرے کمرے میں واپس چھوڑ دوں گا۔ اور باہر سے کنڈی بھی لگا دوں گا۔"

"دادا آپ نے حد ہی کر دی ہے۔ مجھے اتنا ٹارچر کیوں کر رہے ہیں آپ؟"

"جسے تو ٹارچر کہہ رہا ہے، ہماری زبان میں اسے شادی کہتے ہیں۔"

"تو کر تو رہا ہوں شادی۔ اور کیا کروں۔ اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں ہے دادا۔" وہ زچ ہوتے ہوئے اکڑ کر بیٹھ گیا۔

"شاویز۔" دادا نے پلٹ کر شاویز کو پکارا تو مومن نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا۔ "یہ ذرا اپنا یونس کو اندر بھیجنا۔ آ کر مومن کے دماغ کا بھرتا بنائے۔ تاکہ اس کا دماغ جو سوچنے کی اتنی مشقت میں پڑا ہے، اس کے قابل ہی نہ رہے۔"

باہر سے ایک پل کی تاخیر کے بغیر شاویز کی آواز سنائی دی۔

"لایا جی۔"

اور مومن تراب اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ دادا سے بھی پہلے کمرے سے باہر تھا۔ پیچھے دادا گردن تانے ہنسی ضبط کرتے چلے آئے۔

صحن کے بیچوں بیچ خوب صورت سجی سجائی کرسی پر اکتایا اور بیزار سی شکل لیے مومن برا جمان ہو چکا تھا۔ نانیوں دادیوں کی کھیپ اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی ہو چکی تھی۔ شوکت ماسی چمچماتے کپڑوں میں ملبوس اپنی بیٹی اور بہو کے ہمراہ پوری ذمہ داری کے ساتھ مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ عورتوں کے تیل مہندی لگا لینے کے بعد جب لڑکوں نے اسے گھیرا تو وہ حیران ہو کر سب کی شکلیں دیکھنے لگا۔ کئی کو تو وہ دیکھ ہی پہلی بار رہا تھا، جان پہچان تو دور کی بات تھی۔ اپنے کولیگز کو اس نے دادا کے بے حد اصرار پر بارات اور ولیمے کے کارڈز دیے تھے۔ اسے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس نے اشارے سے شاویز کو پاس بلایا اور کان میں پوچھا۔

"یہ سب کون ہیں۔ میں تو انہیں نہیں جانتا اور یہ میرے اردگرد کیوں جمع ہو گئے ہیں منحوس آدمی۔"

جواباً شاویز اس کے کان میں گھس کر انتہائی کمینی سی ہنسی ہنستے ہوئے بڑبڑایا۔

"ماں قسم ان میں سے میں بھی بس دو چار کو جانتا ہوں جو کہ محلے کے لڑکے ہیں اور چند تیرے دور پار کے اور ذرا اس پار کے کزن ہیں باقی سب لوٹے لپاڑے وہ اپنے ساتھ نجانے کہاں کہاں سے اکھاڑ کر پکڑ لائے ہیں۔ دادا نے کہا تھا۔ کہ جتنے لڑکے اکٹھے کر سکتا ہے کر لا، میرے مومن کی شادی میں "کچ" مچ جائے بس۔"

"اور تو ہر قسم۔ کا غنڈہ موالی پکڑ لایا۔" مومن غرایا

"نا..... میں نہیں..... میں نے دو چار کو بلایا تھا باقی سب ان کے یار دوست۔" شاویز نے چٹخارا بھرا۔

"میں ابھی جا رہا ہوں کمرے میں..... سمجھا..... دادا کو بتا دینا۔ ویسے بھی مجھے اس تیل مہندی سے الجھن ہو رہی ہے۔ بھلا پان کے پتے پر رکھنے کے بجائے میری ہتھیلیوں اور کلائیوں پر لگا ڈالی مہندی۔ حد ہے ویسے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو شاویز نے کندھے سے پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

"نہ بیٹا نہ۔ آج نہیں..... آج تو ہمارا دن ہے..... آج تو تجھے تیل میں اتنا ڈبوئیں گے کہ کل تک "تلک تلک" (پھسل پھسل) کر گرتا رہے گا۔"

"شاویز میرے ہاتھوں مرے گا تو۔ جانے دے مجھے۔"

"مر کر بھی نہیں۔" شاویز نے گرفت مزید مضبوط کی۔ "ابھی تو انڈے بھی پھوڑے جائیں گے تیرے سر پر۔ ساری عمر اپنی تیل مہندی تجھے یاد رہے گی مومن۔"

اور پھر جو تماشا ہوا الامان والحفیظ۔ لڑکوں نے مل کر تیل کے جیسے کنستر اس پر الٹ دیے تھے۔ وہ پہلے تو احتجاج کرتا رہا مگر کب تک۔ بلآخر ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا کہ تو جو کرنا ہے کرو۔ شاویز انڈوں کا کریٹ اٹھا لایا۔ اس نے بے بسی سے انڈوں کو دیکھا اور خود

سے اٹھنے والی مہک کا تصور کیا جو اس کو الٹی لازمی تھی تو ابکائی سی آ گئی۔ دادا حرکت سے ایک کونے میں اپنے جیسے بزرگوں کا منتظر تھے یعنی آج شاویز کو فری ہینڈ دے رکھا تھا۔ ایک لمبی سانس بھری اور خود کو ان تمام کمینوں حوالے کر دیا مگر شکر ہوا کہ عین اسی وقت بڑے بھائی محبت نے آ کر اس کی خلاصی کرا شاویز کو بھی گھر کا اور باقی سب کو بھی اس کے پاس سے ہٹا کر اسے اندر کمرے میں ر تشکرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھ کر مومن نے کمرے میں آ کر اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ سکون آور سانس خارج کر کے وہ بستر پر ڈھے کو تھا جب یک دم اپنے گندے حلیے کے باعث گیا۔ اسے فوری طور پر گرم شاور کی ضرورت تھی واش روم کی جانب بڑھا مگر نگاہ ڈریسنگ ٹیبل آئینے میں دکھائی دیتے اپنے عکس پر جا ٹھہری۔ مہندی میں لتھڑا وہ کوئی اور ہی مخلوق لگ رہا تھا۔ پھیکی سی مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔ یک دم شدید بے چین ہو گیا۔ آج ماحور اور سر سالہ کی بھی تو مہندی کی رسم تھی۔ ماحور کو سالک پاشا نام کی مہندی لگ رہی ہو گی۔ وہ گھونگٹ نکالے جھکائے ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھی کتنی دلکش لگ رہی گی۔

"مت سوچ مومن! مت سوچ۔ وہ تیرے لیے نہیں تھی۔ وہ تیرا نصیب نہیں تھی۔ اس کی یاد کو سینے میں کہیں دفنا دے۔ اب تیری ہر سوچ اس کی امانت ہے جو اس وقت تیرے نام کی مہندی ہتھیلیوں پر سجا رہی ہو گی۔ مت وہی درد اے جس سے خود گزر رہا ہے۔"

اس نے آنکھوں میں اتری نمی کو انگلی کی پور سمیٹ کر جھٹک دیا۔ ماحور کا یاد آنا اس کے نہیں تھا مگر اس کی یاد کو پور پر رکھے آنسو کی طرح جھٹک دینا اس کے بس میں تھا..... شاید

☆☆☆

شادی والے گھر کی مخصوص ہڑبونگ سی مچی تھی۔ گھر مہمانوں سے اس قدر اٹا پڑا تھا کہ کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ ماحور کا سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ دادی نے اتنی رشتے داریاں سنبھال رکھی ہیں۔ حمدہ پاشا بھی اس سارے ہنگامے سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ لوگ ان کے حوالے سے متجسس ضرور تھے مگر زلیخا دادی کے ڈر سے کسی نے کچھ بھی کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس معاملے میں زلیخا دادی کی ایک کڑک دار للکار ہی سب کا منہ بند کرا دینے کو کافی ہو سکتی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ کسی کے گھریلو معاملات میں تب تک دخل اندازی نہیں کرتیں جب تک ان سے رائے طلب نہ کی جائے اسی طرح اپنے گھر کے معاملات بھی خود ہی سنوارنا پسند کرتی تھیں۔

خوب صورتی سے سجے جھولے پر بیٹھی ہرے، پیلے اور پیلے غرارے میں ملبوس ماحور کی مہندی تیل کی رسم ادا ہوئی تو اس نے اندر کمرے میں جانے کو پر تولے۔ رائنہ اور ابرش اسے اندر لے تو گئیں مگر وہاں اس کے لیے ایک اور آزمائش تیار کھڑی تھی۔ دولہے سردس لینے کے لیے پارلر جانے سے انکار کر دیا تو رائنہ نے اپنی ایک دوست جو پارلر چلاتی تھی، اسے گھر بلوا لیا تھا۔ اس نے اب ماحور کو چمکانا اور مہندی بھی لگانی تھی۔ اس خوش مزاج سی لڑکی علیہ کی خوش آمدیدی مسکراہٹ کے باوجود بھی ماحور کا چہرہ ہنوز سپاٹ تھا۔ رائنہ نے اسے کچھ اشارہ کیا تو وہ اپنا سامان کھولنے لگی۔

"رائنہ۔ کیوں یار۔ کیوں مجھے اتنی ٹینشن دے رہی ہو۔ نہیں کرانا مجھے یہ سب۔" وہ گلستے ہوئے رائنہ سے پوچھ رہی تھی۔ جواباً اس نے آنکھیں ماتھے پر رکھتے ہوئے ابرش کو جواب دیا۔

"ابرش۔ اس سے کہو کہ یہ سب تو اسے کرانا ہی کرانا ہے، انکار کر کے ہمیں ٹینشن نہ دے ورنہ میں بتا رہی ہوں زلیخا دادی کو۔"

ابرش بے چاری الجھی پھنسی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ماحور کی سائیڈ لے یا رائنہ کی۔ دونوں ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے بولی۔

"پلیز یار۔ تم دونوں میری فرینڈز ہو۔ اس طرح سے ایک دوسرے سے بات مت کرو مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ یہ خوشی کا موقع ہے، اس موقعے پر ایک دوسرے کو ان ڈائریکلی بلانے کے بجائے ڈائریکٹ ہو جاؤ۔ سمجھیں دونوں..... اور ماحی تم۔" اب اس کا رخ ماحور کی جانب تھا۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کی اوک میں بھر کے بولی۔ "کل میری فلائٹ ہے ماحی۔ میں تمہاری بارات اٹینڈ نہیں کر سکوں گی۔ اس وقت میں ائیر پورٹ پر ہوں گی یا شاید فلائی کر چکی ہوں۔ پلیز میری خاطر اپنی زندگی کے اتنے قیمتی ایونٹ کو انجوائے کرو۔ اسے اسپوائل (خراب) مت کرو۔ پلیز۔"

ماحور اور رائنہ دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ ابرش نے بانہیں پھیلا کر انہیں اس میں سما جانے کا اشارہ کیا تو وہ تینوں ایک دوسرے کے گلے لگی رو دیں۔ ابرش کے دل میں بھی غم چٹکیاں لے رہا تھا۔ کل ماحی ہمیشہ کے لیے سالک پاشا کی ہو جائے گی اور وہ شاید ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جائے گی۔ ماحور کے دل میں مومن کا غم سلگ سلگ کر غبار بنا چکا تھا۔ آج آخری بار آنکھوں کے رستے وہ اسے بہہ جانے دینا چاہتی تھی۔ کل وہ اور مومن ایک دوسرے کو کھو دینے والے تھے۔ ہر راہ مسدود ہو جانے والی تھی۔ مگر رائنہ کی آنکھوں کی گیلی سی چمک کے راز سے نہ ابرش واقف تھی نہ ماحور۔

اگلے ایک گھنٹے بعد ماحور کا چہرہ آئینے کی مانند چمکانے کے بعد اب بیوٹیشن اس کی سڈول سپید بانہوں کو مہندی کے نقش و نگار سے مزید خیرہ کر رہی تھی۔ باہر لڑکیوں کا جمگھٹا ڈھولک کی تھاپ پر راگ الاپ رہا تھا۔

آئی بھولیے
مہندی لاون دے

تیری مہندی وے لوچ گانے
تیں مہندی لاواں مائے
مہندی لاواں وے
جیون جوگے مہندی لاواں وے
تیری مہندی وے لوچ شوہاں
تیں مہندی لاواں پیاں۔
مہندی لاواں وے
جیون جوگے مہندی لاواں وے۔

☆☆☆

آج مومن تراب کی بارات تھی اور دادا بہت خوش تھے۔ سارے گھر میں اس قدر رونق اور گہما گہمی تھی کہ ان کا دل کر رہا تھا وقت کی بنھیں تھام لیں۔ یہ سماں کبھی ختم نہ ہو۔ اوپر والے پورشن کے دونوں کمرے بھی انہوں نے رشتے داروں کے لیے بالکل تیار کروا چھوڑے تھے جہاں اب لڑکیاں اور عورتیں بارات کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ شور و غوغا کانوں کو بہرا بنا رہا تھا۔ کوئی استری کے لیے پکار رہا تھا تو کوئی صحن کے کونے میں بنے واشروم میں سے موٹر چلانے کے لیے فریادیں کر رہا تھا۔ بڑے بزرگ حسب معمول دالان کے جہیے میں صحن میں چارپائیاں بچھائے ایک ہی اخبار سے مستفیض ہو رہے تھے۔ ساتھ چائے کا دور بھی مسلسل چل رہا تھا۔ ان باتوں کا کیا تھا، جن پگڑیوں میں تھا انہی میں بارات کے سر ہو لیتا تھا انہوں نے۔ ماسی شوکت کمروں میں سے رات کے بچے کھرے مسنجاتی بلانکٹ ہو ہو کر اکٹھے کر رہی تھی۔ ڈھیر نکال کر صحن میں کھول رہی تھی۔

ماسی شوکت کی بیٹی چولہے کے آگے کھڑی مستعدی سے کباب کی پلیٹ ہاتھ میں لیے کباب تلنے کا کام کر رہی تھی۔ یہ کام بھی حسب توقع دادا کے سپرد ہی کیا گیا تھا۔ یہ کباب تھے اور کباب بنانے کی ترکیب بھی دادا ہی کی ایجاد تھی۔ قیمہ بھی دادا کی ہی نگرانی میں بنا تھا۔ قیمہ بنانے والی مشین بھی دادا ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی گھر میں جتنے بھی کام تھے، دادا نے ہی کیے تھے۔ رشتے دار تو بس ہنی مون منانے ہی آتے تھے اور وہ بھی دادا سے دامن بچا کر۔ دادا مومن کی شادی بھرپور طریقے سے کرنا چاہتے تھے۔ مخصوص تام جھام اور چاؤ چونچلے۔ اس لیے انہوں نے بطور خاص سب کو مایوں مہندی سے بھی ایک دن پہلے گھر رہنے کے لیے بلوا لیا تھا۔ اپنے پیار خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ وہ دادا جو پیسے پیسے کا حساب رکھتے تھے، پوتے کے بیاہ میں حساب کو طرف لپیٹ کر رکھ چھوڑا تھا۔

برآمدے میں کھڑے ہو کر دادا نے ایک تیز بخش نگاہ سب پر ڈالی اور مطمئن سے مومن کے کمرے کی جانب چل دیے۔ اسے "حسب حکم" تیار ہونے پر راضی کرنا بھی ایک مشکل امر تھا جو یہ تھا کہ شیروانی نہیں پہنے گا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو مومن بیڈ پر دونوں بازوؤں کی ٹیک کے سہارے بیٹھا ٹانگ جھلا رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور چہرہ لٹکا ہوا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ رات بھر جاگا تھا۔

"دوسری ٹانگ کو بھی جھولا جھلا لے ورنہ رہ جائے گی۔" دادا نے انتری مارتے ہی چوٹ کی۔

"میری تو قسمت سو رہی ہے دادا۔ ہاتھ میں جائیں گی تو کیا۔" دادا نے اپنا قہقہہ بمشکل ضبط کیا۔ اس وقت وہ سنجیدہ رہنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے تھے ورنہ مومن کو ڈھیل مل جاتی۔

"تیار کیوں نہیں ہوا ابھی تک؟" وہ اصل موضوع کی جانب آئے۔

"ہونے لگا تھا۔ ماسی شوکت کو شلوار قمیص۔ کر بھیجا ہے استری کرنے کے لیے۔ لاتی ہیں تو پہنوں۔"

"کیسی شلوار قمیص۔ شیروانی کدھر ہے تیری؟"

"نہیں پہننی؟"

"کیوں نہیں پہننی؟"

"دل نہیں کر رہا دادا۔۔۔ شیروانی میں کریز آپ مجرم محرم سمجھے گا۔"

"نہیں دادا..... بس..... یہ شیروانی اور ان
...ات کا تصور میں نے ماحور کی شکست میں کیا
...اب وہ نہیں تو یہ سب بھی نہیں۔"
"تو پھر دادا بھی کرائے پر لے آ۔ کیونکہ دادا تو
...ب بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اپنی ہنڈیا کے بھی
...ے بدل دے نا۔"
"دادا۔ پلیز مجھے اس بات پر فورس نہ کریں۔
...پ نے جیسا کہا میں نے کیا مگر یہ میری برداشت
...ے باہر کی بات ہے۔"
"میں تجھے مرغا بننے کو نہیں کہہ رہا مومن۔ دلہا
...نے کو کہا ہے۔ جہاں میری بھی باتیں مان لی ہیں
...ہاں بس آج کے دن کی یہ آخری بات بھی مان
...لے۔ کیا تو بنا میرے کہے ہی ناک کی سیدھ میں
...ہے گا۔"
"ہر بات مذاق نہیں ہوتی دادا۔ میرے
...بات کا کچھ تو خیال کریں۔ ماحور میری زندگی سے
...گئی مگر میری مٹھی میں اپنے رنگ چھوڑ گئی۔ میں
...ں چیز کو چھوتا ہوں وہ ماحور کا عکس چرا لیتی ہے۔
...س طرف رخ کرتا ہوں وہاں اس کی خوشبو ان
...ہوا میرے ان اوڑھے میری سانسوں سے ٹکراتی رہتی
...ہے۔ میں خود کو سمجھا سمجھا کر ہار چکا ہوں دادا.....
...ے بس میں اب کچھ بھی نہیں..... میں جل کر
...ہو چکا ہوں، مزید خود کو بھٹی کا ایندھن نہیں بنا
...تی۔"

دادا نے پوتے کو بغور دیکھا۔ وہ انہیں بے حد
...حال دکھائی دیا۔ ان کے دل کو کچھ ہوا۔ یہ وہ مومن
...نہیں تھا جس کی نس نس شرارت سے پھڑکتی رہتی
...ہر بات پر چٹکلے چھوڑا کرتا تھا۔ انہوں نے
...ہری آنکھوں کو ساکس اندر کھینچی اور رسان سے گویا
...ہوئے۔

"مومن۔ جب تو چھوٹا تھا تو تیری ماں کو
...نی نے کہہ دیا کہ تیرا اور کوئی بہن بھائی نہیں ہو
...وہ دنوں روتی رہی تھی۔ تیرا باپ اور میں اسے
...دیا کرتے، اسے احساس دلاتے کہ اللہ
نے تمہیں بے اولاد نہیں رکھا، جو نعمت پاس ہے اس پر
شکر ادا کرو رب کا مگر اسے چین نہیں آتا تھا۔ تبھی اس
نے تیری شادی کا شوق پال لیا۔ وہ چاہتی تھی کہ تیرا
بچپن میں نکاح کر دے تاکہ جب تو سیانا ہو جائے تو
لڑکی بالکل۔ تیار ہو اور وہ جھٹ سے اسے تیری دلہن
بنا کر لے آئے۔ میں اور تیرا باپ اس کے آڑے
نہیں آئے کہ چلو اس کا دکھ تو کم ہوگا۔ اور بھلا ایسے
بھی کوئی بچی دیتا ہے نکاح کرنے کو۔ سو اسے بھی نہ
ملی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے جنون میں کمی تو ہو
گئی مگر شوق وہیں کا وہیں تھا۔ تیرا باپ گزر گیا۔ تو
جوان ہو گیا اور تیری ماں کو کینسر ہو گیا۔ جب وہ اپنے
آخری دنوں میں تھی تو مجھ سے بڑی حسرت سے کہا
کرتی تھی کہ کاش تو جلد از جلد پڑھائی مکمل کرے اور
وہ تیری شادی کر کے دلہن گھر لائے۔ تیرے بچے
کھلائے مگر قدرت نے اسے مہلت نہیں دی۔ جب
وہ مری تو اس کی مردہ آنکھوں کا خواب میں نے چرا
کر اپنی زندہ آنکھوں میں بھر لیا۔ اس دن سے میں
نے لمحہ لمحہ اس خواب کو جیا ہے مومن۔ میں نے دن
رات اسے سینچا ہے، میری تمنائیں، خواہشیں اور
آرزوئیں پل کر توانا ہوا ہے یہ خواب۔ تیری شادی
اور پھر تیرے بچے۔ بس یہ میرے بڑھاپے کا حاصل
رہا ہے۔ میں نے اس دن کی آس میں زندہ رہنے کی
شعوری کوشش کی ہے مومن ورنہ موت میرے لیے
دروازے پر ایسے ہی کھڑی ہے جیسے اس وقت اس
کمرے کے دروازے سے کان لگائے، ہماری
باتیں سنتا شاویز۔"

اتنی دل سوز اور سنجیدہ گفتگو کا اختتام اتنا مضحکہ
خیز تھا کہ شاویز تو سٹپٹا کر اندر داخل ہوا ہی، مومن
تراب کو بھی ہنسی آ گئی۔ وہ واقعی باتیں سن رہا تھا۔

"دادا میں تو یہ شیروانی لایا تھا۔ آپ کی باتیں
سن کر وہیں رک گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی
دردناک فلم کا اختتامی سین دیکھ رہا ہوں۔ کمال کے
ایکٹر ہیں دادا آپ۔"

"اگر تو نے لطیفہ سنایا ہے تو یقین مان ہنسی

نہیں آئی اور اگر یہ میری تعریف ہے تب بھی فٹے
منہ۔ دے اب اسے شیر دانی۔" دادا فارم میں آتے
ہی دبنگ ہو گئے۔ دونوں کو تنبیہی نظروں سے دیکھتے
ہوئے بولے۔ "دیکھ مومن آدھا گھنٹہ ہے بس تیرے
پاس۔ تیار ہو کر باہر آجا۔ شادی کرا لے اس کے بعد
میں تجھے پورا ٹائم دوں گا اکیلے رہنے کا۔ دلہن کو میں
تجھے دیکھنے بھی نہیں دوں گا۔ بے فکر رہ۔ تو اکیلا بیٹھ کر
آہیں بھرا کرنا۔ مگر ابھی تیار ہو کر باہر آ۔ چل شاوا۔"

دادا کمرے سے باہر چلے گئے اور مومن، شاویز
کے ہاتھوں میں شیر دانی کے فنگر کو بے بسی سے دیکھ کر
رہ گیا۔ شاویز نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"کاش کہ اس طرح دھوس سے کوئی مجھے
میری بارات کے لیے تیار ہونے کو کہے..... وللہ دس
بارائیں لے کر نکلوں۔"

"فی الحال میرے کمرے سے نکل۔"

مومن نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ شاویز نے
مسکین صورت بناتے ہوئے سر ہلایا اور ہینگر اسے
پکڑا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ لاک کرتے ہوئے
مومن کی نگاہیں مسلسل شیر دانی پر اور دماغ کی سوچیں
ماحور کی جانب لگی تھیں۔ وہ تصور میں اسے سجتا سنورتا
دیکھ رہا تھا۔ آج وہ سالک پاشا کی دلہن بننے والی
تھی۔

☆☆☆

پارلر میں اس کے حسن کی دھوم مچی تھی۔ اس
جیسی کوئی دلہن نہیں تھی۔ وہ جس قدر معصوم تھی اسی
قدر دمک رہی تھی۔ سرخ اور سبز امتزاج کے لہنگے کو
ماحور کی رعنائی نے چار چاند لگا دیے تھے۔ اس پر آج
نگاہ ٹھہرتی نہ تھی۔ رائنہ اس پر واری صدقے ہوئی جا
رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو کالا بکرا منگوا کر صدقہ
کرتی۔ یہاں بس اس نے اتنا کیا کہ اس پر سے چند
نوٹ وار کر پارلر کی سوئپر کو دے دیے تھے۔ وہ اور
جنت اس کے ہمراہ پارلر آئی تھیں۔ رائنہ خوب
صورت پرپل میکسی کے ساتھ نفیس سے میک اپ کے
ساتھ خوب جچ رہی تھی۔ لمبے قد اور متناسب سراپے
والی رائنہ یکسر مختلف اور دلکش دکھائی دے رہی تھی۔
جنت کا ڈریس اور میک اپ اس کی عمر کے حساب
سے بے حد لائٹ اور سوبر سا تھا۔ جیسے ہی ماحور کا
شوٹ مکمل ہوا، رائنہ نے عاقب کو کالیں بک کرنے
کے لیے کال ملا دی تھی۔

ماحور خاموش تھی۔ اس کا دل بار بار بھر آتا
تھا۔ صبح بھی خوب روئی تھی۔ زلیخا دادی اور ہومہ پاشا
کے گلے لگ کر کتنی ہی دیر آنسو بہائے تھے۔ اس کے
بعد سیف، ریان اور زوئی سبھی نے جی بھا کر پیار کیا تھا۔
جنت نے گھر پر رونے سے صاف انکار کر دیا تھا جبکہ
حویلی ہال میں رخصتی کے وقت روئے گی۔ اس کی بات
پر وہ سب ہی روتے سے ہنس دیے تھے۔ سیف اس
کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں لیے کتنی دیر اس کا چہرہ
دیکھتا رہا تھا۔

"اپیا۔ میں نے اور آپ نے بہت سا مشکل
وقت ایک دوسرے کے سہارے کاٹا ہے۔ جس وقت
ہمیں کچھ بھی میسر نہیں تھا اس وقت ہم دونوں ایک
دوسرے کو میسر رہے۔ آپ کے ساتھ ہنسا ہوں، آپ
کے ساتھ رویا ہوں۔ اب آپ کو اس گھر سے رخصت
کرتے وقت بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہوں۔ اس
لیے تاکہ آپ اس یقین کے ساتھ رخصت ہوں کہ
آئندہ بھی جب کبھی آپ کو رونے کے لیے کاندھا
اور ہنسنے کے لیے ساتھ درکار ہو تو بھائی کا سینہ حاضر
ہے۔ میں کبھی بھی آپ کو پیٹھ نہیں دکھاؤں گا۔ آپ
کی خوشیوں کے لیے آخری حد تک جاؤں گا۔ یقین
مانیں اپیا کہ میں نے آج کے دن کے لیے اپنا بیسٹ
ایفرٹ آپ کے حوالے کر دیا ہے۔" وہ اسے سینے
میں چھپائے اس کے آنسو جذب کرتا رہا۔ ننھا سا
سیف ایک چھتنار درخت کی مانند اس پر سایہ کیے
ہوئے تھا۔ زندگی نے اسے اس معاملے میں خوب
نوازا تھا کہ آج اس کے پلو سے مخلص اور کھرے
رشتے بندھے تھے۔

☆☆☆

ڈل گولڈن اور ایمرلڈ گرین شیر دانی اپنے لمبے

جوڑے وجود پر سجائے، سر پر سنہری کلاہ پہننے کی بجائے اسے کھول کر اس نے گردن میں ایک بل دے کر پگڑی کی صورت ڈال لیا تھا۔ وہ اسی میں ہی اس قدر منفرد اور وجیہہ لگ رہا تھا کہ جس وقت سنجیدہ چہرولے وہ کمرے سے باہر نکلا تو دادا اسے دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے۔ انہیں یقین تو تھا کہ ان کا مومن دلہا بن کر خوب جچے گا مگر وہ ایسا ہیرا دکھے گا، اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے بل کی تاخیر کیے بنا اس پر دم کیا تھا۔ صحن مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی سہرا بندی کا دادا کو از حد شوق تھا، اس کے لیے انہوں نے گنجائش سے زیادہ لوگوں کو بلایا تھا کہ سب ان کے لاڈلے پوتے کی اس رسم میں شریک ہو کر اسے اپنی دعاؤں سے نوازیں۔ وگرنہ ان کے گھر میں تو اس قدر مہمانوں کو ٹھہرانے کی گنجائش ہرگز نہ تھی۔ خاندان کے بزرگوں میں گھرا وہ روشن ستارہ لگ رہا تھا۔ روٹھا روٹھا سا باتونی سا، دادا کا بس چلتا تو اسے دل میں چھپا لیتے۔ شادیز جھٹ سے پھولوں کی لڑیوں سے سجا سہرا لیے حاضر ہوا تو مومن کے تمام طبق روشن ہو گئے۔

"دادا..... یہ کیا ہے.....؟" بغل میں کھڑے دادا کے کان میں تقریباً گھس کر کراہا۔

"اسے سہرا کہتے ہیں پوتے۔ دلہا کے منہ پر سجاتے ہیں تاکہ کوئی منہ نہ لگا سکے۔" دادا بھی دادا تھے۔

"مجھے دلہا بنا رہے ہیں یا لیلا (چھترہ)؟"

"ایک ہی بات ہے پتر۔ قربان تو دونوں ہی ہوتے ہیں۔"

"لوگ کیا کہیں گے دادا۔ میں یہ نہیں پہننے والا۔ بس۔"

"تیرا دادا بھی پہنے گا تو کس کھیت کی سنڈی ہے۔"

"تو دادا پہن لے۔ میں تو ہرگز نہیں پہننے والا۔ چار بندوں میں میری بھی عزت ہے دادا۔ میرے فرینڈز آ رہے ہیں آج۔ مذاق اڑائیں گے میرا۔"

"تیری غلط فہمی ہے۔ مذاق نہیں اڑائیں گے بلکہ اپنی شادیوں پر بھی پہنیں گے۔ لکھوا لے مجھ سے۔ اب اگر ایک بھی لفظ نکالا منہ سے تو لال رومال بھی تیری ناسوں (ناک) کے آگے رکھوا دوں گا۔ سمجھا۔" بالآخر دادا کو دھمکی آمیز لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ان سے بعید بھی کچھ نہ تھا۔ اور مومن کو سہرا اپنے چہرے پر سجانا ہی پڑا۔ شادیز بھی آف وائٹ شیروانی پہنے اپنی طرف سے شہ بالا بن کر اترا رہا تھا۔ مومن کے دور پار کے بھی کزنز اپنے طور پر شہ بالے ہی تھے۔ شادیز زبردستی یہ ٹائٹل خود پر ثبت کیے ہوئے تھا۔

"میں تو کہتا ہوں دادا کہ ایک دو لڑیوں کا سہرا میں بھی باندھ ہی لوں ورنہ میرا شہ بالا ہونا مشکوک ہو جائے گا۔ دیکھیں نا ہر کوئی منہ چک کے خود کو شہ بالا ہی سمجھ رہا ہے۔ ایویں ای۔ مفت میں۔" وہ کینہ توزی سے سب لڑکوں کو گھور رہا تھا جو الگ تھلگ گروپ کی صورت میں کھڑے تھے۔

"بالوں میں موتیے کے گجرے ڈال لے۔ دور سے ہی پہچانی جائے گی تو۔ میرا مطلب ہے پہچانا جائے گا۔"

دادا کی بات پر سارے عرصے میں پہلی بار مومن کے ہونٹوں کو ہنسی نے چھوا۔ سہرا بندی کے بعد رشتے داروں نے سلامیاں دیں جو دادا حق سمجھ کر اپنی جیب میں ڈال رہے تھے۔ مومن کو کپکپا فرق پڑتا تھا۔ اسے تو در حقیقت کسی بھی چیز سے فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ دل بے طرح اداس تھا۔ لاشعور میں ایک سوچ دعا بن کر گردش کر رہی تھی کہ کاش لڑکی عین وقت پر انکار کر دے۔ کاش اس کے ابا کو دل کا دورہ پڑ جائے اور شادی ملتوی ہو جائے کاش..... کاش..... کاش.....

آ جا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آ جا کہ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی ہے
خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس تیری کمی ہے

(محسن نقوی)

☆☆☆

برائڈل روم میں اس وقت خوب رونق تھی۔ سب لڑکیوں نے ماحور کو گھیرا ہوا تھا۔ اس کا دلہن بنا حسین روپ نگاہیں خیرہ کر رہا تھا۔ رائنہ اسے بٹھا کر خود مہمانوں کے پاس جا چکی تھی۔ بارات آنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔ زلیخا دادی اور نائمہ پاشا مہمانوں کے ساتھ بے حد مصروف تھیں پھر بھی گاہے بگاہے آکر ایک نگاہ اس چاند پر ڈال جاتیں جو تمام تر رعنائیوں کے ساتھ زمین پر اتر آیا تھا۔ ان کی نگاہیں سیر ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔ ماحور کا یہ روپ دل موہ لے رہا تھا۔ زلیخا دادی بار بار ماحور کو دم کرتیں اور نائمہ پاشا آنکھ کے کنارے آئی کی انگلی کی پور پر اکٹھا کرتی جاتیں۔ عقیل مغل نجانے کیوں بار بار سائے جیسا منڈلاتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر جگہ ہر کونے میں اس کا وہم سا ہوتا۔ باپ تھا، چاہے جیسا بھی تھا شاید آج ہوتا تو بہت خوش ہی ہوتا۔ زندگی سے کچھ لے کر نہیں گیا تھا عقیل مغل مگر اپنی بے شمار یادیں چھوڑ گیا تھا۔ کڑوی اور بے حد کڑوی۔ پھر بھی دانستہ دہرانے کو جی چاہتا تھا۔

وہ چپکے سے نظر چرا کر روم سے باہر نکل آئیں۔ اس وقت ماحور کے سامنے زیادہ دیر ٹھہرنے کا یارا نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں ٹھہرا ملال ان کے دل کو تاسف سے بھر رہا تھا۔ دل میں اس کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتے ہوئے وہ ہال میں موجود مہمانوں کی جانب بڑھ گئیں۔

اس ہال کی بکنگ سالک پاشا نے خود کروائی تھی۔ ہال کی سجاوٹ و خوب صورتی اور ارینجمنٹ اس قدر شاندار تھا جیسے کسی شاہ زادی کی بارات آنے والی ہو۔ اور سالک پاشا کی نگاہ میں ماحور کسی شاہ زادی سے کم ہرگز نہ تھی۔ رائنہ استقبالیے پر جنت کی معیت میں لڑکیوں کو ایک ترتیب سے کھڑا کرنے کے بعد ان کے ہاتھوں میں پھولوں سے بھری ٹوکریاں پکڑا رہی تھی۔ خواتین ہاتھوں میں گجرے اور ہار لیے بارات کے ساتھ آنے والی خواتین کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ سب کچھ مکمل تھا۔ ہر چیز پرفیکٹ تھی۔

سیف اور ریان تھری پیس میں ٹک شک تیار مصروف سے یہاں وہاں پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ نائمہ پاشا کا سینہ فخر کے احساس سے معمور تھا۔ کتنے پیارے قد کاٹھ تھے ان کے بیٹوں کے۔ اونچے لمبے اور چوڑے، عقیل مغل کی طرح۔ عقیل مغل ایک بار پھر یادداشت کے پردے پر سرسرانے لگا۔ وہ سر جھٹک کر زونی کی جانب متوجہ ہوئیں جو دوبارہ اپنی ٹائی کی ناٹ ان سے درست کروانے چلا آ رہا تھا۔ وہ مسکرا دیں۔ بھلا وہ جانتی نہ تھیں کہ زونی آنے بہانے سے ان کی توجہ حاصل کرنا تھا اور وہ جی جان سے اس پر ممتا نچھاور کرتی تھیں کیونکہ سب سے زیادہ ترسا ہوا وہی تو تھا جس نے ماں کا لمس کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اور جدا کر دیا گیا تھا۔ ناٹ درست کر کے انہوں نے اس کی پیشانی چومی تو عین اسی پل باہر ڈھول بجنے کی زوردار آواز گونجی۔ پٹاخے پھوٹنے کا شور اور بارات آ گئی۔ بارات آنے کا غلغلہ۔ زونی فوراً باہر کو لپکا تو نائمہ پاشا آسودگی بھرا سانس اندر کھینچتے ہوئے ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ سجائے استقبالیے کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

بارات ہال کے باہر پہنچ چکی تھی۔ مومن چہرے پر سہرا ڈالے تھکس سا فرنٹ سیٹ پر بیٹھا قربانی کا جانور لگ رہا تھا۔ محب بھائی گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے جبکہ دادا، شاویز کے میاں جی اور یونس نانا پچھلی سیٹوں پر براجمان تھے۔ شاویز کے لاکھ کرلانے کے باوجود بھی اسے دلہے کی گاڑی میں جگہ نہیں ملی تھی۔ باقی سب ہی گاڑیاں بھی بظاہر بھری ہوئی ہی دکھائی دے رہی تھیں اور مہمانوں کے لیے بک کروائی کوچ میں وہ بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔

"یہ غلط ہے دادا۔ شہ بالا دلہے کے ساتھ ہی بیٹھتا ہے۔ یہ میرے ساتھ زیادتی ہے۔ ایسے کسی کو کیسے پتا چلے گا کہ میں کون ہوں۔"

وہ دادا اور دیگر بزرگوں کو پچھلی سیٹوں پر پھیل کر

بیٹا دیکھ کر بولا۔
"رونا ہی یہی ہے کہ تُو شاویز ہی رہے گا۔ تیرا میڈ بدل نہیں جانا۔ دیکھ میری طرف۔" انہوں نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہا۔ "تیرا مسئلہ مومن کے ساتھ بیٹھنا ہے نا تو اس سے کہہ کہ تجھے گودی میں لے لے جا شاباش۔"
"دادا۔ یہ میری ہی جگہ پر آجائے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ میرے حصے کا اسے ہی لے جائیں۔ میں اف بھی کر گیا تو مومن تراب میرا نام نہیں۔" مومن کی چلچلاتے لہجے میں کی گئی اس آفر پر دادا نے اس کی پشت کو چلچلاتی نظروں سے گھورا اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔
"ایک بار۔ ایک بار مومن تُو رخصتی کروا کر گھر چل۔ بس اس کے بعد تُو میرے آگے ناک رگڑے گا مگر میں تجھے تیری ہی دلہن کے پاس پھٹکنے نہیں دوں گا۔"
"ہونہہ۔ یہاں کون مرا جا رہا ہے۔ سات پردوں میں چھپا کر رکھیے گا اسے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے سہرے کی لڑیوں کو کوفت سے مٹھی میں جکڑ کر پرے کیا اور پیچھے پلٹ کر دادا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ جواباً دادا نے اس پر چڑائی مسکراہٹ اچھالتے پر اکتفا کیا۔ شاویز کو اگلی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر جگہ مل گئی تو وہ شکر ادا کرتا فوراً وہاں فٹ ہو گیا۔
ہال کے باہر بارات پہنچتے ہی اس نے ڈھول والوں کو کوچ سے نیچے اتارا اور سب لڑکوں کے ہمراہ ہال کے مرکزی دروازے کے باہر پہنچ کر بھنگڑا پوزیشن سنبھال لی۔ دادا نے لاکھ کہا کہ وہ بینڈ لے کر جائیں گے مگر اس معاملے میں شاویز نے ان کی نہیں سنی تھی۔ بقول اس کے بینڈ پر رقص نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ڈھول والے ہی جائیں گے۔ جیسے ہی اس نے اشارہ کیا، ڈھول پر تھاپ پڑی اور تمام لڑکوں نے بھنگڑا ڈالنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ رونق بڑھنے لگی اور درمیانی عمر کے مرد حضرات بھی درمیان میں کود پڑے۔ دادا کی ہڈیاں اجازت نہیں دیتی تھیں ورنہ اکلوتے پوتے کی شادی کی خوشی میں وہ بھی ضرور ناچتے۔
سہرے کے پیچھے چھپے مومن کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے چہرے پر گیلا کمبل اوڑھ رکھا ہے۔ آنکھوں میں نیند سی بھرنی شروع ہو گئی تھی اس رکاوٹ کی وجہ سے۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر اپنے اندر تک سرایت کی ہوئی اکتاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یقیناً پہلا دلہا ہوگا جو اپنی شادی کو رتی بھر بھی انجوائے کرنے میں ناکام تھا۔ بارات کے استقبال کے لیے بلکہ درحقیقت اس کے استقبال کے لیے لڑکی والے ہال کے داخلی دروازے پر جمع ہو چکے تھے۔ سامنے مرد حضرات کھڑے تھے اور ان سے پیچھے کچھ فاصلے پر خواتین ہاتھوں میں ہار گجرے لیے کھڑی تھیں۔ اس نے ایک لمبا سانس کھینچ کر ذرا سی جھری میں سے مجمع پر نگاہ دوڑائی اور نگاہ کے آخری زاویے پر اسے ایسا زوردار شاک لگا کہ اس نے ایک ہی جھٹکے میں سہرا الٹ دیا۔ سامنے سیف، ریان اور زونی کے ہنستے مسکراتے چہرے اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

☆☆☆

بارات آگئی کا شور سنتے ہی اس کے جامد وجود کو جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ اندر تک تھرا اٹھی۔ موم کا مجسمہ پگھلنے لگا۔ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر اس نے قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ اس وقت اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ سب ہی بارات کا سن کر باہر نکل گئے تھے۔ اکیلے ہونے کا فائدہ اٹھا کر اس نے آنکھوں کا پانی بہنے دیا۔ اس وقت تو اس پر کوئی دفعہ نہیں لگ سکتی تھی۔ آج وہ رخصت ہونے والی تھی۔ وہ کھل کر رو سکتی تھی۔ اپنے ہاتھ کی پشت پر آنسو کا قطرہ دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس وقت مومن تراب بھی شاہانہ انداز میں اپنی من چاہی دلہن بیاہنے چلا ہوگا۔ پورپور سجی اس کی دلہن جب اس کے پہلو میں بٹھائی جائے گی تو کتنی چاہت سے اس پر نگاہ ڈالے گا۔ اس کی

شرارتی آنکھوں کے دیکھنے کا مخصوص انداز ماحور کے تصور میں ابھر کر اس کی تکلیف دوچند کر رہا تھا۔ نجانے کیوں ملا تھا وہ اسے جب ساتھ نہیں رہنا تھا۔ جب سالک پاشا ہی مقدر تھا تو وہ زندگی میں کبھی آیا ہی نہ ہوتا۔ آج وہ بھی فخر اور مان سے سالک پاشا کی زندگی میں شامل ہو جاتی۔ ایک ایسا شخص جو کتنے ہی دلوں کی دھڑکن تھا مگر اس کا دل ماحور کے نام پر دھڑکتا تھا۔ کیوں مومن تراب کیوں۔؟ تم ہی میرے جذبات کے ساتھ کھیلتے ہوئے ترس کھا لیتے۔ ایک بار سوچ لیتے کہ میں محرومیوں کا شکار ایسی لڑکی ہوں جسے زندگی کے دکھوں نے کبھی اتنی بھی فرصت نہیں دی تھی کہ وہ اپنی بے بسی پر ہی ہنس لے۔

ان ہی تکلیف دہ سوچوں میں گھری وہ آنسو بہاتی اپنے انگوٹھیوں اور مہندی سے سجے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جب اچانک دروازہ کھلا اور نکاح خواں کے ہمراہ سیف اور عاقب بھائی اندر داخل ہوئے۔ پیچھے خوشی اور غم کا امتزاج لیے چہروں کے ساتھ زلیخا دادی، عاصمہ پاشا اور انیس کاندھوں سے تھامے رائنہ اندر داخل ہوئی۔ وہ تینوں ایک جانب کھڑی ہو گئیں۔ سیف آگے بڑھ کر بہن کے پہلو میں بیٹھا اور اسے باپ سی شفقت کے ساتھ خود سے لگایا۔ عاقب بھائی نے نکاح خواں کو بسم اللہ کرنے کو کہا۔

"مسماۃ ماحور مغل ولد عقیل مغل آپ کا نکاح بعوض پانچ لاکھ حق مہر مومن تراب ولد حسن تراب سے کیا جا رہا ہے۔ کیا آپ کو قبول ہے؟"

اور ماحور مغل کے پیروں سے زمین ایسے کھسکی تھی جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے اسے ہوا میں معلق کر دیا ہو۔ اس کے حواس بری طرح سن ہوئے تھے۔ اسے یقین کرنا ناممکن تھا کہ جو الفاظ وہ آخری دموں پر بھی سننے کی امید نہیں رکھتی تھی وہی اس کے سامنے دہرائے گئے تھے۔ اس کی نظروں نے تیزی سے استعجاب سے بھی چہروں کو دیکھا اور پھر اس کا سر ڈھل کر سیف کے کندھوں پر آ گرا۔

☆☆☆

وہ لان میں بیٹھا، سفید شلوار قمیص اور بیرون میں گھریلو استعمال کی سادہ سیاہ چپل پہنے بھی بے حد خاص لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت کا سحر ہر لباس میں نمایاں ہوتا تھا۔ بھورے بال اس کی سوچوں کی طرح بکھرے بکھرے سے ماتھے پر گرے تھے۔ ٹیبل پر دھرا کافی کا مگ اب اتنا گرم نہیں رہا تھا۔ یعنی وہ خاصی دیر سے یہاں بیٹھا ماضی کے سمندر میں یادوں کے چپو چلا رہا تھا۔

ماحور کے بابا کی تدفین کے وقت جب وہ قبرستان پہنچا تھا تو اس نے سیف اور ریان کے ہمراہ مومن کو دیکھا تھا۔ جس قدر دھچکا اسے لگنا چاہیے تھا، اتنا لگا نہیں تھا کیونکہ اس کے لاشعور میں یہ بات بجھنا تی تھی کہ مومن کا ماحور کی فیملی سے کوئی نہ کوئی لنک ہے۔ وہ سیف اور ریان کے پاس جانے کے بجائے وہاں سے سیدھا دادا کے پاس آیا تھا۔ ان کے سامنے بیٹھ کر وہ کتنی دیر الفاظ ترتیب دیتا رہا تھا، اس دوران دادا مکمل پرسکون رہے تھے۔

"دادا..... میں حقیقت جاننے آیا ہوں..... بالکل سچ..... شاید میں اس سچ کو جانتا ہوں مگر مانے سے انکاری ہوں..... پھر بھی میں چاہوں گا کہ میرے سامنے سب کچھ کھل کر کہہ ڈالیں۔" بالآخر اس نے کہہ ڈالا تھا جو کہنے میں اسے دقت تھی۔

"کیا سننا چاہتے ہو سالک پتر۔ اگر سچ جانتے ہو تو پھر تم حقیقت کا سامنا کرنے نہیں آئے بلکہ اس حقیقت کو کھلی جامہ پہنانے کے لیے ہمت مستعار لینے آئے ہو..... کہو..... کیا ایسا ہی نہیں ہے۔"

اور سالک پاشا دادا کے اس تجزیے پر دنگ رہ گیا تھا۔ ان کے چہرے کی ہر جھری میں ان کی عمر کی ایک دہائی چھپی اپنے تجربے سینچ کر رکھے ہوئے تھی۔ اسے دادا پر رشک آیا، کتنے آرام سے دل میں اتر جاتے تھے۔

"مجھے یقین نہیں تھا دادا ورنہ اتنی دیر نہ لگاتا۔ ہماری کمپنی کے ایمپلائی کی شادی میں جو باتیں آپ نے مجھ سے کی تھیں، انہوں نے میرے شک کو یقین

میں بدلا تھا۔ مومن کے بجھے بجھے رویے نے اس یقین کو تقویت دی۔ ماحور کی بیزاری نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا۔ اس کے گھر والوں کے گھٹے گھٹے رویے نے میرا دھیان اس جانب کروایا۔ منگنی کی انگوٹھی میں پسند کر رہا تھا اور ماپ مومن جانتا تھا دادا۔"

"کیونکہ وہ اسے انگوٹھی پہنا چکا تھا۔ اس لیے ماپ جانتا تھا۔"

"کیا.....؟"

دادا کے اطمینان بھرے جواب نے اسے دنگ کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک لمبی سانس بھری اور سب کہہ ڈالنے کے لیے خود کو تیار کیا۔ مومن اور ماحور کی پسندیدگی سے لے کر منگنی اور پھر سالک پاشا کی چاہت دیکھ کر مومن کے قدم پیچھے ہٹا لینے سے لے کر ماحور اور اس کے بہن بھائیوں کے بہترین مستقبل کی خاطر خود پر بے وفائی کی تہمت لینے تک۔ عادل پاشا کی ماحور کے خلاف رچی سازش کو ناکام بنانے کے لیے اس کے مکان کی رجسٹری کے کاغذات اس تک پہنچانے تک۔ ہر ہر بات کہتے چلے گئے۔

اور سالک پاشا کا وجود بھربھری ریت کی مانند ہو گیا۔ اس پل وہ مومن تراب کے ظرف کا قائل ہو گیا تھا جو محبت اس طور بھی نبھانا جانتا تھا۔ وہ محبت میں دینے پر یقین رکھنے والا پیارا شخص اس کی خاطر صرف اپنی چاہت سے دستبردار نہیں ہوا بلکہ اپنی جان پر کھیل گیا۔ شرمندگی کا ساگر تھا جس میں وہ غوطے کھا رہا تھا۔ کتنا خود غرض ہو گیا تھا وہ۔ دل کے کسی گوشے میں شبہ ہوتے ہوئے بھی اس نے بے پروائی کی گرد اس پر بٹھا دی تھی۔ جان کر انجان بنا رہا تھا۔ کب کب قدرت نے اس کے سامنے حقیقت کا پردہ چاک نہیں کیا۔ تب جب وہ فائلز لینے گھر آیا تھا اور نائمہ پاشا کو اپنے آنے کا بتانے کے لیے ان کے کمرے کی جانب بڑھا تو ان کے منہ سے صاف صاف اس نے مومن کا نام سنا تھا۔ وہ دوسری طرف کسی کو ماحور کو سمجھانے کا کہہ رہی تھیں۔ وہ چند باتیں مزید سننے کے بعد وہاں سے فوراً ہٹا تھا اور ابی کو فائلز دینے خود ہی آفس واپس چلا گیا تھا۔ تب بھی اس نے مومن کا نام شعوری کوشش سے لاشعور میں دھکیل دیا تھا۔ وہ خود سے ہی لکن چھپی کا کھیل کھیلتا رہا تھا۔ اور اب جب وہ کھیل کھیل کر بری طرح تھک گیا تھا تو دادا کے پاس چلا آیا تھا۔

انہوں نے صحیح کہا تھا کہ وہ حقیقت جاننے نہیں بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمت پیدا کر رہا تھا۔ اپنی چاہت سے دستبردار ہونا اس کے لیے آسان تو ہرگز نہیں تھا مگر وہ اس احساس کے ساتھ ماحور کو کیسے اپنا لیتا کہ اس کے دل میں مومن تراب تھا۔ اگر ماحور کے رویے میں نرمی یا جھکاؤ ہوتا تو اس سارے قصے کو اس کا ماضی جان کر دفن کر دیتا مگر اس کے لیے مومن تراب ماضی بنا ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے وہی اس کا حال تھا جس میں وہ جیتی تھی۔

"میں ماحور اور مومن کے درمیان سے ہٹ جانا چاہتا ہوں دادا۔ مگر یہ سب اتنا آسان نہیں۔"

دادا پر تو جیسے ٹھنڈی پھوار برس گئی تھی۔ وہ یک دم چہکتے ہوئے بولے۔

"کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا پتر۔ بس نیت نیک ہو اور اٹل ہو تو وہ ہو کر رہتا ہے۔"

"تو پھر اب یہ سب کیسے ہوگا؟"

سالک کی بات کے جواب میں دادا نے جو پلان بتایا تھا آج اسی کے مطابق عمل ہو رہا تھا۔ مومن اور ماحور کو مکمل بے خبر رکھ کر عین وقت پر مومن کی بارات ماحور کو لینے وہاں پہنچ چکی تھی۔ دادا نے زلیخا دادی اور رائنہ کو اس سارے میں شامل کیا تھا۔ جب مومن کا پتا لینے کے لیے ماحور ہاسپٹل پہنچی تھی تب دادا اور شادیز ماحور کے گھر زلیخا دادی کے پاس بیٹھے سارے معاملات طے کر رہے تھے۔ زلیخا دادی پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ تو پہلے ہی مومن پر جی جان سے فدا تھیں پھر ماحور کی پسند سے زیادہ ان کے لیے اہم کیا ہو سکتا تھا۔ ایسے میں دادا مژدہ جاں فزا لیے چلے آئے تھے مگر انہوں نے ماحور

کو بے خبر رکھنے کا کہا تھا۔

"بہن جی۔ نہ آپ دلہن کو بتائیں گی نہ میں اس گھامڑ کو بتاؤں گا۔ دونوں کے دماغ خراب ہیں۔ اب جب حالات کا رخ بدلا ہے تو اپنی جھوٹی انا کا پرچم تھامے منڈیروں پر نہ چڑھ جائیں۔" دادا نے زلیخا دادی کو دھوکا کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولیں۔

"ہمم..... میرا مطلب ہے ناعمہ کو کون منائے گا بھائی جی۔ وہ تو سالک کے علاوہ کسی کے ساتھ ماہی کو بیاہنے پر راضی ہی نہیں۔"

"سالک ہی منائے گا..... یہ کام وہی کرے گا..... اس نے اپنے سر لیا ہے۔"

اور پھر اپنے دل کو خود ہی جلتے بھنتے خنجر میں پھینک کر اس نے ناعمہ پاشا کو اپنے آفس ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ گھر تو وہ چھوڑ کر جا چکی تھیں اس لیے آفس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ سارا معاملہ ان کے آگے رکھنے پر وہ یک دم ہتھے سے ہی اکھڑ گئی تھیں۔

"یہ کوئی مذاق نہیں ہے سالک بیٹے..... نہ میری بچی کوئی تماشا ہے..... آپ آخر کس کے بہکاوے میں آ کر یہ سب کہہ رہے ہو۔"

"بہکاوا نہیں ہے ماما..... پہلے تھا۔ میں غلط اندازوں کے ہنڈولوں میں جھولتا رہا یہ سوچے بنا کہ اس شادی کا خمیازہ سب سے زیادہ مجھے ہی بھرنا پڑے گا۔ میں آج بھی ماحور کا دل مائل ہو جانے کی چاہ رکھتا ہوں مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے اس کا دل موہ لینے کی دن رات دعائیں مانگی ہیں۔ میں نے کبھی خود کو اس طرح زیر ہونے نہیں دیا تھا کہ کوئی لڑکی میرے حواسوں پر اس قدر مسلط ہو جائے کہ میں اسے رام کرنے کے طریقے سوچا کروں گا۔ لیکن شاید یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔ میرے دل کے ہاتھوں جو خرابی دو دلوں کے بیچ میں ہوئی ہے اسے درست کرنے کی باری ہے اب۔ گو کہ یہ فیصلہ میرے لیے آسان نہیں مگر میں نے مومن سے سیکھا ہے کہ محبت کی سچائی اس کی نمائش سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ

اسے گھونٹ گھونٹ اپنے دل میں اتار کر اس کی جذب کر لینا ہی اس کی بقاء ہے۔"

اور ناعمہ پاشا کے پاس کہنے کو آگے کچھ لفظ نہیں رہا تھا۔ وہ شدت جذبات سے ہلکی پھلکی اس کے بعد سب کچھ اسی ترتیب سے ہلکا پھلکا جو دادا اور اس نے طے کی تھی۔ اس کے لیے بے حد جاں گسل سہی مگر وہ خوش تھا کہ اس پر خون تراب کا جو قرض تھا وہ اتر جائے گا۔

بہتے پانی کی تیز آواز پر اس کا ارتکاز ٹوٹا اور یک دم ہوش میں آیا تھا۔ مالی کچھ فاصلے پر پودوں میں پانی لگانے ابھی ابھی آیا تھا۔ اس نے کاٹی کے مگ پر ایک نظر ڈالی اور پھر ہاتھ بڑھا کر اسے ہونٹوں سے چھوا تو وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ پینے کا ارادہ ترک کر کے وہ اٹھنے ہی والا تھا جب اپنے پیچھے اسے اپنی کی آواز سنائی دی۔

"کب سے تمہیں کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا تم ایک ہی پوزیشن میں پچھلے سوا گھنٹے سے بیٹھے ہو سالک۔"

سالک اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کی الیکٹرک وہیل چیئر تھام کر اپنی کرسی کے مقابل لے آیا۔

"بس ابی۔ ایسے ہی آفس کے معاملات کے بارے میں سوچتے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔" وہ اپنی چیئر پر بیٹھتا ہوا لاپروائی سے بولا۔

"آفس کے یا ماحور کے؟" انہوں نے بلا توقف کہہ ڈالا تھا۔ سالک چونکا ضرور مگر ظاہر نہیں کیا۔

"آج تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس تھی سالک! لیکن شادی نہیں ہوئی۔ میں ایک ہفتے سے کہہ رہا تھا کہ گھر کو سجاؤ، لائٹنگ کرواؤ، پتا تو چلے کہ شادی والا گھر ہے مگر تم ٹال گئے..... مجھے بتاؤ سالک..... کیا ہوا ہے ایسا..... کہیں ایسا تو نہیں کہ ماحور بیٹی مجھ سے بدظن ہو ابھی تک..... اس نے شادی سے انکار تو نہیں کر دیا۔" ان کے لہجے میں فکر نمایاں تھی۔

سالک نے بغور انہیں دیکھا وہ پہلے سے کافی

بدل گئے تھے، رونا چلانا بالکل بند ہو چکا تھا، ملازم بتاتے تھے کہ وہ اکثر رات گئے تک جاگ کر قرآن پڑھتے رہتے تھے۔ اور پھر فجر کی نماز پڑھ کر سوتے تھے۔ ان کی اندر جو ٹھہراؤ آیا تھا وہ اسی کا نتیجہ تھا۔

سالک نے آگے کو جھک کر نرمی سے ان کا ہاتھ تھاما اور رسان سے بولا۔

"میں ماحور سے شادی نہیں کر رہا ابی۔"

"کیوں آخر..... وجہ بھی تو ہو..... تم چاہتے ہو اسے..... کیا عمہ نے انکار کیا ہے سالک؟"

"نہیں۔ میں نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے ہیں ابی۔ کیونکہ اس کا راستہ مومن تراب کی سمت جاتا ہے۔ وہی اس کی منزل ہے۔"

جواباً عادل پاشا یک دم بالکل خاموش ہو گئے۔ ان کی نظریں جھک کر اپنی گود میں آ رکیں۔

"آپ غلط فیصلہ مت کریں ابی۔ یہ سراسر میرا ذاتی فیصلہ ہے۔"

"میں کیسے نہ شرمندہ ہوں۔" وہ ان ہی جھکی نگاہوں سے گویا ہوئے۔ "ماحور تمہارے دل کی خوشی ہے۔ میں کیا جانتا نہیں کہ تم اس سے کس قدر محبت کرتے ہو۔"

"میری خوشی اس کی خوشی میں ہے ابی..... اور اس کی خوشی وہی ہے جس کی بارات آج اس کے دروازے پر کھڑی ہے۔ ابی محبت کا سودا ظرف کے ترازو پر مقررہ قیمت پر ملتا ہے، نہ ایک ٹکا کم نہ ایک ٹکا زیادہ۔ اور اب کی بار ظرف بڑا کرنے کی باری میری تھی۔"

"تو سالک تم..... تمہاری بارات..... کیا تمہاری بارات کسی کی چوکھٹ پر نہ جائے گی..... کیا تمہاری شادی نہ دیکھ سکنا میری سزاؤں میں سے ایک سزا ہوگی؟"

اور سالک پاشا کی نگاہوں کے آگے ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ فوراً اٹھا۔ عجلت سے اپنا موبائل اٹھایا اور جیب میں گاڑی کی چابی ٹٹولتے ہوئے عادل پاشا سے بولا۔

"ابی۔ مجھے ایک انتہائی ارجنٹ کام یاد آیا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکا واپس آؤں گا اور آپ کی اس بات کا جواب لازمی دوں گا مگر آپ ٹائم پر کھانا کھا کر میڈیسن لیں گے..... اوکے..... آپ دعا کریں جس کام سے جا رہا ہوں اس میں کامیاب لوٹوں۔"

اتنا کہہ کر وہ جھکا اور عادل پاشا کے ماتھے پر بوسہ دے کر تیزی سے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ گارڈ نے اس کے بیٹھتے ہی گیٹ کھول دیا اور وہ اسپیڈ میں گاڑی ریورس کرتا باہر نکلتا چلا گیا۔ عادل پاشا نم آنکھوں سے اسے اوجھل ہوتے دیکھتے رہے۔

☆☆☆

پھٹی پھٹی آنکھوں اور اڑی رنگت لیے یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے اسٹیج پر چڑھتی ماحور کو مومن تراب کے پہلو میں لا کر بٹھایا گیا تو بے یقینی اور حیرت دونوں کے چہرے سے مترشح تھیں۔ وہ سکتہ زدہ سا اسے اپنے برابر بیٹھتا دیکھتا رہا اور اس کے استقبال کے لیے کھڑا نہ ہو سکا۔ ماحور کی اپنی کیفیت بھی ہو بہو ایسی ہی تھی۔ اندر ڈریسنگ روم میں تو وہ غش کھا گئی تھی مگر اب جب کہ حواس لوٹ آئے تھے تب بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جام ہو چکی تھی۔ تین بار "قبول ہے" کہہ لینے کے بعد اور تین جگہوں پر دستخط کر لینے کے باوجود اسے یہ سب خواب ہی لگ رہا تھا۔ زلیخا دادی اور عمہ پاشا اس کی دگرگوں حالت کے باوجود خوشی سے دمکتے چہرے لیے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ سیف اور رائنہ ماحور کے ناک کی سیدھ میں اسٹیج سے نیچے کھڑے شرارت سے بھرپور تاثرات چہروں پر سجائے اس کی حالت سے حظ اٹھا رہے تھے۔ یہ سب کچھ مبادی سب کے لیے اچانک نہیں تھا محض ان دونوں کو ہی پردے میں رکھا گیا تھا۔

ماحور کے ہاتھوں کی لرزش کو مومن نے بغور دیکھا اور اس تمام عرصے میں پہلی بار کھل کر مسکرا دیا۔ اب وہ ساری سچویشن پر غور و خوض کرنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا۔ یقین کہ حد ہی ہو گئی تھی۔ اس کی ناک

کے پیچھے دادا اور شاویز اتنا جاسوسانہ پلان تیار کر کے عملی جامہ پہنا چکے تھے اور وہ گاؤدی بنا منہ اٹھا کر بنا سوچے سمجھے اس پلان کا حصہ بنتا چلا گیا تھا۔ مگر ہنسی اسے اس بات پر آ رہی تھی کہ وہ اکیلا بے وقوف نہیں بنایا گیا تھا بلکہ ماحور بھی بالکل بے خبر تھی۔

"دادا....." اس نے اپنی بائیں جانب بیٹھے دادا کو دھیرے سے پکارا۔ "یہ سب کیا ہے دادا..... ماحور کہاں سے آ گئی.....؟"

"بس بیٹا۔ آسمان سے ٹپک پڑی۔ اس سے پہلے کہ کھجور میں اٹکتی، میں نے چھڑی کی مدد سے لپک کر کھینچ لیا۔" بڑی متانت سے جواب دے کر ساتھ ہی پینترا بدل کر بولے۔ "کہاں سے آئے گی گھامڑ۔ اپنے اماں باوا کے گھر سے آ رہی اور کیا۔"

"تو دادا یہ سالک کہاں ہیں۔ ماحور کی شادی تو ان سے ہو رہی تھی۔ کیا چکر ہے یہ دادا۔"

"ایک رپٹا ماروں نا تیرا منہ دوسرے پاسے جا لگے گا۔ سر سالک سے ہو رہی تھی۔" انہوں نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ "جیسی شوخی تو نے ماری تھی ویسی شوخی اب کے سالک نے مار لی۔ کمینے میری ہڈیاں مرکی ہو گئیں تیرا بیاہ ماحور سے کروانے میں اور تجھے اتنے نازک وقت میں بھی یہی چول مارنی یاد آئی کہ اس کا بیاہ تیرے باس سے کیوں نہیں ہوا۔ مار مار کرنا تیرا منہ چٹنے جیسا کر دینا چاہیے۔"

دادا کی ایسی شاندار کھنچائی کرنے پر مومن کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ اس سے پہلے کہ چار مہمان اس طرف کان لگاتے اس نے اپنا دھیان ماحور کی جانب لگایا جس کے چہرے کے نقوش میں رفتہ رفتہ خوں خواری سی آتی جا رہی تھی۔ مومن نے تھوک نگل کر گلا تر کیا اور سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں مخاطب ہوا۔

"میں نے کہا..... یہ سب تو ناقابل یقین ہے..... کیا تم سچ میں میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟"

"دادا سے کہو رکھ کر ایک چماٹ ماریں تمہیں۔ خواب کی حقیقت دکھ جائے گی۔" ماحور سے ایسے سڑے ہوئے جواب کی ہی توقع تھی۔ مومن کو تسلی ہوئی کہ یہ خواب نہیں تھا۔

"ماہی۔ میرا تو دل کر رہا ہے کہ خوشی سے چلانگیں مارنا شروع کر دوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو پا رہا یہ سرپرائز۔"

"ماحور..... میرا نام ماحور ہے..... اور چلانگیں کیوں نہ لگاؤ گے..... بندر جو ٹھہرے۔"

"اور میری بندریا میرے ساتھ بیٹھی ہے۔"

"بکو مت۔ خبردار جو مجھ سے فری ہونے کی کوشش کی ہو تو..... منہ توڑ دوں گی تمہارا۔"

"منہ ٹوٹ جائے خیر ہے۔ شکر ہے دل دوبارہ جڑ گئے یہی کافی ہے۔"

"کس نے کہا دل جڑ گئے۔ تمہارے جیسے ہرجائی کو میں ٹوٹی چپل نہ دوں، دل تو بہت قیمتی ہے میرا۔"

"اچھا جی۔ تب ہی سالک پاشا کے حوالے کر دیا تھا اتنے آرام سے۔"

"کیا.....؟" وہ دبا دبا سا غرائی۔ "میری کوئی کمٹمنٹ نہیں تھی سالک پاشا سے۔ جب تم نے مجھے چھوڑا تب مجھے اس سے بہتر آپشن کوئی نہیں لگا اور غصے میں اس سے شادی کی حامی بھری تھی میں نے۔"

"میں نے تمہیں چھوڑا نہیں تھا ماہی۔ اب تمہیں لے کر گھر ہی جانا ہے نا، تسلی سے سب بتاؤں گا۔ اپنے دل کا ہر حال سناؤں گا۔"

"ہونہہ۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تمہارے دل کا حال سننے میں۔ تمہیں رومینس کرنا کبھی آ ہی نہیں سکتا مومن۔"

"نہیں نہیں..... آتا ہے..... آج ثابت کر دوں گا۔"

"بکو مت۔"

"تم دونوں بکنا بند کرو ورنہ انجام اچھا نہیں ہو گا۔ سمجھے۔" رائنہ جو کب سے ان کی پشت پر کھڑی دونوں کی تکرار پر کان لگائے ہوئے تھی یک دم اچک

کر بولی۔

"غضب خدا کا۔ دانتوں پسینہ آ گیا ہمیں، تم دونوں کی شادی کروانے کے چکر میں۔ شیطان کی طرح ہر دوسری جگہ پر ٹپک کر اس بھلے مانس سالک لو تم دونوں کی محبت کے ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی۔" ہر حیلہ حربہ آزما ڈالا اور تم دونوں ہو کہ کسی کی نیکی کو پانی ہی دینا نہیں جانتے۔ لڑ مرا ایسے رہے ہو جیسے پہلے ایک دوسرے کے لیے مر رہے تھے۔ چپکے بیٹھے رہو اب دونوں ورنہ بلاتی ہوں زلیخا دادی کو۔ وہ کتے لیں گی نا سارے فیوز ہی آف ہو جائیں گے دماغ کے۔"

اور دونوں نے اپنے چہرے فوراً سیدھ میں اکڑا لیے تھے۔

ناعمہ پاشا نے رسم کے طور پر زلیخا دادی کو خوب صورت اور انتہائی قیمتی رسٹ واچ تھمائی تاکہ وہ مومن کو پہنا دیں۔ دادا اور شاویز کو بھی سیف نے گھڑیاں پہنائی تھیں۔ شاویز کی گردن فخر سے اکڑی جا رہی تھی۔ اسے ایسے پروٹوکول کی امید نہیں تھی۔ وہ ہر ایک کے پاس جا جا کر اپنی گھڑی کی نمائش کرتا پایا جا رہا تھا۔

"بس جی۔ شہ بالا بنا تھا نا۔ اگلوں نے مجھے بھی ڈال دی۔ ہی ہی۔ ہی ہی ہی۔" اسی شوخی میں میاں جی کے سامنے بازو لہرا کے نکالا اور انہیں بھی دکھائی اور بولا۔

"میاں جی۔ آپ کی گھڑی میں کیا وقت چل رہا ہے بھلا۔ میرے ہاں تو ساڑھے سات بج رہے ہیں۔"

میاں جی اس کی کلائی کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"گھڑی تو اچھی ہے مگر تیرا وقت برا چل رہا ہے ناہنجار..... دو لتر ماروں گا نا سارے ہند سے یہیں نکل آئے گا۔ ہٹ پرے۔"

شاویز دبک کر دوبارہ اسٹیج کی جانب بڑھ گیا جہاں رائنہ اور بہت ہاتھ میں دودھ کا سجا ہوا گلاس لئے لڑکیوں کا جمگھٹا لیے اسٹیج پر چڑھ چکی تھیں۔

شاویز بجلی کی تیزی سے لپکا اور مومن کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ بھلا سامنے ایسی حسینائیں بھکاری بنی بیٹھی ہوں تو کون پاگل ان پر خزانوں کے منہ نہ کھول دے۔

"چلو جی۔ مومن صاحب! نکالو پیسے اور اپنی خوشی کو تول کر نکالنا۔ آج تو دریا دلی کی حد ہو جانی چاہیے۔" دودھ کے چند گھونٹ شرافت سے پلا دینے کے بعد رائنہ نے نیگ کا مطالبہ کیا۔

"خوشی کو تولوں تو بدلے میں اپنی جان ہی دے سکتا ہوں۔" مومن کے جواب پر سارے میں ہاہا کار مچی۔

"پتر۔ تم لوگ مومن ہی رکھ لو۔ دلہن ہم لے جائیں گے گھر۔" دادا نے مومن کو دیکھتے معنی خیز لہجے میں کہا۔ وہ اسے باور کرا رہے تھے کہ کیسے وہ مچل مچل کر اس شادی سے انکاری تھا۔

"نہیں نہیں۔ دادا بھلا میرے بغیر کیا کریں گے آپ گھر..... میں نیگ دیتا ہوں نا۔" مومن نے سرعت سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے کئی نوٹ جنت کی ہتھیلی پر دھر دیے۔ شکر تھا کہ یہ بھی دادا نے نکلتے ہوئے زبردستی اس کی جیب میں ٹھونسے تھے۔ ویسے بھی اسے رخصتی کی جلدی تھی۔ ایک طویل داستان تھی جو کہنی سننی باقی تھی اگر ماحور آج کچھ بھی سننے کے موڈ میں آ پاتی تو.....

رخصتی کے وقت زلیخا دادی اور ناعمہ پاشا سے گلے ملتے ماحور ضبط کھو بیٹھی۔ یہ اس کے اپنے، جنہوں نے آج اس کی جھولی میں زمانے بھر کی خوشیاں ڈال دی تھیں۔ نجانے کیسے کیسے کشٹ اٹھا کر یہ سب ہوا تھا۔ سالک پاشا نے قدم کیسے پیچھے ہٹائے ہوں گے، یہ جاننے کی اسے بھی حاجت تھی مگر فی الوقت تو اس کا روم روم رب کے آگے سجدہ ریز تھا جس نے مومن سے جدائی کو ایک بھیانک خواب کی صورت جھٹکے سے ختم کر ڈالا تھا۔

"میں جانتی ہوں، میری بیٹی کو مجھ سے بہت سے گلے ہیں، میں تمہیں زندگی بھر کچھ نہیں دے

پائی، تم نے میرے حصے کی ذمہ داریاں اٹھائیں، انہیں احسن طریقے سے نبھایا۔ میں تمہاری مقروض تھی میری بچی لیکن میرا قرض سالک نے اتار دیا۔ یہ سب اسی کی وجہ سے ممکن ہو سکا وگرنہ تمہاری ماں اس مقام پر بھی ہار جاتی آج۔" نائمہ پاشا اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں لیے لگاتار بہتے آنسوؤں کے درمیان بولیں۔ "میری دعا ہے کہ تم مومن کے ساتھ اپنی زندگی کی آخری سانس تک خوش اور آباد رہو۔ کبھی گرم ہوا کا جھونکا تم دونوں کی محبت کو نہ چھوئے۔"

ماحور نے ان کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ الفاظ اس کے پاس جیسے ختم ہو چکے تھے اور آنکھوں کا پانی تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ زلیخا دادی نے دوپٹے کے پلو سے ناک پونچھتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔

"بس کرو لڑکیوں..... بس..... دعاؤں کی گھڑیاں ہیں نمو۔ پلو بھر بھر کر اسے روانہ کرو۔ آج تو اللہ نے مقدروں والا دن دکھایا ہے۔ چل ماہی۔ بیٹھ میرا بچہ گاڑی میں۔"

"رائنہ۔" ماحور کے لبوں سے سسکی کی صورت رائنہ کا نام نکلا اور وہ متورم آنکھیں لیے جھٹ سے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"تمہیں کیا کہوں رائنہ! تمہارے اندر میں نے دوست، بہن، ماں۔ ہر رشتہ پایا۔ تم ہر مشکل میں میرے ساتھ کھڑی رہیں اور آج تم نے میری زندگی کو مسلسل عذاب کی بھینٹ چڑھنے سے بچا لیا رائنہ۔"

"بکواس نہ کرو زیادہ۔" رائنہ نے لمبی سی شوں کرتے ہوئے اسے گھرکا۔ "میں مزید بھی تمہارے لیے کچھ کر سکتی تو ضرور کرتی۔ دوستی جیسے انمول رشتے اگر اخلاص کے پیرہن میں لپٹے ہوں تو وہ قدرت کا بہترین تحفہ ہوتے ہیں۔ اب بس کرو، مجھے زیادہ نہ رلاؤ ورنہ ابھی دادی بولیں گی۔ "مینڈکی کو زکام ہو گیا۔"

اور وہ دونوں روتے سے ہنس دیں۔ ریان، زونی اور جنت نے روتے ہوئے اس سے لپٹ لپٹ کر اسے رخصت کیا۔ وہ ان سب کی ماں جایا تھی مگر ماں بن کر پالا تھا اس نے انہیں۔ سیف آگے بڑھا اور احتیاط سے اسے تھام کر اس کا سر چادر گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بولا۔

"اپیا۔ یہ پیار بابا کی طرف سے تھا۔ آج وہ ہوتے تو یقیناً آپ کو وداع کرتے وقت ماتھے پر پیار کرتے، آپ کا سر چومتے۔" وہ دروازے پر ٹھہرا اپنے آنسوؤں پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ "اپیا میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں مگر میں نے ہر ہر موقع پر آپ کے سر پر کھڑے رہ کر خود کو آپ کا سرپرست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی بھی زندگی میں کوئی مشکل پروبلم ہو اپنے بھائی کو باپ کی جگہ جان کر آواز دیجیے گا اپیا۔ ان شاء اللہ میں آپ کے میکے کا مان کبھی نہیں ٹوٹنے دوں گا۔"

ماحور نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے اور انہیں چوم کر چند مل سیف کی آنکھوں میں دیکھتی رہی جو سرخ ہو رہی تھیں۔ آج وہ اپنے پیاروں کو چھوڑ کر پیار کی گلی چلی تھی۔ ساجن کا گھر آباد کرنے چلی تھی۔ یہ سب رشتے اس کی ہستی کے ستون تھے جن کے سہارے اس نے مشکل دن کاٹے تھے اور آج ان ہی کی بدولت آنے والا خوب صورت وقت اس کا منتظر تھا۔ سیف نے دھیرے سے دروازہ بند کیا تو دوسری جانب بیٹھے مومن تراب نے پورے استحقاق اور محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ گاڑی اسے لیے اس کی سلطنت کی جانب رواں ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ایئر پورٹ پر حسب معمول مسافروں کا رش تھا۔ آنے والوں کا بھی اور جانے والوں کا بھی۔ ابرش، منصور راٹھور اور مسز منصور کے ساتھ ایئر پورٹ پہنچ چکی تھی۔ اس کی فلائٹ کا ٹائم ہوا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ گھر میں ہی پاپا اور ماما سے مل لینا چاہتی تھی مگر مسز راٹھور بضد تھیں کہ وہ خود سی آف کرنے ایئر پورٹ جائیں گی۔ وہ ان کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اب اسے ایک طویل عرصہ پاپا سے دور رہنا تھا۔ اس کا جلد پاکستان واپسی کا کوئی

ارادہ نہیں تھا۔ وہ وہاں جا کر اپنے بھائی ارسل کو آہستہ آہستہ مائل کرنے والی تھی کہ وہ ماما پاپا کو بھی سٹڈی سیٹل ہونے کے لیے فورس کرے مگر ابھی تو اسے بس جلد از جلد یہ شہر اور یہ ملک چھوڑ دینا تھا۔

"آج ماحور کی بارات تھی، سالک پاشا دلوں پر بجلیاں گراتا اسے بیاہنے پہنچ چکا ہوگا۔ کس قدر خوش ہوگا وہ اپنی من چاہی مراد پا کر۔ کیا ایک بار بھی اسے میرا خیال آیا ہوگا۔ وہ کیوں بھلا۔؟ کتنی پاگل ہوں میں بھی، آج تو اس کا دھیان پل بھر کو بھی چوکنے سے رہا۔ پہلو میں ماہ رو تھی تو اسے بجھتے ستاروں سے کیا مطلب۔"

ایسے کتنے ہی خیال اسے ایک تار آتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر اذیت پیتی درد سہہ رہی تھی۔ وہ فوراً مسز منصور کے گلے آ لگی، اسی بہانے آنکھ بہتی تو عجب نہ لگتا۔ پاپا نے بھی اسے پیار کیا اور اس کے چہرے کو تسلی آمیز انداز میں تھپتھپایا، جیسے اسے مضبوط رہنے کا کہہ رہے ہوں۔ وہ آنسو پونچھتی ایک ہاتھ سے اپنی ٹرالی تھام کر اور دوسرے میں ٹکٹ اور پاسپورٹ تھامے سیکیورٹی آفیسر کی جانب بڑھی۔ سیکیورٹی آفیسر کو دونوں چیزیں دکھانے کے بعد وہ ڈیپارچر ٹرمینل میں اپنی ایئر لائن کے کاؤنٹر کی طرف چل دی۔ آنکھیں مسلسل ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور ان آنسوؤں میں سالک پاشا کا ہی عکس تیرتا اسے ہلکان کیے دے رہا تھا۔ وہ چہرہ جھکائے چلے جا رہی تھی جب اچانک عقب سے اس کے نام کی پکار پڑی۔

"ابرش۔"

وہ یک دم ساکت ہوگئی۔ اس کی دھڑکنیں بھی جیسے جم سی گئیں۔ یہ سالک پاشا کی آواز تھی۔

"نہیں..... نہیں..... میرا دماغ خراب ہے بس۔ بھلا سالک پاشا کا یہاں کیا کام....." اس نے دل میں سوچا اور پلٹے بنا دوبارہ قدم آگے بڑھائے مگر اب کی بار کسی نے پکارا نہیں تھا بلکہ اس کے جس ہاتھ میں اس کی ٹکٹ اور پاسپورٹ پاس تھا، اس ہاتھ کی کلائی کسی نے تھام کر اس کا رخ ایک جھٹکے سے اپنی جانب کیا تھا۔ سامنے سالک پاشا وہم کی نہیں یقین کی صورت ہلکا سا مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھیں لیے قریب المرگ ہوگئی۔ یہ وہ گمان تھا جو وہ مر کر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہونٹوں پر قفل لیے وہ یک ٹک اسے دیکھے چلی گئی۔

"کہاں جا رہی ہو۔" یہ سالک پاشا ابرش سے پوچھ رہا تھا..... یا حیرت.....

"مت جاؤ ابرش۔"

اس ایک فقرے میں کیا نہیں تھا۔ التجا، مان، اپنائیت۔

ابرش کا دل پانی بن کر بہہ گیا۔ اس کے عارضوں پر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"کیوں رکوں..... کس لیے..... کس کے لیے.....؟" لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے اس کی زبان سے ادا ہوئے۔

"ان تینوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے، میرے لیے۔"

"آپ کے لیے بھی کیوں..... آپ میرے کیا لگتے ہیں جو رک جاؤں؟"

"میں نہ سہی، تم تو میری لگتی ہو نا جس کے لیے میں بھاگتا ہوا آیا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو تمہارا جانا میری ساری زندگی کا زیاں بن جائے۔"

اس کے مدھم لہجے نے ابرش کی دھڑکنوں کو مرتعش کیا تھا۔ اس نے پلکیں جھکا لیں مگر چہرے پر خفگی قائم تھی۔

"آپ کی زندگی کا حاصل، آپ کے حوالے تو کر دیا، اب سود و زیاں کیسا۔"

"میری زندگی کا حاصل وہ نہیں تھا ابرش، جو مجھ سے اتنا ہی دور ہوتا چلا گیا جتنا میں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی، بلکہ وہ ہے جسے میری قسمت میرے اس قدر پاس لے آئی جتنا میں نے اس سے دور ہونے کی کوشش کی۔"

ابرش کے گال یک دم دہک اٹھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے گالوں پر ٹھہرے آنسو صاف کیے اور لہجے میں ہلکا سا تناؤ لیے بولی۔

"اب آپ نے بہت دیر کر دی سالک پاشا۔ آپ کی بے اعتنائی کے غم نے رس رس کر میرے پورے وجود میں سیسن بھر دی ہے۔ ہر جذبہ مرجھا کے دم توڑ گیا ہے۔"

"محبت کا پانی کسی بھی جذبے کو مرنے نہیں دیتا ابرش۔" نجانے اس کے لہجے میں کیسی کسک تھی کہ ابرش نے بے اختیار اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ سالک نے پہلی بار جسارت کرتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور بولا "میں یہ نہیں کہتا ابرش کہ تمہاری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں یہاں چلا آیا ہوں — بلکہ میں اس محبت کو بچانے آیا ہوں جو کسی کے شفاف دل میں میرے لیے مہکتی ہے — میں بڑے لمبے سفر سے لوٹا ہوں ابرش۔ میری تھکن کو چن لو — میرا وعدہ ہے تم سے زیادہ محبت میں تمہیں لوٹاؤں گا — بس کچھ وقت کے لیے مجھے سمیٹ لو — میرے دل کو اپنی چاہت کے شفاف پانی سے دھوتی رہو، ایک دن اس پر فقط تمہارا ہی عکس رہ جائے گا۔ میرا یقین کرو — مگر مجھے چھوڑ کر مت جاؤ ابرش — ایک بار میں نے تمہیں ٹھکرایا تھا — اس کی سزا اذیت ناک تھی — اب تم مجھ سے وہی سلوک مت کرو — پلیز — مت جاؤ — مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

اور ابرش راٹھور کو اس سے موت بھی آ جاتی تو زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اس کے نیناں پھر سے چھم چھم برسنے لگے مگر اب کی بار اس پانی میں ساری کثافت دھلتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی پیشانی سالک پاشا کے ہاتھوں پر ٹکا دی جن میں ابھی بھی اس کے ہاتھ مقید تھے۔ یہ مقدر کی تھی کہ وہ الفت کی راہ پر ایک بار پھر اس کے ہمراہ گامزن ہونے کو تیار تھی۔

"چلو پھر —" سالک نے نرمی سے اس کی ٹھوڑی اوپر کی اور بولا۔ "باہر تمہارے ماما پاپا ہمارا انتظار کر رہے ہیں — وہ جانتے ہیں کہ میں تمہیں واپس لے جانے آیا ہوں۔"

کبھی کبھار زندگی ایسا پلٹا کھاتی ہے کہ وہ تصوراتی محسوس ہونے لگتی ہے۔ واپسی کے لیے

سالک پاشا کے سنگ قدم بڑھاتی ابرش راٹھور کو ہو بہو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ راہ ہموار ہونے میں کچھ وقت لگے گا مگر اپنی محبت پر اسے ہمیشہ سے یقین تھا۔ ایک خلش زدہ سی سالک پاشا کے سینے سے چپکے سے خارج ہو رہی تھی۔ ابرش کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کے غم کا ازالہ ممکن نہیں تھا مگر ابرش کو بھی کھو کر دوبارہ اذیت کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور اتنا تو اسے یقین تھا کہ ابرش کی سفید پری سے جو انسیت اس کے دل میں پھوٹی تھی وہ کبھی نہ کبھی چاہت میں ضرور ڈھل جائے گی۔

☆☆☆

بارات دلہن لے داوا کے گھر پہنچ چکی تھی۔ سارا گھر بے تحاشا جگمگا رہا تھا یا مومن تراب کو لگ رہا تھا ہر شے جگر جگر کر رہی تھی۔ داوا کے وجود میں جوانی لوٹ آئی تھی۔ قدم رکھتے کہیں تھے پڑتے کہیں تھے۔ نظر سے بار بار آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ ماحور کو لا کر برآمدے میں دھرے خوبصورت منقش جھولے پر بٹھایا گیا جو داوا نے خاص اسی مقصد کے لیے منگوایا تھا۔ لاؤنج چھوٹا سا تھا اور مہمان خاصے تھے۔ اندر سجاوٹ کی صورت میں رش ہو جاتا۔ شاویز کی بھابھی نے اور چند دیگر رشتے دار خواتین نے رسمیں ادا کیں۔ ماہی شوکت اور اس کی بہو بیٹی نے سارا گھر سمیٹ رکھا تھا اور اب بھی بڑے سلیقے سے سب تھکے ہوئے مہمانوں کو چائے سرو کر رہی تھیں۔ ماحور کے حسن کی چکاچوند نے جیسے سارے صحن میں اجالا کر رکھا تھا۔ مومن بار بار آ کر پاس منڈلاتا مہمانوں کے چھیڑنے کا منتظر تھا۔ داوا کن انکھیوں سے اس کی بے چینی دیکھ رہے تھے۔ کچھ وقت گزرا اور ہنگامہ سرد پڑنے لگا۔ شاویز کی بھابھی نے ماحور کو اس کے کمرے میں پہنچایا۔ بہترین فرنیچر سے اور نفاست سے آراستہ کیا گیا بیڈ روم بے حد خوب ناک سا لگ رہا تھا۔ اسے بیڈ پر سلیقے سے بٹھا کر اس کا لہنگا پھیلا کر بھابھی اسے پیار کرتی باہر جا چکی تھیں۔ اب وہ فرصت سے سارے کمرے کا جائزہ لے لی۔ ہر شے قیمتی اور اعلا تھی مگر اس کے جہیز کی نہیں تھی۔ ماہی

بنانے محض اس کے زیور کپڑے بنائے تھے یا بہت سردی کچھ سامان۔ فرنیچر کے لیے بقول ان کے مالک پاشا نے منع کر دیا ہے تو پھر یہ سب کچھ یقیناً مومن تراب نے اس لڑکی کے لیے خریدا ہوگا جس سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ طیش اور غضب اس کے چہرے پر ایک بار پھر چھب دکھلانے لگا۔

"کتنا بھونچکا رہ گیا تھا مجھے اسٹیج پر آتا دیکھ کر..... نجانے کیا چکر چلا ہے۔ سب کچھ اچانک سے بدل کیسے گیا۔" وہ خود ہی بڑبڑاتی ہوئی اردگرد نگاہیں پھیرتی جا رہی تھی۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کا عکس بے حد دلکش تھا۔ وہ محجوب سی ہو کر گردن جھکا گئی۔ باہر مہمان خواتین سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر والے پورشن میں چلی گئیں اور مردوں کی کھیپ کو میاں جی اور محب بھائی، دادا کی خاص ہدایت پر بخوشی اپنے ہاں لے گئے۔ آج رات وہاں قیام کا خصوصی بندوبست کیا گیا تھا۔

"پیتر محب۔ کوئی کمی نہ رہے۔ ناشتے پانی کے خرچے کی فکر نہ کرنا۔"

"ارے دادا۔ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مومن ہمارا بھائی ہے اور آپ کے مہمان ہمارے سر آنکھوں پر۔ بے گانگی کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

"چل پھر شاوا..... بس رات ادھر کوئی نہ آنے پائے..... سمجھ گیا نا پتر۔"

جواب میں محب بھائی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ کچھ کچھ انہیں اندازہ تو تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ شاویز کو دادا کے پاس چھوڑ کر خود گھر روانہ ہو گئے۔ سارا صحن بالکل خالی تھا اب۔ تبھی مومن خود کو لاپروا ظاہر کرتا دھیلے قدموں سے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ سامنے ناک کی سیدھ پر دادا اور شاویز اپنی اپنی کمر پر ہاتھ باندھے جیسے اسی کے استقبال کو کھڑے تھے۔

"ہی ہی۔" مومن انہیں دیکھ کر بے تکی ہنسا۔

"ہی ہی۔" جواباً ویسی ہی ہنسی ان دونوں کی طرف سے اچھالی گئی۔

"رات بڑی ہو گئی دادا۔ باہر دوست آ گئے تھے کچھ۔ بڑی مشکل سے بھیجا ہے یہ کہہ کر کہ میرے دادا ناراض ہوں گے۔ جاؤ اب۔ ہی ہی۔" وہ بے ڈھنگی تاویل دیتا مضحکہ خیز دکھ رہا تھا۔

"ہی ہی۔" ایک بار پھر وہی ہنسی اس کی جانب لوٹا دی گئی تو وہ نگاہیں چراتا کمرے کی جانب بڑھا۔ دو قدم بھی نہیں چلا ہوگا کہ گردن کو لگنے والے زوردار جھٹکے نے آنکھوں کے آگے ترمرے سے نچوا دیے۔ دادا نے اس کی شیروانی کے کالر میں اپنی چھڑی کی ہتھی پھنسا کر اسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کدھر چلے مومن میاں۔ بھول گئے کیا۔ دلہن بیاہ کر لانے تک کی ذمہ داری تھی تمہاری۔ اس کے بعد اس کی صورت و سیرت، کسی چیز سے دلچسپی نہ رکھنے کا عہد باندھا تھا تم نے..... اب کدھر..... بولو....."

"دادا۔ ایک تو اتنا جان لیوا مذاق کیا گیا میرے ساتھ۔ لے کر کس کے لیے گئے اور سامنے کون آ گئی۔ دلہن جان جاتے جاتے رہی ہے میری۔ اوپر سے نئی سزا سنا رہے ہیں۔"

"جس کے لیے لے کر گئے تھے، وہی سامنے بھی لائے ہیں..... سمجھا..... مگر ٹوبنا ہوا تھا دکھ کا مارا بنجارا۔ ہوش سے جانچ لیتا سب کچھ تو سمجھ بھی لیتا۔ بڑی باتیں سنا رہا تھا نا مجھے کہ دادا اب آپ جہیز بھی لیں گے۔ لعنت دادا..... یہ اتنا سارا جہیز لے رہے ہیں آپ..... دادا یہ..... دادا وہ....." دادا لہک لہک کر اس کی نقل اتارتے ہوئے بولے۔ شاویز نے ہنستے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ مومن نے اسے گھور کر دیکھا۔

"دادا مجھے کیا پتا تھا کہ یہ سب فرنیچر آپ اپنے پیسوں سے خرید رہے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار آپ نے اتنا بڑا دل کیا۔ ورنہ آپ نے تو ایک ڈوئی تک نہیں خریدی تھی کبھی۔"

"مگر اب دادا نے سب ڈوئیاں نئی خرید لی ہیں مومن اور پرانی کو شاندار استعمال میں لانے والے ہیں۔" شاویز نے اپنے بالوں سے بھرے سر کو سہلاتے ہوئے اور مزا لیتے ہوئے کہا۔

"دادا..... میں جاؤں اندر.....؟" اس وقت مومن کو دادا کے پاؤں بھی پڑنا پڑتا تو وہ کر گزرتا۔ دادا

اس کی بے چینی دیکھ کر ہنسے اور زیر لب بڑبڑائے۔
"آج میرا پوتا پٹے گا۔"
"کچھ کہا آپ نے دادا۔"
"نا..... تو جا اندر..... اللہ کے حوالے۔"
وہ ایک بار پھر ہنسے اور ان کا ساتھ شاویز نے بھی دیا۔ مومن انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتا مڑا۔ برآمدے سے اس کے کمرے کا بند دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تھوک نگل کر گلا تر کیا اور شیروانی کا اوپری بٹن کھول کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

بیڈ پر ناقابل فہم تاثرات سجائے بیٹھی ماحور چینی کی گڑیا لگ رہی تھی۔ وہ کمرے کی سجاوٹ اور فرنیچر کی خوب صورتی سراہ سراہ کر تھک چکی تھی اور اب یا تو مومن صاحب جلد از جلد تشریف لے آتے یا پھر وہ کمرہ لاک کر کے سو جاتی۔۔ رہتا ساری رات باہر ہی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرے آپشن پر عمل درآمد کرتی، دروازے پر کھٹکا ہوا اور مومن تراب صاحب سینہ پھلائے، گردن اکڑائے اندر تشریف لے آئے۔ ماحور نے اسے تیکھے چتونوں سے گھورا۔ جواباً مومن نے کھسیانی سی ہنسی اس کی نذر کی۔ وہ چلتا ہوا قریب آیا اور اس سے پہلے کہ دھپ کر کے اس کے پھیلے ہوئے لہنگے پر بیٹھتا، ماحور نے ایک جھٹکے سے اپنا لہنگا کھینچ کر سمیٹا۔
"خبردار جو میرے لہنگے پر بیٹھے تو....." وہ نیم غراہٹ سے بولی۔ مومن کو بیچ میں ہنسی آ گئی۔ یعنی اسے یاد تھا کہ ایک بار اس نے کہا تھا کہ اسے دلہنوں کے لہنگوں پر دھپ کر کے بیٹھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ وہ طریقے سے بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔
"کیسی ہو؟" بات شروع کرنے کا بہانہ۔
"اچھی نہیں ہوں۔" ترخ کر جواب دیا گیا۔
"وہ تو تم مجھ سے پوچھو نا کہ کتنی اچھی ہو۔"
"کون..... میں یا دعا؟"
"دعا..... دعا کون.....؟"
"جس سے شادی کرنے والے تھے۔"
"وہ..... وہ تو کوئی بھی نہیں تھی..... بس جو نام منہ میں آیا لے دیا تھا..... ورنہ تو مجھے کسی کا علاوہ کسی کا نام یاد ہی نہیں رہا پاگل۔"
"پاگل کس کو بولا تم نے مومن تراب۔" ماحور نے تکیوں کے بیچ میں رکھا کشن کھینچ مارا جو اڑتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے گلاس کو جا لگا اور وہ چھناکے سے گر کر ٹوٹ گیا۔ باہر تپائی پر شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے دادا اور شاویز نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بے اختیار دونوں کے منہ سے نکلا۔
"اے پڑی۔"
اندر مومن مدھم آواز میں ماحور سے مخاطب تھا۔
"پاگل ہوئی ہو کیا..... میرا مطلب پاگل کر گئی کیا مجھے۔ آدھی رات کو سارے مہمان جاگ جائیں گے تو ڑ پھوڑ سے۔"
"جاگتے ہیں تو جاگنے دو۔۔ سارے زمانے کو پتا تو چلے کہ تم جیسا بے وفا انسان کس ڈھٹائی سے میرے سامنے بیٹھا ہے جس نے مجھے کسی اور لڑکی کے لیے چھوڑ دیا۔"
"میں نے کب چھوڑا۔" وہ یک دم زور سے بولا مگر پھر فوراً آہستہ ہوا۔ "میں نے چھوڑا نہیں تھا ماہی۔ وہ تو میں سر سالک کی خاطر پیچھے ہٹ گیا تھا۔"
"کیا.....؟" اس کی چیخ نما دہاڑ پر مومن نے فوراً اپنی ہتھیلی اس کے ہونٹوں پر جمائی جسے اگلے ہی پل اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دانت گاڑ دیے۔ مومن کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلیں اور چیخ حلق سے مگر ایک ہاتھ ماحور کے دانتوں تلے تو دوسرا چیخ روکنے کو اپنے دانتوں میں دے دیا۔
"تم نے مجھے۔ سالک پاشا کے لیے چھوڑا۔"
ماحور لہنگا سنبھالتی بیڈ سے اتری اور ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مارنے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈنے لگی۔ تبھی باہر سے شاویز کی آواز آئی۔
"بھابھی۔ دادا نے آپ کے بیڈ کے نیچے پرانی ڈویاں اور برتن رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں آج گندی مکالیں۔"
ماحور نے گھٹنوں کے بل جھک کر نیچے جھانکا تو

ماہنامہ
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور
فروری 2020 کا شمارہ شا
فروری 2020 کی شمارت
سو کہو کے لیے ما
☆ "روشن ہونیں یادوں کی شمعیں"
☆ "وہ اک ستارہ مہربان" رمشا احم
☆ "کھونا پیار ہے" سباس گل کا
☆ "ولی" مریم ماہ نیر کا مکمل ناول
☆ "اے عشق قضا نہ کرنا" شفی
☆ "تیرے نام کی ٹھوکر" کنی
☆ "باد نو بہار" مہوش طالب کا ناولٹ
☆ عشاء بھٹی، عنبرین ابدال، اقرا الیاس
سیما عاصم اور شگفتہ شاہ کے افسانے
☆ "اسیر عشق" سدرۃ المنتہیٰ
☆ "امید صبح جمال" ام مریم
اس کے علاوہ
پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں
عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور
سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے
فروری 2020
کا شمارہ آ
بک اسٹال

وہاں ایک ترتیب سے پلاسٹک کی پلیٹیں اور ڈونگیاں، اسٹیل کے گلاس رکھے تھے۔ اسے بھوک بھوک ہی ہنسی آگئی عمرہ کنٹرول کرتی دو تین گلاس باہر نکالتی سیدھی ہوئی اور ایک نشانہ باندھ کے مومن کو دے مارا۔ وہ بوکھلا کر اچھلا اور سائیڈ پر ہو گیا۔ اسٹیل کے گلاس کی زوردار چبھتی ہوئی آواز فرش سے ٹکرا کر سارے میں پھیلی۔ باہر دادا نے شاویز کا گھوڑا ایویں مار گرایا اور بولے۔

"یوں لگتا ہے مومن کی دادی پلٹ آئی ہے۔ کسی زمانے میں ایسی ہی آوازیں گونجا کرتی تھیں اس گھر میں..... واہ..... سواد آ گیا۔"

"اچھاااااا..... تو اس کا مطلب یہ ہوا دادا کہ آپ بھی پٹا کرتے تھے دادی کے ہاتھوں۔"

اور دادا کی گوشمالی سے پہلے ایک اور برتن کمرے کے دروازے پر اندر سے ٹکرایا تھا۔ اور دادا جیسے نہال ہی ہو گئے۔

"دادا قربان جائے..... یوں لگتا ہے جیسے مومن کے کمرے میں توپ فٹ ہو گئی ہے۔ ایسی گولا باری تو ہماری سات پشتوں میں نہ ہوئی ہو گی۔"

"آپ کو پتا تھا نا دادا، کہ یہ سب ہونا ہے تب ہی آپ نے مہمان ہمارے ہاں بھیج دیے۔ بڑے ہوشیار ہیں دادا آپ۔"

اور دادا نے اب کے اپنا چنا منا سا پیادہ اٹھایا اور ایک بار پھر ایویں شاویز کا بادشاہ اڑا دیا۔ شاویز بے بسی سے ان کی چلی چال دیکھ کر رہ گیا۔

"تمہارا دماغ واقعی چل گیا ہے ماہی۔ سب کیا کہتے ہوں گے۔ تاریخ لکھی جائے گی ماہی تاریخ کہ ایک دلہن ساری رات دلہا پر برتن برساتی رہی۔"

مومن نے ماحور کی جانب سے پھینکی گئی پلاسٹک کی پلیٹ کو فریزبی کی طرح کیچ کرتے ہوئے اسے شرم دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں تو تاریخ میں یہ بھی لکھا جائے گا مومن کہ تم نے اپنے باس کی خاطر مجھے چھوڑ دیا..... مجھے یعنی مجھے مومن اور وہ بھی سالک پاشا کے لیے..... میں کوئی چیز تھی مومن جس سے تم دستبردار ہو گئے..... کیا تم نے ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے

رائے لی تھی کہ آیا میں سالک پاشا کے ساتھ شادی کرنا پسند کروں گی..... ؟ تم ہوتے کون ہو ایسا کرنے والے۔" طیش اور غصے سے بولتی ماحور کے ہاتھ میں ابھی خاصی صحت مندی مدہانی دیکھ کر مومن کے ہاتھوں کے توتے اڑ رہے تھے۔ وہ الرٹ پوزیشن میں کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"غلطی..... فاش غلطی ہوئی تھی یار مجھ سے..... معاف کر دو نا..... تھوڑی سزا تو نہیں سہی تمہاری جدائی کی صورت..... دن رات تڑپا ہوں ماہی..... بچوں کی طرح رویا ہوں یار..... قسم لے لو....."

اپنے نرخرے پر دو انگلیاں رکھے وہ اتنی معصومیت سے بولا کہ ماحور لاجواب ہو گئی۔ چند پل اسے دیکھتے رہنے کے بعد مدہانی بے بسی سے دروازے کو دے ماری اور خود تھک کر آنکھوں میں آنسو لیے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ مومن کو اس پر جی بھر کر پیار آیا۔

وہ سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے پہلو میں ٹک گیا۔ اس کے کاندھے سے اپنا کاندھا ٹکرایا تو وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔

"مت کرو مومن..... ورنہ پٹو گے۔"

"پٹ لو..... اب تو پاس آ کر بیٹھ گیا ہوں..... مار لو جتنا مارنا ہے..... جتنی بھڑاس ہے نکال لو..... مگر مجھ سے یہ ناراضی ختم کر دو ماہی۔"

ماحور نے منہ اس کی جانب پھیر کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور یک دم اس کے کندھے سے سر ٹیک کر رو دی۔

مومن دوسرے ہاتھ سے اس کا سر سہلاتا رہا۔ اسے جی بھر کر رونے دیا۔ جب خوب رو چکی تو بولا۔

"تمہارا ہر شکوہ جائز ہے ماہی۔ مگر بعض اوقات حالات و واقعات اچانک اس انداز میں پلٹا کھاتے ہیں کہ ہم نا چاہتے ہوئے بھی وہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو عام حالات میں سوچنا ہی ہمارے لیے سوہان روح ہوتا ہے۔ اور ہم دریا میں گرے سوکھے پتے کی طرح اس کی لہروں کے رحم و کرم پر بہتے چلے جاتے ہیں۔"

"اور اگر ہم ایک نہ ہو پاتے مومن تراب تو پھر.....؟"

"ہم ایک ہو گئے ہیں ماحور مغل۔ اہم ایسا ہے۔" اس نے محبت سے اس کی سرخ ناک کو چھوا اور جیب سے ایک مخملیں کیس نکال کر اسے کھولا۔ نازک اور باریک سی چین میں دو ننھے منے جگمگاتے دلوں کا پینڈنٹ تھا۔ مومن نے وہ چین کیس میں سے نکالی مگر اس سے پہلے کہ پہناتا، ہاتھ سے چین کا سرا چھوٹا اور پینڈنٹ لڑھکتا ہوا بیڈ کے نیچے غائب ہو گیا تھا۔

"بیڑہ ہی غرق..... ہر کام آج ہی الٹا ہونا ہے۔" وہ کوفت سے گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھا اور جھک کر بیڈ کے نیچے نگاہ دوڑائی۔ وہاں ابھی کچھ برتن تو کافی تھے مگر وہ ننھا سا پینڈنٹ نجانے کہاں منہ چھپا گیا تھا۔ مجبوراً برتنوں کو ہلانا پڑا۔ اس سے جو آوازیں پیدا ہوئیں ان کے نتیجے میں باہر صحن میں کب سے چھائی خاموشی میں جیسے جان پڑ گئی۔ دادا اور شادیز کی مشترکہ ہنسی کی آواز اندر تک آئی تھی۔ مومن تلملا کر رہ گیا۔ بڑی مشکل سے پینڈنٹ ڈھونڈا اور اسے چین میں دوبارہ پرو کر، چین مضبوطی سے تھام کر لال ٹماٹر منہ لیے مومن نے تڑخے ہوئے لہجے میں ماحور سے کہا۔

"اب گردن ادھر گھماؤ گی یا منہ کی رخ لے کر آؤں۔" اتنے سڑے ہوئے لہجے پر ماحور کی ہنسی نکل گئی۔

"میری بات لکھ کر رکھ لو مومن تراب..... تمہیں رومینس کرنا کبھی نہیں آئے گا۔"

"آتا ہے، قسم سے آتا ہے..... ابھی تو آغاز سفر ہے جان مومن۔"

اس کی مرمریں گردن میں چین پہنا کر مومن نے خمار آلود لہجے میں کہا اور محبت، تشکر کے احساس سے لبریز ہوتے ہوئے اپنی پیشانی اس کی پیشانی کے ساتھ جوڑ دی۔ ساگر کنارے کھڑے پرہم پنچھیوں نے پریت کے آسمان کی جانب اڑان بھری تھی۔ جس کی بے پناہ وسعتیں انہیں اپنی پناہوں میں لینے کو بے قرار تھیں۔

☆☆

سندس حبیب

پھل فروش

خواب تھے اسے لگتا تھا بس چند دن اور..... اور پھر وہ بابو بن کر دفتر جایا کرے گا۔

اسے ابا کی طرح پھل کاٹ کر اٹے کر گلی گلی پھرنا نہیں پڑے گا۔ نہ ہی رات کو بچے ہوئے پھل کو ماس

"سوہنا پھل فروش۔" اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دکان کا بورڈ پڑھا۔ اسے یاد آیا لوگ اسے کتنا چاہتے تھے کہ اس کے اچھے بھلے نام "محمد حسین" کو بدل کر "سوہنا" کر دیا تھا۔ یہ نام اس قدر مقبول ہوا کہ سب کو اس کا اصل نام بھول ہی گیا اور ہر ایک کی زبان پہ "سوہنے بھائی، یا سوہنا" ہوتا تھا۔

اس نے گہری سانس لے کر تالے میں چابی گھمائی، اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اب اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ نوری پتا نہیں کیا مشکل سا نام تھی اس بیماری کا..... اسے فوری طور پر نام یاد نہیں آ سکا۔ اس نے چابی گھمائی اور تالا باہر نکال لیا..... تالے کو ہلکا سا زنگ لگا ہوا تھا۔ اس نے زنگ کو ذرا سا رگڑا تو اس کے ہاتھ پہ زنگ کا مٹیالا سا رنگ لگ گیا۔ اس نے دونوں انگلیوں کو رگڑ کر رنگ مدھم سا کر دیا۔ اس تالے کی ہفتہ وار صفائی کے باوجود یہ زنگ آلود ہو گیا تھا۔ اسے افسوس نے آن گھیرا۔ اس نے تالا اور چابی ہاتھ میں پکڑی اور دونوں ہاتھ بلند کر کے شٹر اٹھا دیا۔ شٹر ڈز کی آواز گونجی اور شٹر اوپر جا کر گول چکر کھا کر سٹ گیا۔

اس نے دکان کے اندر جھانکا..... ہمیشہ کی طرح مختلف رنگوں اور شکلوں کے پھلوں کی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ اس کی اداس آنکھوں میں ہلکی سی چمک آ گئی۔ پھل رکھنے والے بڑے بڑے ٹوکرے ترتیب سے ایک طرف رکھے تھے، ان کے نیچے پھلوں کے خالی کریٹ تھے۔ ایک طرف اس کا بیٹھنے والا اسٹول رکھا تھا۔ وہ چند لمحے خالی نظروں سے دکان کو دیکھتا رہا پھر۔ بے جان ٹانگوں سے اسٹول پہ بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں سالوں کی ریل سی چل رہی تھی۔

بڑے سہانے دن تھے۔ جب اس نے میٹرک پاس کیا..... 1974ء کا زمانہ تھا۔ اس کے کئی ہم عمانتوں کو نوکری مل گئی..... ایک ڈاکٹری میں چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بڑے چمک دار خوش نما

بھری آنکھوں سے دیکھتے یہ سوچنا پڑے گا کہ کاش کسی طرح یہ پھل صبح تک تروتازہ رہ پائے.....؟ اور جب بارش ہوگی تو اسے بھوکا نہیں رہنا پڑے گا کیونکہ ان کے علاقے میں بارش کے بعد گھنٹوں تک پانی بھر جاتا تھا۔ کھانے کو کچھ نہ ہونے کے باعث اماں اکثر انہیں پھلے کمرے میں بند کر کے گلے سڑے پھلوں کے ساتھ سوکھی روٹی کھلاتیں تو ہر نوالہ اس کے حلق میں اٹک اٹک جاتا۔ اسے اس خوف سے نفرت تھی، اسے اس ہر اس بھری کیفیت سے نفرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے گھر میں اماں کے جہیز کی دولوہے کی چستی نیاں ہمیشہ راشن سے بھری رہیں اور اماں ہر روز دہلیز پہ نگاہیں ٹکائے ابا کے آنے کا انتظار کرنے کے بجائے منڈی میں سے اپنی پسند کی دال نکال کر پکائیں اور وہ سب خوشی خوشی کھائیں۔ وائے حیف! اس کا خواب سدا ادھورا ہی رہا۔

مگر جب اس نے میٹرک پاس کیا تب اس نے سوچا کہ بس اب آزمائش کے دن ختم ہوئے۔ اسے یہ سوچ کر عجیب سی سرشاری ہوتی کہ اب وہ ابا کے برابر کھڑا ہو کر اپنے گھر کا خرچ اٹھا پائے گا۔

خوابوں کا محل تب چکنا چور ہوا جب نوکری ملنے سے قبل ہی ایک رات ابا سویا تو ایسا سویا کہ صبح اٹھ ہی نہ سکا۔ نہ کوئی قیامت برپا ہوئی نہ کہرام مچا..... نہ زمین پھٹی نہ آسمان ٹوٹا بس یہ ہوا کہ اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ ابا کے مرنے کے چوتھے دن پھلوں کا ٹوکرا لیے سڑک پہ کھڑا تھا..... نہ ذہن حاضر نہ نگاہ قائم..... خدا جانے کہاں دیکھ رہا تھا اور کیا بیچ رہا تھا..... رات جب ٹوکرا خالی ہو گیا تو ایک راہ گیر اسے جھنجوڑ کر جاتے جاتے بولا۔

''اب کیا ٹوکرا بیچنے پر لگایا ہے؟'' تو جیسے وہ ہوش میں آ گیا..... اور شاید خوابوں کے دیس سے باہر بھی..... وہ واپسی کے سارے رستے ہاتھوں میں پکڑے پیسے دیکھ کر حیران ہوتا رہا کہ ایک دن میں سارا پھل بیچ کر کیا واقعی اس نے خود یہ سارے پیسے کمائے تھے..... اسے لگ رہا تھا کہ یہ جیسے کوئی بھیانک سپنا تھا..... ابا سارا دن محنت کرتا تھا گلیوں میں پھرتا سڑک پہ ٹھیلا لگاتا مگر آج تک وہ سارا پھل ایک دن میں بیچنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ جبکہ آج پہلے دن ہی وہ ٹوکرا خالی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اسے خوشی سے زیادہ ابا کی قسمت پہ رونا آیا تھا۔

ایک عجیب انتقامی کیفیت میں اس نے سوچا کہ وہ کل سے ٹوکرا نہیں لے کے پھرے گا۔ وہ نوکری ڈھونڈے گا۔ اس کی دسویں کی سند، اس کا غرور، اس کی آن بان شان..... نہیں وہ کسی صورت سمجھوتا نہیں کرے گا۔ اس کے ہاتھ میں موجود ٹوکرے پہ اس کی گرفت غصے میں کچھ سخت ہو گئی۔

کل؟؟؟

کل کبھی نہ آ سکی..... وہ کل جس میں اس کے خواب تھے..... بس کہیں دور اٹکی رہ گئی..... اور وہ منڈی سے پھل خریدنے چلا گیا۔ چند دن لگے اسے..... خود کو یہ سمجھانے میں کہ وہ ''محمد حسین میٹرک پاس ان فرسٹ ڈویژن'' سے ''محمد حسین پھل فروش'' بن چکا تھا۔ عدت میں بیٹھی ماں..... دو چھوٹی بہنیں اور ایک بھائی بنا اک لفظ بولے اسے وہ سب سمجھا گئے تھے جو اسے پچھلے کئی مہینوں سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس کے بعد اس نے سر جھکا دیا۔ ہار مان لی۔ اور جان لیا کہ یہ وہ تقدیر تھی جو ہر حال میں انسان پہ غالب تھی۔

دوبارہ سر اٹھانے کا موقع ملا تو زندگی آدھی اور جوانی پوری بیت چکی تھی۔ سڑک کے پار اب ٹوکرے کے بجائے ایک دس بائے بارہ فٹ کی پوری دکان تھی جس پہ ''سوہنا پھل فروش'' کے حروف فیلے روغن سے تحریر تھے۔ اس کا پھل ساری دکانوں سے زیادہ صاف ستھرا اور ذائقہ دار ہوتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ پھل منڈی سے لا کر اپنے ہاتھوں سے دھوتا..... کپڑے سے خشک کرتا اور پھر ترتیب وار ٹوکروں میں

جاتا اور ان کے اوپر — سفید رنگ کی جالی کا کپڑا ڈال دیتا تاکہ مکھیاں جمع نہ ہوں۔ گاہک کو آج تک اس نے غلط سودا تول کر نہ دیا تھا..... گلے سڑے پھل وہ ہمیشہ ایک طرف کرتا جاتا..... جوس اور ملک شیک کی بہت سی دکان والوں نے اس سے رابطہ کیا کہ وہ گلا سڑا پھل انہیں دے دیا کرے تاکہ وہ اپنے جوس اور ملک شیک میں ڈال سکیں مگر اس نے ہمیشہ سختی سے انکار کر دیا کہ وہ معصوم انسانوں کی صحت کے ساتھ کھلواڑ نہیں کر سکتا تھا۔

ہر شام سڑک پار جھگی والوں کی بستی سے اُدھ ننگے بچے آتے اور اپنی بھوکی نظروں سے اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے..... وہ بچے ہوئے پھل کا کچھ حصہ انہیں دے دیتا جس پہ وہ پیلے دانتوں سے مسکراتے اور سڑک پہ اندھا دھند بھاگ جاتے کہ مبادا وہ واپس ہی نہ چھین لے۔

ساری سڑک اس کی عزت کرتی تھی..... لوگ جس قدر احترام سے اسے ''پاسوہنا'' کہتے کہ اسے خود آنے لگتا کہ آیا وہ اس عزت و احترام کے قابل تھا بھی یا نہیں؟ وقت کی دھند کے پار اس کی سند اور کلرکی کہیں کھو گئی..... اس نے بھی پیچھے نہ دیکھا..... 1974ء کہیں پیچھے رہ گیا۔ آج 2004ء تھا۔

آج اس کا بڑا بیٹا ''محمد ذکاء'' بی اے پاس کر چکا تھا..... اس کی ماں نوری نے سارے محلے میں بوندی کے لڈو بانٹے تھے..... اور اب محمد حسین کے سامنے ایک اور ''محمد حسین'' کھڑا تھا۔

ابھی کل رات ہی وہ جھگڑ پڑا تھا باپ سے۔ اسے پھل فروش نہیں بننا تھا اسے ''نوکری'' کرنی تھی۔

محمد ذکاء کو لگتا تھا کہ پھل فروشی ایک حقیر پیشہ تھا..... جسے معاشرہ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ باپ کے جواب دینے سے پہلے ہی محمد ذکاء کے پاس ہزاروں دلیلیں اور تاویلیں تھیں۔ اسے دراصل اس پیشے سے نفرت تھی۔ وہ بی اے پاس کر کے دو کلو سیب اور چار کلو انگور نہیں تول سکتا تھا۔ یہ اس کی ڈگری کی توہین تھی۔

''محمد حسین'' نے بیٹے کے آگے ہار مان لی..... محمد ذکاء خوشی خوشی ہر روز جاتا اور نوکری ڈھونڈنے میں لگ جاتا۔ چند ہفتے بڑے جوش و خروش سے آنا جانا لگا رہا پھر ایک دم وہ بجھنے لگا جیسے ہار ماننے لگا..... اب آتے جاتے باپ کو جتاتا کہ وہ امیر ہوتے، رسوخ والے ہوتے تو اسے بھی سفارش پہ نوکری مل جاتی مگر یہ غریبی محمد ذکاء کے بقول اس کے گلے کا سب سے بڑا طوق تھی۔ اور اسے اس غریبی سے نفرت تھی۔

''محمد حسین'' نے اسے یوں تقدیر سے لڑتے دیکھا تو ایک دن چپکے سے ایک خط اس کے کاغذوں میں رکھ دیا۔ جس پہ بڑی خوب صورت لکھائی میں سیاہ روشنائی سے درج تھا۔

''پیارے بیٹے محمد ذکاء!

تعلیم انسان کو سنوارتی ہے، تمہارے باپ نے تمہیں تعمیر کرنے کے لیے تعلیم دلوائی تھی..... میرے بیٹے! جو تعلیم تمہیں سفارش پہ اکسائے اور باپ کے پیشے سے نفرت پہ مجبور کرے..... وہ پیشہ جس میں ایک روپیہ بھی حرام کا شامل نہیں تھا۔ مجھے اس پہ شرمندگی ہے۔

محمد حسین بھی تمہاری طرح خوش نما خواب دیکھتا تھا۔ وہ بھی باپ کے پیشے سے نفرت کرتا تھا..... پھر ایک دن یہ ہوا کہ اس کا باپ مر گیا اور وہ پھل فروش بن گیا۔

کیا تم بھی اپنے باپ کے مرنے کا انتظار کرو گے؟؟؟''

☆☆

سوزوکی عمیت

ماڈل ..... اریبہ خان

میک اپ ..... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ..... موسیٰ رضا

نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سیونہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سیونہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو دن کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے باس حسان صاحب کی بیٹی ربیکا اس کو پسند کرنے لگتی ہے جو وقتاً فوقتاً حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے، سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے وہ اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زوبی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔

سونیا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے تیار ہے اور خزینہ سے ملتا ہے اور خزینہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خزینہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزینہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خزینہ تیمور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزینہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

دریکا بیلا کو اغوا کر کے حمزہ کو بلیک میل کرتی ہے اور مجبوراً حمزہ کو دریکا سے شادی کرنی پڑتی ہے۔ شہرینہ حالات سے

سمجھوتا کر کے اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے۔
خزینہ تیمور کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہی ہے۔ اس کا پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تیمور بچے کو سارہ کی پاس لے جاتا ہے اور خزینہ سے کہہ دیتا ہے کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ خزینہ کو کچھ عرصے بعد دوسرے بیٹے سے نواز دیتا ہے۔ تیمور کے دل پر سے خزینہ سے اولاد چھین لینے کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔
جہانداد کی ماں نفسیاتی مریضہ ہیں۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق جہانداد ماں کو خوش رکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ جہانداد کے اسکول میں شہرینہ ٹیچر ہے۔ شہرینہ کو دیکھ کر جہانداد کے دل میں انجانی خواہشات جنم لینے لگی ہیں۔ جہانداد کی ماں بیمار ہوتی ہیں تو اسکول کی ٹیچرز عیادت کے لیے ان کے گھر جاتی ہیں وہاں شہرینہ کو دیکھ کر جہانداد کی ماں اندازہ لگا کر کہتی ہیں اس لڑکی کے دل میں بڑا درد ہے اور پھر شہرینہ کے آنسو سارے بندتوڑ کے بہنے لگتے ہیں۔

ستائیسویں قسط

"ٹھیک ہے۔ آج یہ قصہ ختم ہو جانا چاہیے۔ میری بیٹی کوئی ایسی گری پڑی نہیں ہے کہ حسان جا کر اسے ان کے در پر پھینک آئیں۔" ثمرہ تلملاتے ہوئے اپنے آپ بولتے ریکا سے مخاطب ہوئیں۔
"تم آزاد ہو گئی ہو ریکا۔ جاؤ، تمہیں پارٹی میں دیر ہو رہی ہے۔"
ریکا نے چونک کر ثمرہ کو دیکھا پھر ایک دم بھاگی۔
حسان صاحب نے گاڑی کے سائیڈ مرر میں ریکا کو آتے ہوئے دیکھا تو اطمینان محسوس کرتے ہوئے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ریکا کے قدم سست پڑ گئے۔ وہ شش و پنج میں تھی۔ ماں آزادی کی نوید دے رہی تھی اور باپ کو اس کی اسیری منظور تھی۔ اور وہ خود کیا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے اندر جھانکنا چاہا تھا کہ ادھر حسان صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ چونکی اور جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اسے آگے دھکیل دیا۔ اگلے پل وہ حسان صاحب کے برابر بیٹھی تھی۔ گم صم۔
"میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔ راستہ بتاتی جانا۔" حسان صاحب نے کہہ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے اور وہ بھی اشارے سے راستہ بتاتی رہی۔ پھر گھر کے سامنے گاڑی رکوا کر نخوت سے بولی۔
"یہ ہے میرا گھر....."
حسان صاحب کے دل پر گھونسا ضرور پڑا لیکن قصداً ان سنی کر کے پہلے اس کی طرف کا دروازہ کھولا پھر خود اتر گئے اور اس کے قریب آنے پر اسے ساتھ لے کر بیل کا بٹن پش کیا۔
دروازہ فاخرہ نے کھولا اور انہیں دیکھ کر بوکھلا گئیں۔
"السلام علیکم میں آپ کی بہو کو لے کر آیا ہوں۔" حسان صاحب نے کہا تو فاخرہ اسی بوکھلاہٹ میں بولیں۔
"جی جی آیئے اندر آئیں۔ آؤ بیٹی۔ دیکھو تمہارے جانے سے گھر کیسا سونا ہو گیا ہے۔"
حسان صاحب نے ریکا کو اشارہ کیا تو وہ بڑھ کر فاخرہ کے گلے لگ گئی۔
"خوش رہو سکھی رہو۔" فاخرہ دعائیں دیتے ہوئے ان دونوں کو اپنے کمرے میں لے آئیں۔
"بیٹھیں بھائی صاحب۔ میں حمزہ کو بلاتی ہوں۔"
"آجائے گا حمزہ بھی، آپ تشریف رکھیں۔ ریکا تم جاؤ حمزہ کو بلاؤ۔" حسان صاحب نے فاخرہ کو بٹھا کر

ریبکا سے کہا اور اس کے کمرے سے جاتے ہی کہنے لگے۔
"مجھے افسوس ہے بہن۔ اس روز آپ آئیں تو میری آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔"
"کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔ اصل میں، میں کئی ہی ایسے وقت تھی۔ خیر آپ۔ آگئے بڑی مہربانی۔"
"مہربانی تو آپ کی ہے کہ میری بیٹی کی بدتمیزی....."
"نہیں نہیں..... میری بہو نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟" فاخرہ فوراً بولیں تب ہی ریبکا نے آ کر کہا۔
"حمزہ تو نہیں ہے۔"
"نہیں ہے۔ ابھی تو آیا تھا۔ بیلا....." فاخرہ نے ساتھ ہی بیلا کو آواز دی۔ تو وہ کمرے میں آتے ہی رک گئی۔ کیونکہ سامنے حسان صاحب بیٹھے تھے۔
"یہ میری بیٹی ہے، آؤ سلام کرو تمہاری پھوپھی آئی ہیں۔" فاخرہ نے بیلا کے تعارف کے ساتھ کہا۔
"پھوپھی.....!" بیلا قدرے حیران ہوئی پھر فوراً سلام کر کے ریبکا کو دیکھنے لگی۔
"وہ حمزہ کہاں ہے؟" فاخرہ چاہتی تھیں حمزہ جلدی آ کر حسان صاحب کے پاس بیٹھے۔
"بھائی تو اماں، کہیں باہر نکلے ہیں۔"
"تو فون کر کے بلاؤ اسے....."
"بہن..... آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ حمزہ سے تو میں مل ہی لوں گا۔ ابھی تو میں خاص طور سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ حالانکہ مجھے بہت پہلے آنا چاہیے تھا لیکن خیر گزری باتوں کو کیا دہراؤں۔ آپ بڑے ظرف کی مالک ہیں میری بیٹی کو قبول کر لیا۔ شاید کوئی دوسری عورت ایسی شادی کو تسلیم ہی نہ کرتی جس میں وہ شریک نہ ہوئی ہو۔" حسان صاحب مغلوب ہو کر بول رہے تھے۔
"بھائی صاحب۔ آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔" فاخرہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں۔ اسی قدر کہہ کر بیلا سے مخاطب ہوئیں۔ "بیلا تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو کچھ....."
"جی اماں..... میں وہی پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ انکل۔ آپ کیا پسند کریں گے ویسے تو کھانا بھی تیار ہے۔" بیلا نے حسان صاحب سے پوچھ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے فاخرہ بول پڑیں۔
"ہاں ہاں پہلے کھانا لگا دو۔ اس کے بعد چائے۔" حسان صاحب چاہنے کے باوجود منع نہیں کر سکے اور اٹھتے ہوئے ریبکا سے بولے۔
"چلو بیٹا..... میرے ہاتھ دھلا دو۔"

☆☆☆

حسان صاحب بہت تاخیر سے گھر آئے تھے۔ اس دوران ثمرہ جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ وہ بے حد تلملائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ریبکا کو کتنے فون کیے تھے لیکن اس نے ان کی کال ریسو نہیں کی تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی۔ حسان صاحب اسے کہاں لے گئے تھے، انہیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ جب ہی وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھیں اور جیسے ہی حسان صاحب آئے وہ ان کی طرف لپکیں۔
"ریبکا کہاں ہے؟"
"اپنے گھر۔" حسان صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔
"اپنے گھر۔" تو آپ پھینک آئے اسے وہاں۔ واہ، حسان۔ کمال کر دیا آپ نے بہت بھاری تھی ناں بیٹی آپ پر۔" ثمرہ غصے میں بل کھا رہی تھیں۔

"بیاہی بیٹیاں بھاری ہی ہوتی ہیں اور میں نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی فیصلہ اسی کا تھا وہ اپنی مرضی سے گئی ہے پہلے بھی اس نے اپنی مرضی کی تھی۔" حسان صاحب آرام سے بیٹھ کر کہنے لگے۔ جس پر ثمرہ مزید تلملا گئیں۔

"مانتی ہوں پہلے اس نے اپنی مرضی کی تھی۔ وہ بھی حمزہ کے بہکانے میں آ کر لیکن اب اس کی مرضی نہیں تھی۔ وہ کہہ چکی تھی مجھ سے کہ وہ اس گھر میں نہیں جائے گی۔"

"تو کیوں جانے دیا تم نے اسے۔ روک لیتیں ..... بند کر دیتیں سب دروازے اور جیسے اب چلا رہی ہو اس وقت چلا کر مجھ سے کہتیں، نہیں جانا چاہتی ربیکا، تم جاؤ طلاق لے آؤ۔" حسان صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔

"اس کے لیے یہی بہتر تھا۔ آپ طلاق لے آتے۔ ٹھیک ہے اس نے اپنی مرضی کی۔ نادان تھی غلطی ہو گئی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایک غلطی کی سزا ساری زندگی بھگتتی رہے۔ آپ کیسے باپ ہیں حسان اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کو....."

"بس، بس کر دو ثمرہ۔" حسان صاحب غصے میں ٹوک کر کہنے لگے۔ میں نے اپنی بیٹی پر ظلم نہیں کیا۔ اس کی ذمہ دار وہ خود ہے۔"

"سارا الزام بیٹی کے سر۔ حمزہ کو کیوں نہیں کچھ کہتے۔ اس نے بہکایا آپ کی بیٹی کو....."

"یہی تو نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ربیکا کی شادی حمزہ کے ساتھ ہونے ہی نہ دیتا۔ یہ صرف ربیکا کی غلطی تھی۔ بہرحال میں گزری باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا اور تم سے صرف اتنا کہوں گا کہ تمہیں ربیکا کو سمجھانا چاہیے نہ کہ اسے مزید شہ دو۔" حسان صاحب اپنی بات کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے پھر جاتے جاتے رک گئے۔

"ایک بات سن لو۔ ربیکا پر کوئی ظلم نہیں ہوا۔ میں ابھی اس کے گھر سے آ رہا ہوں۔ چھوٹا سہی لیکن اچھا گھر ہے اور حمزہ کی ماں نیک اور سادہ عورت ہے۔ اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا بلکہ فراخدلی سے بہو کو گلے لگایا اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ اگر ربیکا اس گھر میں ایڈجسٹ نہ ہو سکی تو پھر سمجھ وہ کہیں بھی ایڈجسٹ نہیں ہو سکے گی۔ دیٹس آل۔" وہ ثمرہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ثمرہ قدرے سناٹے میں ان کے پیچھے دیکھے گئیں۔ وہ کمرے میں بند ہو گئے تب بھی کتنی دیر وہ اسی طرح کھڑی رہیں اصل میں ان کا دماغ گھوم گیا تھا۔ پھر اچانک جیسے ہوش میں آ کر نخوت سے سر جھٹکا۔

"ہونہہ، نیک سادہ عورت! وہ نیک سادہ عورت کیسے بیٹے کو اپنے اشاروں پر چلا رہی ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا انہیں۔ لیکن میں سب سمجھتی ہوں اور دیکھتی ہوں حمزہ کب تک اس کے اشاروں پر چل سکتا ہے۔" وہ اپنے آپ بولے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

حمزہ نے کیونکہ بیلا سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ فاخرہ سے کچھ نہیں کہے گا۔ اس لیے مجبور تھا۔ ورنہ اس کے اندر بے حد غصہ تھا۔ فاخرہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن حسان صاحب کو فون کر کے انہیں بتا دیا تھا کہ اس کی والدہ اور بہن ان کے گھر گئی تھیں لیکن ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ جس طرح اسے فاخرہ نے کچھ نہیں بتایا تھا اسی طرح حسان صاحب کو بھی نہیں بتایا گیا ہوگا۔ بہرحال انہیں فون کرنے کے بعد بھی اسے چین نہیں آ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا فاخرہ سے پوچھے کہ اس کے منع کرنے کے باوجود وہ وہاں کیوں گئی تھیں۔ لیکن وعدے کی زنجیر اسے جکڑے ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ اس کا ڈیپریشن زنجیر توڑنے پر مجبور کرتا وہ گھر سے نکل آیا تھا۔

جب وہ گھر سے نکلا تھا تب شام ڈھل رہی تھی اور سردیوں کی شامیں تو یوں بھی ڈھلنے کے ساتھ ہی ایسا منظر پیش کرتی ہیں جیسے جانے کتنی رات بیت چلی ہو۔ جبکہ ابھی صرف آٹھ بجے تھے۔ مختلف شاہراہوں پر بائیک دوڑاتے ہوئے آخر وہ ایک ریسٹورنٹ میں آ بیٹھا تھا۔ بدن پر گرم کپڑا نہ ہونے کے باعث اسے بہت سردی لگ رہی تھی۔ یخ بستہ ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ ویٹر نے اس کے سامنے مینو کارڈ رکھا تو اس نے فوراً چائے لانے کو کہا۔ پھر چائے کے دو کپ پی کر وہ قدرے بہتر محسوس کرنے لگا۔ لیکن اس کا ذہن ابھی بھی چیخ رہا تھا۔ گو کہ بیلا نے اسے زیادہ کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا ثمرہ نے اس کی ماں کی بے عزتی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہوگی۔ اور یہی بات اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ خود تو اس امیر زادی کی ضد کی بھینٹ چڑھ گیا تھا لیکن فاخرہ اور بیلا کے لیے کسی کی پیشانی پر ناگواری کی ہلکی سی لکیر بھی وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"میں اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔" اس نے سوچتے ہوئے سگریٹ کا طویل کش لے کر سارا دھواں اپنے اندر اتار لیا۔ پھر وہاں سے اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا۔ فاخرہ کی کال تھی۔ اس نے ریسو کر لی۔

"جی اماں....." ادھر فاخرہ اس کی آواز سنتے ہی بگڑ گئیں۔

"شاباش ہے بیٹا۔ میں شام سے فون کر کر تھک رہی ہوں اب بھی نہ اٹھاتے بجنے دیتے۔"

"افوہ اماں۔ میں اصل میں راستے میں تھا۔ بائیک پر پتا نہیں چلا۔ بس اب آ رہا ہوں۔" اس نے کہا تو اس کے آنے کا سن کر فاخرہ نے فون بند کر دیا۔ یہ ناراضی کا اظہار تھا۔ جب ہی وہ فوراً وہاں سے نکل آیا۔ اور اسپیڈ سے بائیک بھگاتے ہوئے گھر پہنچا تو بری طرح ٹھٹھر رہا تھا۔ دروازہ بیلا نے کھولا اور اسے دیکھ کر جھرجھری لے کر بولی۔

"اف! بھائی۔ اتنی سردی میں آپ نے جیکٹ بھی نہیں پہنی۔"

"ہاں پہن رہا ہوں۔" وہ بائیک کھڑے کر کے تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا تاکہ جیکٹ پہن کر فاخرہ کے پاس جائے لیکن آگے کمبل میں ربیکا کو لیٹے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ پتا نہیں وہ سو رہی تھی یا اس کی بائیک کی آواز سن کر سوتی بن گئی تھی۔ اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فوراً پلٹ کر فاخرہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔

"اماں وہ..... ربیکا"

"ہاں خیر سے دلہن آ گئی ہے۔" فاخرہ نے کہا تو وہ چڑ گیا۔

"کیوں..... کیوں آئی ہے۔ جب آپ کے ساتھ نہیں آئی تو اب آنے کی کیا ضرورت تھی۔" اتنی احتیاط کے باوجود بھی اس کے منہ سے فاخرہ کا وہاں جانا نکل ہی گیا۔ جس پر فاخرہ سٹپٹا گئیں۔

"میرے ساتھ....."

"جی آپ کے ساتھ۔ مجھے حسان صاحب سے پتا چلا کہ آپ ان کے ہاں گئی تھیں۔" اس نے بیلا کی پریشانی دیکھ کر حسان صاحب کا نام لے دیا۔

"ہاں گئی تھی۔" فاخرہ بھی تیز ہو گئیں۔ "جب ہی تو وہ بے چارے خود اسے چھوڑنے آ گئے۔ معذرت بھی کر رہے تھے۔ اور تم کہاں تھے میں جب سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔ تمہارے مسز بھی انتظار کر کر کے چلے گئے۔ کیا سوچتے ہوں گے۔ مجھے تو رہ رہ کر شرمندگی ہو رہی ہے۔"

"کیوں..... اب کیوں شرمندگی ہو رہی ہے۔ اس وقت شرمندگی نہیں ہوئی جب آپ ان کے ہاں گئیں

اور انہوں نے بیٹی کو آپ کے سامنے ہی نہیں آنے دیا۔ اب کیسے چلے آئے منہ اٹھا کر۔" اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"بس..... بس کرو حمزہ۔ تم اتنے بدتمیز، بدلحاظ ہو جاؤ گے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ جاؤ میرے سامنے سے۔" فاخرہ نے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا تو وہ نہ صرف پریشان ہوا۔ زچ ہو کر اس کے پاس بیٹھا۔

"اماں۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں....."

"میں اب نہ کچھ سننا چاہتی ہوں نہ سمجھنا چاہتی ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ہر معاملے سے تعلق رہوں تو بیٹا پھر تمہیں شادی کر کے دلہن کو یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ رکھتے کہیں اور پھر میں دور ہی رہتی۔ اور ابھی بھی میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم اپنی الگ دنیا بسا سکتے ہو۔ وہاں جو جی میں آئے کرنا۔" فاخرہ اتنی ناراض تو کبھی نہیں ہوئی تھیں۔

حمزہ کی جان پر بن آئی لیکن خود کو کچھ کہنے سے باز رکھنے کی خاطر ہونٹ بھینچ کر سر جھکا لیا۔ کیونکہ کہتا کہ ابھی ان کی ناراضی بڑھتی جائے گی۔ کتنی دیر اسی طرح بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ان کے کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں سردی پورے استحقاق سے ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔ لیکن اب اسے احساس تک نہیں ہوا۔ کمرے سے اپنا تکیہ اور کمبل اٹھایا اور برآمدے میں تخت پر سو گیا تھا۔

☆☆☆

شہرینہ کو جہانداد کی ماں کے پاس جاتے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا اور اب وہ نہ صرف اس رویے بلکہ جہانداد کے گھر کے ماحول کی بھی عادی ہو گئی تھی۔ کیونکہ جب تک وہ وہاں رہتی گھر میں اس کے اور ماں کے علاوہ صرف ملازمین ہوتے تھے اور کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ بس ہفتے میں ایک بار ڈاکٹر منصور ماں کے چیک اپ کے لیے آتے تھے۔ اور جہانداد کے بارے میں اسے پتا نہیں تھا کہ ان کی گھر واپس کب ہوتی ہے۔ نہ اس نے ان کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت سمجھی تھی۔ جبکہ ملازماؤں کے ساتھ وہ خاصی بے تکلف ہو چکی تھی۔ نہ اپنے بارے میں بات کرنی نہ اس گھر کے حوالے سے۔

ملازماؤں میں نوری اور تاجی تقریباً اسی کی ہم عمر تھیں۔ دونوں بس گھر کے مالکوں کے سامنے ہی باادب ملاحظہ کی تصویر بنی رہتیں ورنہ خاصی شوخ چنچل تھیں۔ جب وہ ماں کے لیے خود کچھ بنانے کچن میں جاتی تو کوکنگ کرتے ہوئے ان دونوں کی نوک جھوک بہت محظوظ ہوتی۔ جبکہ اڈھیر عمر ملازمہ زیتون بی بی انہیں ڈانٹتی اور ٹوکتی رہتی۔ ساتھ دھمکی بھی دیتی کہ صاب کو شکایت لگا دے گی۔ وہ دونوں شاید جانتی تھیں کہ یہ محض دھمکی ہے جب ہی باز نہیں آتی تھیں۔

اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ وہ ماں کے لیے چکن کارن سوپ بنا رہی تھی۔ ساتھ نوری تاجی کی نوک جھوک سے محظوظ ہو کر مسکرا رہی تھی کہ زیتون بی بی انہیں ڈانٹنے لگی پھر وہی صاب کو شکایت کی دھمکی دیتے ہوئے کچن سے نکل گئی تو نوری اور تاجی جو اس کے ڈانٹنے سے بالکل خاموش ہو گئی تھیں اس کے جاتے ہی کھی کھی کرنے لگیں۔

شہرینہ نے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھا پھر پوچھنے لگیں۔

"کبھی شکایت کی بھی ہے زیتون بی بی نے.....!"

"ناں جی۔ نوری نہ کو لمبا کھینچ کر بتانے لگی۔ کبھی نہیں اس کی تو صاب کے سامنے جانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ایسے ہی سامنا ہو جائے تو کانپنے لگتی

"کیوں۔ وہ کیا کہتے ہیں؟" وہ بلا ارادہ پوچھ گئی۔
"توبہ کردی۔ صاب تو کچھ نہیں کہتے بہت اچھے ہیں وہ۔" نوری نے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔ پھر کیبنٹ سے باؤل نکالتے ہوئے اس نے دیکھا نوری تاجی کو کہنی مارتے ہوئے کچھ کہنے پر اکسا رہی تھی۔ وہ انجان بن کر باؤل میں سوپ نکالنے لگی۔
"ایک بات پوچھوں بی بی۔" تاجی نے گویا ہمت کرلی۔
"اس نے ہوں کی آواز نکالنے پر اکتفا کیا۔"
"وہ نوری پوچھ رہی ہے آپ صاحب کی رشتہ دار ہو۔"
"میں نہیں جی، یہ خود پوچھ رہی ہے۔" نوری نے تاجی کے پہلو میں چٹکی کاٹی تو وہ کراہ کر بولی۔
"تو نے مجھ سے کہا ہے پوچھنے کو..... بی بی آپ نے دیکھا تھا ناں یہ مجھے کہیاں مار مار کے کہہ رہی تھی۔"
"نہیں میں نے کچھ نہیں دیکھا۔" وہ کہتے ہوئے ٹرے اٹھا کر کچن سے نکل آئی۔ ماں گود میں بڑا سا پیکٹ لیے اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ وہ اب اس کے ساتھ کافی باتیں کیا کرتی تھیں اور زیادہ تر وہ نارمل بھی لگتی تھیں۔ بس کہیں کہیں کوئی ایسی بات کر جاتیں جس سے پتا چلتا کہ ان کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تب وہ انہیں ڈوز دے کر سلا دیتی تھی اور ایسا وہ ڈاکٹر منصور کے کہنے پر کرتی تھی۔
"میں نے آج آپ کے لیے اسپیشل سوپ بنایا ہے آنٹی۔" وہ ان کے سامنے ٹرے رکھ کر بیٹھتے ہوئے پھر ان کی گود میں پیکٹ دیکھ کر پوچھنے لگی۔
"اس میں کیا ہے؟"
"ابھی دکھاتی ہوں۔" ماں شاپر میں سے ڈبا نکالنے لگیں کہ اس نے روک دیا۔
"نہیں پہلے آپ سوپ لیں۔ ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"
"ہاں....." ماں فوراً مان گئیں۔ اس نے جلدی سے چھوٹے باؤل میں سوپ نکال کر انہیں تھما دیا۔
"تم بھی لو ناں۔"
"جی میں بھی لے رہی ہوں۔" اسے پتا تھا وہ اس کے بغیر چکھیں گی بھی نہیں جبھی فوراً دوسرا باؤل اٹھا لیا۔ کیونکہ ڈاکٹر منصور جب بھی آتے اس سے یہ ضرور کہتے کہ وہ ماں کے ساتھ باتیں کرتی رہا کرے جس سے ممکن ہے ان کی یادداشت واپس آجائے۔ اس لیے وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ ابھی پوچھنے لگی۔
"آنٹی کبھی آپ نے کوکنگ کی ہے؟"
"ہاں بہت شوق سے۔"
"اچھا کیا اچھا بنا لیتی ہیں؟"
"سب کچھ..... سب کچھ بنا لیتی ہوں۔ یہ زیتون بی بی کو میں نے ہی تو پکانا سکھایا ہے۔" ماں شوق سے بتانے لگیں تو وہ بھی اشتیاق سے سنتی رہی۔ سوپ کے دوران اس نے ان کا دھیان ادھر ادھر نہیں ہونے دیا۔ یونہی باتوں میں لگا کر سوپ ختم کرایا پھر ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پوچھنے لگی۔
"اب بتائیں، اس ڈبے میں کیا ہے؟"
"ہاں....." ماں نے فوراً ڈبے کا کور اٹھا کر اس میں سے البم نکال لیا اور اسے اپنی خاندانی تصویریں دکھانے لگیں۔ ساتھ ساتھ ہر ایک تصویر کے بارے میں بتاتی بھی جا رہی تھیں اور پہلے تو اسے احساس نہیں ہوا پھر اچانک جھٹکا لگا تھا کہ جب ماں کو سب پتا ہے اپنے خاندان کا ہر فرد یاد ہے تو پھر ڈاکٹر کون سی یادداشت کھنگال رہے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی تصویروں پر سے اس کی توجہ ہٹ گئی تھی کہ اچانک ماں نے اس کا

ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور ایک تصویر انگلی رکھ کر بولیں۔
''دیکھو یہ رحیم داد ہے۔''
اس نے کچھ پوچھنے سے گریز کیا وہ خود اس بتانے لگیں۔
''یہ جہانیاں سے چھوٹا ہے۔ پانچ سال چھوٹا ہے لیکن دیکھو جہانیاں کے برابر لگتا ہے۔ اس کی اٹھان اللہ۔''
''یہ کہاں ہیں؟'' اس کے منہ سے بلا ارادہ ہی نکل گیا اور ماں جو رحیم داد کے بارے میں بتاتے ہوئے خاصی پرجوش ہو گئی تھیں یکدم بجھ گئیں پھر انتہائی بے بسی اور بے چارگی سے گویا ہوئیں۔
''پتا نہیں، کتنے دن ہو گئے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ میں جہانیاں سے کہتی ہوں اسے لے آؤ لیکن وہ میری سنتا ہی نہیں تم۔'' تم کہنا جہانیاں سے رحیم داد کو لے آئے۔ وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گا۔ کہو گی ناں۔ کہو گی ناں۔'' ماں پھر حواس کھو رہی تھیں۔
''جی جی، میں کہوں گی۔'' اسے کہنا پڑا۔
''ہاں تم کہو گی تو وہ لے آئے گا۔ پھر دیکھنا رحیم داد کے آنے سے گھر میں کتنی رونق ہو جائے گی۔ وہ بہت شرارتی ہے۔ تم اس کی کسی بات کا برا نہیں ماننا۔ ویسے میں اسے کہہ دوں گی۔ تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔'' ماں بولے چلی جا رہی تھیں۔
اس نے ''جی جی۔'' کرنے کے ساتھ البم پیک کر کے ایک طرف رکھا پھر انہیں دوا کھلا دی۔ ماں بولتے بولتے ہی سو گئیں تب وہ احتیاط سے ان کے کمرے سے نکلی تھی تو اچانک اس کے اندر تجسس انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

☆☆☆

اب تک تو شہرینہ کے ذہن میں صرف یہی بات تھی کہ اسے ماں ملنا ہے ان کے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں اور بس اور کچھ کہ اس کی کمپنی سے ہی ماں کافی فریش نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن ان کے ساتھ اصل مسئلہ کیا تھا۔ یہ نہیں جانتی تھی اور شاید اس کا اس طرف دھیان بھی نہیں گیا تھا۔ لیکن ابھی البم دیکھتے ہوئے، جس طرح ماں رحیم داد کے لیے تڑپی تھیں، اس سے اس نے جانا کہ اصل مسئلہ رحیم داد ہے اور وہ کہاں ہے کیوں اپنی ماں سے ملنے نہیں آتا۔ جہانداد کو بھی تو پتا ہو گا کہ ماں کی یہ حالت رحیم داد کی وجہ سے ہے پھر وہ اسے کیوں نہیں بلاتے۔ ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے وہ گول برآمدے میں آ بیٹھی۔ سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ کیاریوں میں کھلے رنگ برنگے پھول بہار کی آمد کا پتا دے رہے تھے۔ لیکن اس وقت وہ کچھ ایسی سوچوں میں غلطاں تھی کہ موسم کی دلکشی اور ماحول کی دل فریبی بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر پا رہی تھی۔ نہ ہی اسے جہانداد کے آنے کا پتا چلا تھا۔ جب انہوں نے قریب آ کر سلام کیا تب بری طرح چونکی۔
''آپ شاید بور ہو گئیں۔'' وہ کہتے ہوئے دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے تو اسے اٹھنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔
''نہیں۔ ابھی آنٹی سوئی تھیں تو میں یہاں آ گئی۔''
''ہوں۔ اللہ کا شکر ہے، ماں اب بہت بہتر ہیں۔'' انہوں نے کہا تو وہ جو سوچ رہی تھی بے ساختہ کہہ گئی۔
''اور میرا خیال ہے رحیم داد کے آنے سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''
''رحیم داد۔'' جہانداد کو جھٹکا لگا تھا ایک دم اسے دیکھے گئے۔ تو وہ گڑبڑا کر بولنے لگی۔
''وہ اصل میں آنٹی مجھے البم دکھا رہی تھیں۔ سب کے بارے میں بتا بھی رہی تھیں۔ انہیں تو سب یاد ہے پھر رحیم داد کے لیے وہ بہت تڑپ رہی تھیں۔''

"وہ نہیں آسکتا۔" ان کی بھاری آواز پر وہ ایک دم خاموش ہوگئی جبکہ چہرہ سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ جہانداد کتنی دیر جیسے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے اس کے بعد بھی بس اس قدر کہہ پائے تھے۔

"رحیم داد مر چکا ہے۔"

"کیا۔" اس کی نظروں میں رحیم داد کی تصویر سما گئی۔ جوان جہان۔ جہانداد سے پانچ سال چھوٹا لیکن دیکھنے میں ان کے برابر۔ پھر وہ بھی کتنی دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ تو کیا آنٹی کو ان کی ڈیتھ کا پتا نہیں ہے؟"

"ان کے سامنے ہوا سب۔

یہ تینوں آئی مین میرے بابا، ماں اور رحیم داد بائے روڈ لاہور جا رہے تھے کہ راستے میں ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ بابا کا انتقال تو بعد میں ہوا لیکن رحیم داد وہیں موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا اور اسے خون میں لت پت دیکھ کر ہی ماں ذہنی توازن کھو بیٹھی تھیں اور یہی نہیں شدید ذہنی دھچکے کے باعث انہیں وقتاً فوقتاً شدید دورے پڑتے تھے۔ پراپر علاج سے دوروں کی شدت میں تو کمی آگئی ہے۔ اور یادداشت بھی کافی بہتر ہو رہی ہے ورنہ شروع میں تو مجھے بھی نہیں پہچانتی تھیں۔ بہرحال اب بس انہیں یہ یاد نہیں ہے کہ رحیم داد... لوڈ شیڈنگ سے منع کرتے ہیں کہ انہیں زبردستی یاد دلانے کی کوشش نہ کی جائے۔ آپ بھی پلیز احتیاط کیجیے گا۔" انہوں نے آخر میں اسے دیکھ کر کہا تو وہ جو انہیں ہی دیکھ رہی تھی سر جھکا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی۔

"اور آپ کو یہاں کوئی پرابلم تو نہیں ہوتی؟"

"نہیں بس جب آنٹی سو جاتی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی گہری سانس کھینچی۔

"ارے تو آپ میری لائبریری دیکھ لیں۔ خود کو یوں پابند کر کے بیٹھیں گی تو ظاہر ہے بور ہی ہوں گی۔ چلیں میں آپ کو اپنی لائبریری دکھا دوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ بھی بنا پس و پیش کے اٹھ کر ان کے ساتھ چل پڑی۔

خاصا بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ جس کے چاروں طرف دیوار گیر الماریوں میں کتابیں سجی تھیں۔ درمیان میں بڑی ٹیبل۔ وہ سراسیمہ سی چاروں اور دیکھنے لگی پھر ایسے ہی عالم میں پوچھا۔

"یہ سب آپ....."

"مجھ سے زیادہ ماں۔ وہ مطالعے کی بہت شوقین رہی ہیں۔ یہ سب ان ہی کا انتخاب ہے۔ آپ جب چاہیں یہاں آسکتی ہیں یا چاہیں تو یہاں سے کتاب لے کر کہیں بھی بیٹھ جائیں۔ میرا مطلب ہے خود کو اتنا پابند مت رکھیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔ شہرینہ نے یونہی سر ہلا دیا پھر بڑھ کر الماری سے فیض احمد فیض کی نسخہ ہائے وفا" نکال لی۔

"گویا آپ کو شاعری سے لگاؤ ہے۔" جہانداد کہے بغیر رہ نہ سکے۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ کتاب سینے سے لگا کر یوں دیکھنے لگی جیسے چلیں اور جہانداد نے سمجھ کر قدم آگے بڑھایا لیکن پھر اچانک کچھ یاد آنے پر رک گئے اور جیب میں لفافہ نکال کر کہنے لگے۔

"سوری میں اصل میں اس وقت اس لیے آیا تھا کہ یہ آپ کی نذر کر سکوں۔ پلیز۔" لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک نظر ان کے ہاتھ میں لفافے پر ڈال کر پوچھنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟"

"آپ کی سیلری۔" انہوں نے کہا تو اسے دھچکا لگا تھا۔

"سیلری.....!" میں یہاں جاب تو نہیں کر رہی۔ آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہے سر۔ اگر میری ذات سے کسی کا بھلا ہو سکتا ہے تو کیا میں اس کی قیمت وصول کرنے کھڑی ہو جاؤں۔ میرا ضمیر تو یہ گوارا نہیں کرتا۔ نو....." اس نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا پھر تیز قدموں سے وہاں سے نکل گئی جہانداد چاہنے کے باوجود اس کے پیچھے نہیں جا سکے۔

☆☆☆

خزینہ بے حد جھنجلائی ہوئی تھی کیونکہ ہنی صبح سے مسلسل روئے جا رہا تھا۔ اس نے سارے حربے آزما لیے لیکن وہ چپ ہو کے نہیں دے رہا تھا۔ آخر نجمہ خالہ کی گود میں پہنچ کر بولی۔

"دیکھیں خالہ! اسے کیا تکلیف ہے۔ دودھ بھی پلا دیا۔ بخار بھی چیک کیا کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کیوں روئے جا رہا ہے۔"

نجمہ خالہ نے ہنی کا پیٹ دبا کر دیکھا۔ ہنسلی وصلی چیک کی پھر خزینہ کو دیکھ کر بولیں۔

"اس کے باپ کو بلاؤ۔"

کیوں؟" خزینہ پریشان ہو گئی کہیں خدانا خواستہ کوئی سیریس بات تو نہیں۔

"یہ باپ کے لیے اداس ہو رہا ہے۔" نجمہ خالہ نے کہا تو جہاں اس کی جان میں جان آئی وہاں تڑخ کر بولی۔

"اس کا باپ یہاں نہیں ہے۔ ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ لیکن خالہ اتنے سے بچے کو کیا پتا؟"

"کیوں نہیں پتا۔ بیٹا جب اتنا سا بچہ باپ کو دیکھ کر کلکاریاں مارنے لگتا ہے تو اس کے نہ آنے پر رو سکتا ہے۔ ایسا کرو فون کر کے اس کی آواز ہی سنوا دو اسے۔ بلکہ اب تو سنا ہے تصویر بھی سامنے آتی ہے۔" خالہ اپنی منطق جھاڑے جا رہی تھیں۔ وہ ہنی کو ان کی گود سے اٹھا کر کمرے میں آ گئی اور اسے کندھے سے لگاتے ہوئے تنفر سے بولنے لگی۔

"باپ کے لیے اداس ہو رہا ہے ہونہہ۔ وہ تو اسے یاد بھی نہیں کرتا ہوگا۔ سنا ہنی۔ تمہارے باپ کو تمہارا خیال بھی نہیں آتا ہوگا۔ لہٰذا اس کے لیے واویلا مچانے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے۔" اس نے ہنی کو کندھے سے لگا کر اپنے سامنے کیا تو وہ پھر رونے لگا۔

"اچھا ایک منٹ..... یہ دیکھو۔" وہ اسے کھلونے اٹھا کر اٹھا کر دکھانے لگی۔ تب ہی نجمہ خالہ آ کر بولیں۔

"بیٹی..... باہر کوئی آدمی آیا ہے۔"

"کون ہے؟"

پتا نہیں، پہلے تمہارے میاں کا پوچھا پھر تمہارا۔"

"اچھا آپ اسے پکڑیں۔ میں دیکھتی ہوں۔" وہ ہنی کو ان کی گود میں ڈال کر دوپٹا لیتے ہوئے دروازے کی طرف آئی اور "کون ہے" پوچھنے کے ساتھ دروازہ بھی کھولا تو آگے تیمور غزنی کے بابا کھڑے تھے۔ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں پائی کہ اسے کیا کرنا چاہیے کہ وہ پوچھنے لگے۔

"اندر آ سکتا ہوں؟"

"جی جی!" وہ سٹپٹا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ بابا دونوں ہاتھوں میں شاپر سنبھالتے ہوئے اندر داخل ہوئے وہ دروازہ بند کر کے انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"آپ بیٹھیں، میں پانی لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے جا کر پانی لے آئی اس خیال سے کہ شاید سیڑھیاں چڑھ کے ان کی سانس پھول گئی ہو گی۔

"واہ اللہ....." بابا پانی کے دو گھونٹ لے کر کہنے لگے۔ "میں پہلے بس ایسے ہی آ گیا تھا۔ میرا مطلب تھا کہ اس لیے فوراً واپس پلٹنا پڑا۔ اصل میں اس نالائق نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ۔" بابا نے خاموش ہو کر ...ل کی آواز پر دھیان دیا پھر اس سے بولے۔ "بچہ رو رہا ہے۔"

"جی ابھی ہے۔ آج صبح سے رو رہا ہے۔" وہ خاصی کنفیوز ہو رہی تھی۔

"کیوں، کوئی تکلیف ہے تو چلو پہلے اسے ڈاکٹر کو دکھالاتے ہیں۔ پھر آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" بابا ...ہا تو اس کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

"کیا بات....."

"ہیں....." بابا قصداً اس کا چہرہ یوں دیکھنے لگے جیسے کیا کہا تم نے۔

"میں ہنی کو لاتی ہوں۔" وہ سٹپٹا کر وہاں سے بھاگی۔

نجمہ خالہ ہنی کو زبردستی فیڈر پلانے کی کوشش کر رہی تھیں جس سے وہ اور مچل کر رو رہا تھا۔

"یہ بھوکا نہیں ہے خالہ۔ لائیے اسے مجھے دیں۔ اس کے دادا آئے ہیں۔ آپ جلدی سے چائے اور ساتھ ...ں اور بھی جو کچھ بن سکے بنالیں۔" وہ جلدی جلدی نجمہ خالہ کو ہدایات دے کر ہنی کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"لاؤ مجھے دو۔" بابا نے اٹھ کر ہنی کو اس سے لے لیا اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ "کیوں رو رہا ہے میرا ...کیا ہو گیا ہے بھئی۔ آپ تو بہت اچھے بہت پیارے بچے ہو۔ ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ اچھے بچے روتے نہیں ...دیکھو دادا تمہارے لیے کیا لائے ہیں۔"

ہنی اجنبی چہرہ دیکھ کر چپ ہوا تھا یا خون کی کشش تھی کہ وہ بابا کے ساتھ غوں غاں کرنے لگا۔

"سمجھ گیا سمجھ گیا۔ مما تنگ کر رہی تھیں ناں۔ دیکھو دلہن تمہاری شکایت کر رہا ہے۔" بابا نے ہنی سے بات ...تے ہوئے اسے بھی مخاطب کر لیا تو وہ جو حیرت سے دادا پوتے کو دیکھ رہی تھی چونک کر بولی۔

"آپ بیٹھیں..... میں چائے لاتی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہاں سے نکل کر کچن میں آ گئی۔

نجمہ خالہ کباب تل رہی تھیں۔ دوسرے چولہے پر چائے کا پانی کھول رہا تھا۔ اس نے ٹی پاٹ میں چائے ...پھر کیبنٹ سے دوسرے لوازمات نمکو بسکٹ اور کیک وغیرہ نکال کر ٹرالی میں رکھنے لگی۔

"دادا کی گود میں جا کر چپ ہو گیا ہے ہنی۔" نجمہ خالہ نے کباب کی پلیٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ وہ ان ...کے اپنے کام میں مصروف رہی۔ اصل میں سوچ رہی تھی کہ تیمور غزنی کے بابا کیوں آئے ہیں اور اس سے کیا ...کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اپنے طور پر جانے کیا کچھ قیاس کرتے ہوئے وہ بہت ڈھیلے ہاتھوں سے ٹرالی دھکیل ...تی۔

☆☆☆

حمزہ کا غصہ اپنی جگہ فاخرہ بھی اس سے بات نہیں کر رہی تھیں کیونکہ وہ ربیکا کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا۔ ...سے بات کرنا تو دور کی بات یوں جیسے وہ اس گھر میں موجود بھی نہ ہو۔ اس کے وجود سے اس قدر لاتعلقی جس ...ربیکا اپنی جگہ تلملائی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ اسے اپنے ڈیڈی پر بے حد غصہ تھا کہ وہ آناً فاناً ...کر کے اسے یہاں بے عزت ہونے کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ یہ اس کی انسلٹ ہی تو تھی کہ جس کی وجہ سے وہ ...کر میں تھی وہ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا۔ کسی کسی وقت اس کے اندر ایسا ابال اٹھتا کہ دل چاہتا ...سے کہے لاؤ میرا طلاق نامہ اور پھر ہر شے کو ٹھوکر مارتے ہوئے یہاں سے نکل جائے۔ لیکن پھر سوچتی اب ...کہاں جائے۔ جس طرح حسان صاحب اسے یہاں چھوڑ گئے تھے اس نے قسم کھالی تھی کہ وہ اب کبھی باپ کے ...گھر نہیں جائے گی اور یہ بات اس نے ثمرہ سے ہی کہہ دی تھی۔

"میں جاؤں گی لیکن آپ کے گھر کبھی نہیں آؤں گی۔"

بہر حال کشیدگی کے باعث اس گھر کا ماحول بہت عجیب سا ہو گیا تھا۔ جب رویوں میں لچک نہ ہو تو دلوں میں بھی فاصلوں کا گمان ہوتا ہے۔ ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت تلے سب ایک دوسرے سے اجنبی سے ہو گئے تھے۔ اور ہمیشہ سے جو ایک ہی روٹین چلی آ رہی تھی وہ بھی آؤٹ ہو گئی تھی۔

حمزہ اٹھتا اپنے وقت پر ہی تھا اور فاخرہ جو ہمیشہ ناشتے کھانے کا بہت خیال رکھتی تھیں اب قصداً سے نہیں ٹلتی تھیں تا کہ ناشتے کے بہانے ہی حمزہ بیوی سے بات کرے۔ لیکن وہ جانے کیا سوچے ہوئے تھا ہی چائے بنا کر پیتا اور آفس کے لیے نکل جاتا تو پھر رات گئے لوٹتا۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اسی بہانے سے بات کر لیں۔ پوچھیں اس سے کہ وہ اتنی دیر تک کہاں تھا۔ اور یہ نہیں تھا کہ فاخرہ کو پروا نہیں تھی۔ وہ فکر مند تھیں اور جب تک وہ آ نہیں جاتا تھا سو نہیں پاتی تھیں پھر بھی اس سے بات نہیں کرتی تھیں۔ کیوں کہ پریشان ہونے کی وجہ سے وہ بیٹے کے سامنے شرمندہ شرمندہ سی رہتی تھیں۔

اور ریحا کی اپنی مرضی تھی۔ دن چڑھے تک پڑی سوئی رہتی۔ اٹھتی تو دل چاہتا تو اپنے لیے ناشتا بنا لیتی ورنہ صرف چائے پی اکتفا کرتی پھر دوپہر کے کھانے کے لیے فاخرہ اسے بلاتیں تو وہ منع کرتے ہوئے کہتی کہ جب بھوک لگے گی کھا لوں گی اتنے نروٹھے پن سے کہتی کہ فاخرہ اصرار بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وقت وہ اپنے لیے کھانا لے کر نکلی تو آگے فاخرہ جو نماز کے لیے کھڑی ہو رہی تھیں اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"بیٹی، جمعہ کا دن ہے نماز پڑھ لو۔"

"آپ پڑھ تو رہی ہیں۔" وہ بدتمیزی سے بولی۔

"میں تو اپنے لیے پڑھ رہی ہوں۔ تم اپنے لیے پڑھو۔" فاخرہ نے نرمی سے کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"مجھے جب ضرورت ہو گی پڑھ لوں گی۔"

"ضرورت کے لیے نہیں پڑھی جاتی۔ نماز تو فرض ہے پانچ وقت۔"

"پتا ہے۔" اکتا کر بولی۔

"پتا ہے تو پھر کیوں نہیں پڑھتیں۔ اللہ کو راضی کرو گی تو پھر جو مانگو گی ملے گا۔"

"کیا مانگوں، سب کچھ تو ہے میرے پاس۔" لہجے میں بلا کا تفخر تھا۔

"پھر تو تمہیں زیادہ پڑھنی چاہیے۔ شکرانے کے ساتھ۔" فاخرہ مسکرائیں۔

ریحا کو شاید اب جواب نہیں سوجھا تھا جب ہی سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آ گئی اور کھانے کی ٹرے اپنے سامنے رکھی تو اچانک اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ سماعتوں میں اپنی ہی آواز کی بازگشت گونجنے لگی۔

"کیا مانگوں سب کچھ تو ہے میرے پاس۔"

"ہاں ہے سب کچھ۔" اس نے خود کو باور کرایا تھا کہ جانے کس نے ٹوک دیا۔

"پھر دل خالی کیوں ہے؟"

"ہیں۔" وہ نہ صرف چونکی گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ہنی بابا کی گود میں سو گیا تھا۔ خزینہ نے کچھ دیر انتظار کیا کہ بابا اسے لے جانے کو کہیں گے لیکن وہ بہت آرام سے بیٹھے تھے۔ تب وہ خود ہی اٹھ گئی۔

"لائیے۔ اسے کمرے میں سلا دوں اور اگر آپ بھی آرام کرنا چاہیں تو۔"

"نہیں..... تم اسے سلا کر آؤ۔" بابا نے آرام سے ہنی کو اٹھا کر اس کے بازوؤں میں ڈال دیا۔ اور سامنے

بیل پڑ گئیں سیدھی کرلیں گویا ابھی ان کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خزینہ سمجھ کر اندر سے جزیز ہوتی ہنی کو سلا کر واپس آگئی۔ تو بابا پوچھنے۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" "میرا مطلب یہ اپارٹمنٹ چھوٹا....."

"نہیں میرے اور ہنی کے لیے ٹھیک ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"تمہارے اور ہنی کے لیے..... اور اگر مہمان وغیرہ آجائیں تو.....!" بابا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بہت نارمل انداز میں بات کر رہے تھے۔

"تو ان کے لیے بھی بہت جگہ ہے۔" اسے اپنے ذہن کو حاضر رکھنا پڑ رہا تھا جو بار بار بابا کی آمد کا مقصد سوچنے لگتا۔

"ہمم۔ اس کا مطلب ہے تمہارے دل میں بہت جگہ ہے۔" بابا اثبات میں سر ہلانے لگے پھر اسے دیکھ کر گویا ہوئے۔ "اچھی بات ہے دل میں جگہ ہو تو گھر چھوٹے نہیں پڑتے اور دل میں جگہ نہ ہو تو محل بھی تنگ پڑ جاتے ہیں۔"

"جی....."

"گویا تم میری بات سے اتفاق کرتی ہو۔"

"جی....."

"تو بیٹا، جب تمہارے دل میں اتنی جگہ ہے تو اس کے لیے بھی گنجائش پیدا کرلو میرا مطلب ہے سارہ کے لیے۔" بابا نے کہا تو اس نے سر جھکا لیا۔

تو ساری تمہید اس لیے تھی۔

"میں تمہارے پاس ریکویسٹ لے کر آیا ہوں۔ تیمور سے یہ مت کہنا کہ سارہ کو چھوڑ دے پھر تمہارے پاس آئے۔ یہ صرف اس لڑکی پر ہی نہیں ہم سب پر ظلم ہوگا کہ تیمور کے ایسے کسی اقدام سے سارا خاندان ٹوٹ جائے گا بکھر جائے گا۔ اس لیے کہ سارہ میری بھتیجی اور تیمور کی ماں کی بھانجی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں۔"

اور شاید سمجھ کر ہی اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو گرنے لگے تھے جنہیں دیکھ کر ہی بابا خاموش ہو گئے۔

کتنی دیر بعد بولے۔

"اگر تم سمجھتی ہو تیمور نے تمہیں دھوکا دیا ہے تو پھر دھوکا تو سارہ کو بھی دیا کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ وہ تم سے شادی کر چکا ہے اور جس دن اسے معلوم ہو گیا تم تصور نہیں کر سکتیں کہ وہ کیسی قیامت لے آئے گی پھر سمجھو کہ کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ یہاں صرف تم ہو اور ادھر سارہ کے ساتھ سارا خاندان کھڑا ہو جائے گا پھر تم سمجھ سکتی ہو نتیجہ کیا نکلے گا۔"

وہ ایک دم سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی تو وہ نظریں چرا کر بولے۔

"میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ میں تمہیں....."

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ ان کی بات کاٹ گئی۔

"میں کیا چاہوں گا بیٹا۔ یہی کہ تم اپنا گھر خراب مت کرو۔ ٹھیک ہے تیمور سے غلطی ہوئی کہ اس نے تمہیں پہلے سے نہیں بتایا تھا تو اس کے لیے تم اسے جو چاہے سزا دو لیکن پھر معاف کر دو کہ اسی میں بہتری ہے۔"

"میری یا آپ کے بیٹے کی؟" وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"دونوں کی۔ تیمور تمہارے اور ہنی کے بغیر نہیں رہ سکتا اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی تیمور کو کھونا نہیں چاہو گی اس لیے بہتر ہے کہ صلح کرلو۔ اور سمجھ لو کہ وہ صرف تمہارا ہے۔" انہوں نے کہا تو خزینہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا کیونکہ اسے لگا کہ اسے ان کے ساتھ بحث نہیں کرنی چاہیے۔

"پھر میں کیا امید رکھوں؟" کتنی دیر اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد بابا نے پوچھا تو وہ خود کو بے بس

محسوس کرتے ہوئے بولی۔
"سوری! ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

☆☆☆

ماں سو گئیں تب شہرینہ بانو قدسیہ کا افسانوں کا مجموعہ لے کر سٹنگ روم میں آ بیٹھی تھی۔ اور پہلا افسانہ پڑھنے میں دل نہیں لگا۔ بار بار ذہن ادھر ادھر بھٹک جاتا۔ لیکن پھر وہ ایسی مگن ہوئی کہ گرد و پیش کا ہوش نہیں رہا۔ ادھر ادھر سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی جس سے وہ ڈسٹرب ہوتی۔ ایسے طلسماتی ماحول میں جب اچانک اس کا موبائل بجا تو وہ واقعی اچھل پڑی اور ایکدم موبائل اٹھا کر ریسو کا بٹن پش کرتے ہوئے کان سے لگا لیا۔
"شہرینہ....." حمزہ کی آواز پر اس نے چونک کر موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا پھر اپنی جلد بازی پر جز بز ہوتے ہوئے دوبارہ کان سے لگا لیا۔
"شہرینہ..... سن رہی ہوں نا۔" حمزہ پوچھ رہا تھا۔
"ہوں....."
"مجھے اس وقت ایک دوست کی ضرورت ہے۔ تم فوراً آ جاؤ شہرینہ ورنہ میں اپنے ساتھ کچھ بھی کر جاؤں گا۔" حمزہ کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔
"کیا ہو گیا ہے حمزہ۔ پاگل تو نہیں ہو گئے۔" وہ دانت پیس کر چیخی۔
"ہاں ہو گیا ہوں پاگل۔ بس تم آ جاؤ فوراً....."
"فوراً کیسے آ سکتی ہوں۔"
"جیسے بھی ورنہ کل میری میت پر بھی مت آنا۔" حمزہ نے کہہ کر لائن کاٹ دیں تو وہ پریشان ہو گئی۔ سمجھ نہیں آیا کیا کرے۔ اور وہ پتا نہیں کہاں تھا گھر پر یا کہیں اور۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے حمزہ کو میسج سینڈ کیا۔
"کہاں ہو تم..... میں آ رہی ہوں۔" فوراً ہی حمزہ کا جوابی میسج آ گیا جس میں اس نے جگہ بتا دی۔
"اگر اس نے میرے ساتھ مذاق کیا ہو گا تو میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ اس نے سوچا پھر جہانداد کو کال ملا دی۔
"جی میں شہرینہ....." جہانداد نے فوراً اس کی کال لی تھی۔
"سر میرے گھر سے کال تھی۔ مجھے ابھی فوراً جانا ہے۔" اس نے کہا تو وہ پوچھنے لگے۔
"خیریت۔ آنٹی مین سب ٹھیک تو ہے نا۔"
"جی۔ بس ایک ضروری کام ہے۔"
"اچھی بات ہے۔ آپ ڈرائیور سے کہہ دیں آپ کو چھوڑ آئے گا۔ اور ہاں ماں....."
"ماں سو رہی ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کو فون کیا ورنہ میں انہیں بتا کر چلی جاتی۔"
"ہوں۔"
"ٹھیک ہے سر۔ آپ ماں کے اٹھنے سے پہلے آ جایئے گا۔ میں جا رہی ہوں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔
حمزہ ڈیفنس سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے وہ دس منٹ میں پہنچ گئی اور کچھ دیر فاصلے پر رک کر اسے دیکھنے لگی کہ آیا وہ واقعی پریشان یا کسی مشکل میں ہے یا ایسے بے وقوف بنایا ہے..... اور حمزہ سگریٹ پھونکتے ہوئے بے حد ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ شیو بھی قدرے بڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کی ایسی حالت دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے حمزہ کے سامنے آن بیٹھی اور بے حد خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ پوچھنا چاہتی تھی کہ کہیں کیا ہوا ہے لیکن حلق خشک ہو رہا تھا۔
حمزہ نے اسے دیکھا پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولا۔

"ابھی زندہ ہوں....." وہ کچھ نہیں بولی بس دیکھے گئی۔ پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھی۔
"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔ ہنسو مجھ پر۔ میری حالت پر ہنسو میں اسی قابل ہوں کہ مجھ پر ہنسا جائے۔ کیونکہ میں نے سب کو ناراض کر دیا ہے۔ اکیلا ہو گیا ہوں میں۔ بالکل اکیلا۔ اور ایک اکیلا آدمی کیا کرے۔ بتاؤ کیا کروں میں۔" حمزہ اس بے چارگی سے بول رہا تھا کہ اسے ترس آنے لگا۔ گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پانی کا حلق سے اتارا پھر خود کو سنبھال کر پوچھنے لگی۔
"تم بتاؤ کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"
"مر جانا چاہتا ہوں۔" وہ فوراً بولا۔
"کیوں؟" شہرینہ کو خود بہت ضبط کرنا پڑ رہا تھا۔
"کیونکہ میں سب سے کٹ کر نہیں جی سکتا۔ نہیں جینا چاہتا۔" حمزہ نے کہا تو فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ البتہ یہ سمجھ گئی تھی کہ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ جانے کیا مسئلہ تھا لیکن اسے بہر حال اس ڈپریشن سے نکالنا تھا۔ وہ بے شک اس کا نہیں تھا لیکن اس پر اعتماد کرتا تھا اور گو کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر بھی سوچ سوچ کر بولنے لگی۔
"تم اکیلے نہیں ہو حمزہ..... تم نے خود اپنے آپ کو اکیلا کر لیا ہے۔ سب رشتوں سے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی بھاگتے پھر رہے ہو۔ کب تک بھاگو گے۔ بس رک جاؤ، تھم جاؤ، دیکھو پلٹ کر سب تمہارے اپنے ہیں۔ اور کوئی تم سے ناراض نہیں۔"
"ناراض نہیں تو پھر اماں مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں اور تم بھی میرے میسجز کا جواب نہیں دیتیں۔ یہ ناراضی نہیں تو اور کیا ہے؟" وہ بچوں کی طرح شاکی ہو رہا تھا۔
"مصلحت، ہم نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر رکھی ہے حمزہ؟ تاکہ تم اپنی لائف میں سیٹ ہو جاؤ۔ ہم تمہیں ہنستا بستا دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم نے سب کو ناراض نہیں..... پریشان کر رکھا ہے اور ہاں چچی جان تم سے کیوں بات نہیں کر رہیں۔" اسے اچانک فاخرہ کا خیال آیا تھا۔
"پتا نہیں۔" حمزہ کا روٹھا انداز تھا۔
"یہ مت کہو۔ تم نے ضرور انہیں تکلیف پہنچائی ہو گی اور کچھ زیادہ تکلیف پہنچائی ہو گی ورنہ چچی جان تو کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتیں۔" اس نے کہا تو حمزہ چہرہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا پھر ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔
"چلو۔"
"کہاں؟"
"گھر۔"
"میرے گھر..... تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گے۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ حمزہ خاموش رہا اور جب وہ اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھ گئی تب بولا۔
"میں تائی جان کا سامنا نہیں کر سکتا۔"
"بس بہت ہو گیا۔ حمزہ۔ امی کو تم سے کوئی شکایت نہیں۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پتا نہیں کیا کچھ سوچتے رہتے ہو۔ لگا کچھ مجھے کیسے پریشان کر دیا کہ میں بھاگی آئی۔ کیوں بھاگی آئی۔ سوچنا ہے تو یہ سوچنا کہ میں کیوں بھاگی آئی۔" وہ بولے چلی جا رہی تھی کہ اچانک سگنل پر بائیک رکنے سے اسے جھٹکا لگا۔ تو بے اختیار حمزہ کی کمر میں بازو ڈال کر خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے دیکھا ساتھ رکی گاڑی میں جہانداد اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

نرمین سرحیو

خزاں میں چراغ

نڈھال تھکا تھکا سا وجود لیے وہ مدہوشی کی حالت میں تھی۔ نیند سے بوجھل آنکھیں لیے اس نے تخت سے اٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ اٹھنے کی ہمت خود میں نہ پاتے ہوئے اس نے بہت مشکل سے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں صبح کے سفیدی آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ پرندے آس پاس سے اڑتے کبھی تخت کے سامنے آنگن میں کچھ دیر گھوماتے آ ٹھہرتے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا موسم متوقع بارش کی پیش گوئی لگ رہا تھا۔ سارے منظر کا نظارہ لیتی اس کی آنکھوں کی تاب ختم ہوگئی اور نیند کا جھونکا اسے ساری دنیا سے قطع تعلق کروا گیا۔

مندی مندی آنکھیں تب کھلیں جب تپش کا احساس شدت اختیار کرنے لگا۔ اس نے ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے آس پاس نگاہ دوڑائی تو دھوپ سارے آنگن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ خالی الذہن بس اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بجلانے کب سے ایسے ہی بیٹھی ہوئی تھی جب اس نے سفید رنگ کی آوارہ بلی کو کچن کی طرف جاتے دیکھا۔ لمبے عرصے بعد اس منظر نے اس کی ساری توجہ کھینچ لی۔ اس نے دلچسپی سے بلی کو دیکھا جو کچن کے اندر گئی تھی۔ برتن کے گرنے کی آواز پر وہ دانت نچلے لب پر جمائے مسکرادی۔

"ارے ریما دیکھو کہیں بلی کچن میں نہ چلی گئی ہو۔" چارپائی پر اونگھتی شاہانہ بیگم بوکھلا کر اٹھیں اور ریما کو آواز دی۔

"ریما..... اور ریما۔" ان کی چیختی آواز پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو بڑبڑاتی خود ہی کچن میں چلی گئیں۔ جب میاؤں میاؤں کرتی بلی کچن سے نکل کر باہر بھاگی تب کہیں جا کر وہ کچن سے نکلیں۔

"تم جاگ گئیں۔ اب کیسی طبیعت ہے؟ کچھ کھالو کمزوری ہو رہی ہوگی۔" انہوں نے پیار سے اسے دیکھا۔

"ہاں چائے بسکٹ....." اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل وہ کچن میں جا چکی تھیں۔ دو دن کے بعد وہ آج خود کو پرسکون ہلکا اور توانا محسوس کر رہی تھی۔ شاید ایک لمبا عرصہ تھا جس نے اس کی توانائیاں کھینچ لی تھیں جبھی تو زندگی بھی عجیب سی ہوگئی تھی۔ بے زار، بے سمت اور بے سکون سی۔ ابھی ایک فیصلہ بھی تو تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ سر جھٹک دے لیکن فیصلے کا بوجھ ذہن پر حاوی ہونے لگا۔ ذہن پر سوار سوچیں سرپٹ دوڑ رہی تھیں جب اماں نے کندھا ہلایا۔

"کیا ہوا؟" اماں نے پریشانی سے کہا تو اس نے سر جھٹک دیا۔

"کچھ نہیں یونہی بس....." اس نے بات ٹال دی۔

"دیکھو بیٹا! غم تو بڑا ہے لیکن اللہ بیٹھا ہے نا۔ صبر کرو ابھی عمر پڑی ہے اللہ دوبارہ سے گود ہری کرے گا، ان شاء اللہ۔" انھوں نے دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے چائے اس کی جانب بڑھائی تو وہ انہیں دیکھ کر رو گئی۔ آسودگی کہیں دور جا سوئی۔ دل غم سے بھرنے لگا۔ دکھوں کی لہریں دوبارہ سے دل کی سطح پر تیرنے لگیں۔

☆☆☆

پھر اگلا دن آیا..... پھر اس سے اگلا..... پھر دن پر دن گزرنے لگے۔ ہفتے بھی گزر رہے تھے۔ دن ماہ بن گئے۔ اس کا غم کم ہو گیا تھا اور صحت بھی اچھی۔ لیکن جب بھی وہ فیصلے کا سوچتی، ذہنی دباؤ بڑھ جاتا اور دل پر اضطراب کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ وہ سونے کی کوشش بھی کرتی تو بے محل ہی کوئی گھنٹی بجنا شروع ہو جاتی۔ وہ اور پریشان ہو جاتی۔ مزید کچھ ہفتے گزرے تو اماں اور پریشان سی رہنے لگیں پھر ابا بھی پریشان سے نظر آتے۔ اماں نے خود کو کام میں مصروف کرنا چاہا اور ابا تو من پسند مشغلوں سے کبھی چھوٹ گئے۔ اسے معلوم تھا، اندازہ بھی تھا لیکن چاہ کر بھی کچھ نہ کہہ پانا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ اسے آج پتا لگا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ سلجھے دھاگے خود بخود اس کی ذہنی الجھن میں الجھ گئے تھے۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ یرما اندر پڑھ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ خاموش طبع لڑکی تھی۔ اپنے آپ میں مگن رہتی

تھی۔ بولتی بھی کم ہی تھی۔ خیر بولتے تو یہاں سب ہی کم تھے لیکن اکثر خاموشی سے گھبرا کر انسان بول اٹھتا ہے نا۔ بے وجہ بلاسبب بس خاموشی ٹوٹ جائے اور یہاں سب ہی اس کے جتن کرتے تھے جبکہ صائمہ اسی خاموشی میں اپنی سوچوں کی ڈور میں گم ہو جاتی تھی۔

اماں دوپہر کے برتن دھو کر ابھی صحن میں بیٹھی تھیں۔ اسی دوران اطلاعی گھنٹی بجی۔ چارپائی پر چپ چاپ لیٹی صائمہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ پرانی محلے دار سکینہ خالہ تھیں۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر کچن میں ان کی خاطر مدارت کے لیے چلی گئی جبکہ اماں ان کے ساتھ ہی بیٹھی رہیں۔ اسے حیرت ہوئی ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے سکینہ خالہ نے یہ نہیں پوچھا کہ شاہانہ تمہاری بیٹی ابھی تک یہیں میکے میں کیوں ہے سوا مہینے سے کیونکہ یہ جملہ ہر کسی کی زبان کی نوک پر تھا۔ کچن میں ساری باتوں کی آواز صاف آتی تھی کہ یہ درمیانے طبقے کا ایک گھر تھا جس کا بڑا صحن تھا باہر ہی کچن اور اندر چھوٹے سے لاؤنج کے ساتھ تین کمرے تھے۔

"ہاں سمیہ کی بیٹی کیسی ہے اب؟" اماں نے ہمدردی سے کہا۔ چائے بناتی وہ سب باتیں سننے لگی۔

"کیسی نصیبوں کی کالی ہے بے چاری۔ بیوہ ہوگئی ہے اور میکے میں بیٹھی ہے۔" سکینہ خالہ نے افسوس سے کہا۔

"ہاں بیٹیوں کے نصیب سے ہی تو ڈر لگتا ہے۔ اب برابر کی جاذبہ کی بیٹی بھی طلاق لیے عدت پوری کر رہی ہے۔" اماں نے کہا۔

"چچ..... چچ..... چچ بس اب کیا کہیں لوگوں کو آج کل قدر ہی نہیں۔" سکینہ خالہ نے کہا۔

"ہاں جاذبہ کی بیٹی فری بھی صائمہ جتنی ہے اور اب اس عمر میں اولاد کے اتنے غم انسان کو مار ہی ڈالتے ہیں۔" اماں نے کہا۔

"ہاں اور فیروزہ کی دیورانی کی بیٹی کی بھی طلاق ہوگئی۔" سکینہ خالہ نے کہا۔ اس نے کپ نکال کر ٹرے میں سیٹ کیے۔

"اوے اس کی تو بیٹی ہی زبان دراز تھی۔ لڑکیوں کو ذرا سسرال میں ایڈجسٹ کر جانا پڑتا ہے لیکن آج کل لڑکیاں تو سسرال کے حالات سے گھبرا ہی جاتی ہیں۔" سکینہ خالہ نے کہا۔ وہ چائے کپ میں ڈالنے لگی۔ دل ڈوبتا سا محسوس ہوا۔

"گھر بنانے کے لیے دل پر کتنے زخم چھپانے پڑتے ہیں اور تکلیف ہو تب بھی صبر کرنا پڑتا ہے۔" اماں نے کہا۔ چائے ڈالتے اس کا ہاتھ لرزا اور چائے اس کے ہاتھ پر چھلک پڑی۔

"جو بھی ہو..... جو بھی کرے۔ مصیبت تو لڑکی پر آتی ہے۔ زندگی تو اس کی مصیبت میں پڑ جاتی ہے۔" سکینہ خالہ نے افسوس سے کہا۔ دوسرے لوازمات ٹرے میں رکھتے ہوئے اس کا دل بوجھل تھا۔ وہ ٹرے لے کر باہر نکلی۔

"یہ بھی ہے۔" اس نے اماں کا جواب سنا اور اثبات میں ہلتا ہوا سر بھی دیکھا۔ شکستہ قدم لے اس نے ٹرے تخت پر رکھی۔ بمشکل مسکراتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

دو بج رہے تھے۔ رات کا دوسرا پہر تھا۔ ہر سو سناٹا تھا دونوں بھائی، اماں اور ابا باہر چارپائی پر سو رہے تھے۔ ریما بھی سونے کی تیاری کر رہی تھی۔

"باجی تمہارا بستر ادھر لگاؤں یا باہر؟" ریما نے تکیہ اٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں میں اندر سوؤں گی آج۔" اس نے دھیمے سے کہا تھا۔

"لیکن باہر بہت اچھی ہوا چل رہی ہے۔" ریما نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں اندر ہی سوؤں گی۔" اس کا لہجہ میں سر ہلتا دیکھ کر ریما کندھے اچکاتی باہر چلی گئی۔ وہ بوجھل کرتے احساسات کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی۔ فیصلہ اس کا تھا، اختیار بھی اسے تھا لیکن..... لیکن اس فیصلے کے لیے حالات کو دیکھنا بھی تو ضروری تھا اور اسے معلوم تھا کہ ان حالات میں کسی نے اس کا

ے میں خاص طور پر پوچھا تھا۔
کیا وہ واپس جا سکتی ہے؟ کتنا مشکل تھا یہ فیصلہ کرنا
ا کرنا چاہیے؟ جب کوئی ساتھ نہ ہو اور قسمت بھی ستم
نے کی در پے ہو تو انسان کو کہاں جانا چاہیے تھا؟ کیا
چاہیے تھا؟ مشکل تھا لیکن اب فیصلہ کرنا ضروری
تھا۔ اس کی ہمت بھی تو پستی اختیار کر رہی تھی۔ دل
تھا لیکن فیصلہ تو کرنا تھا کہ فیصلے ہی تو زندگی کی گاڑی
رول ہوتے ہیں۔ اگر انسان فیصلے نہ کرے تو زندگی
جاتی ہے اور سوال..... یہ سوال کہ اب.....؟ کہ اب
وگا..... ساتھ کھڑا ہنس رہا ہوتا ہے۔ اس نے آسمان
ت دیکھا۔ تارے دیکھے۔ چمکتے ستارے دیکھے۔
ان پر رشک کرتے ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا یہ کتنے
رتے ہیں۔
اچانک اسے لگا اس پر اس کے الفاظ ہنس رہے
جو اس نے احرار کو کہے تھے۔ قصور اس کا نہ تھا کہ
ت کی بھی تو حد ہوتی ہے۔ روز روز کی گالم گلوچ،
یٹ، بے وجہ غصہ اور تنگ دستی انسان کب تک
ت کرتا ہے؟ پھر اپنا بچہ کھو دینا روز کے ہی جھگڑے
..... دل پر بوجھ بڑھنے لگا لیکن قصور شاید احرار کا بھی
کہ اس نے تو بچپن سے یہی ماحول اپنے گھر میں
تھا تو وہ کیوں خود کو تبدیل کرتا؟ کس لیے؟
اسے معلوم تھا فیصلہ مشکل ہے لیکن اس کے بس
نہ تھا کہ لوگوں کی، اپنوں کی اور سب کی باتیں
نت کرتی، چپ چپ سہتی اور جیتی بھی۔ مشکل
ی سہی گزارا تو ہو رہا تھا نا۔ بوجھل ہوتے دل کے
اس نے بمشکل احرار کو کال کی۔
''ہیلو..... کون.....'' احرار کی نیند میں ڈوبی آواز
دی۔ احرار کو نمبر سیو نہ کرنے کی بری عادت بھی تھی۔
''میں..... میں صائمہ..... صائمہ کی دوست بات
ہی ہوں۔ اس کی طبیعت اچانک..... رات کو

☆☆☆
صبح دس بجے تھے۔ وہ تخت پر لیٹی
جب احرار کی آمد ہوئی۔ اس نے خود
طاری کر لی کہ ویسے بھی واپس جانے کے
اسے تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اح
پندرہ منٹ بیٹھا اور پھر جلدی سے چلنے کا
اس نے چپ چاپ اندر جا کر پہلے
سامان اوپر بیڈ پر رکھا اور خود بھی بیڈ پر بیٹھ گ
نہ تھی کہ اتنی جلدی احرار آ جائے گا لیکن اس
بھی سامان پیک کر لیا تھا۔ اب وہ کچھ دیر
تھی پھر سامان لے کر باہر آ گئی۔ وہ سب
باہر کھڑی بائیک پر بیٹھ رہی تھی جب اس
خالہ کو اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔
چپ چاپ سی وہ احرار کے ساتھ بائیک
واپسی کے راستے پر گامزن تھی۔ سب ٹھیک ہونے
تو لگنا تھا لیکن امید تھی کہ ہو ہی جاتا۔ شاید اب ٹھیک
سکینہ خالہ اندر آئیں تو ریما ان
مدارت کے لیے کچن میں چلی گئی۔
''صائمہ بیٹی چلی گئی؟'' سکینہ خالہ نے
''ہاں ابھی گئی ہے۔'' انہوں نے جوا
اس کے بعد گہری خوشی تھی۔ کچھ دیر بعد
ٹرے ٹیبل پر رکھی اور ساتھ ہی بیٹھ گئی۔
''خالہ! فری کیسی ہے؟'' اس نے ج
کی بیٹی کا پوچھا۔
''اپنے گھر میں خوش اور ٹھیک ہے،
سے۔'' سکینہ خالہ نے جواب دیتے ہوئے ش
نگاہ اٹھا کر دیکھا جہاں اداسی کی گہری تحریر رقم
دونوں کے تاثرات دیکھ کر ریما نے س
نفیسہ سعید نے شاید صحیح ہی کہا تھا۔ ب

UNOVELS.COM

سدرہ حیات

کچھ لمحے ہم پر قرض تھے

۲
دوسری اور آخری قسط

''اب انجان بننے کی کوشش مت کریں۔ آپ کا کیا خیال تھا کہ شادی کے اس ہنگامے میں یہ بات دب جائے گی اور میں آپ سے سوال تک نہیں کروں گا۔ آپ سے کیا کہوں افسوس تو مجھے اپنے آپ پر ہے جو آپ کے چہرے کے پیچھے چھپے دوسرے چہرے کو نہیں پہچان سکا۔'' شاہنواز صاحب کے لہجے کی گونج پر سب دم سادھے کھڑے تھے۔ حنان اور عالیان کو بھی کوئی اسٹیج پر سے اٹھا لایا تھا۔

''آپ..... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو کوئی دھوکا نہیں دیا۔''

''غلط فہمی۔ اب ان لفظوں سے آپ میری تشفی نہیں کروا سکتے۔ جو دھوکا فراڈ آپ نے کیا ہے۔ اس کا پورا ثبوت ہے میرے پاس۔'' وہ اس قدر طیش سے بولے۔ کہ عنایت اللہ کو اپنی رہی سہی ہمت بھی جواب دیتی محسوس ہوئی۔ اتنے سارے لوگوں خاص کر برادری کے ہوتے ہوئے اتنی ذلت انہیں سہنی پڑ رہی تھی۔

''شاہنواز صاحب آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ہم یوں لڑائی جھگڑا کریں۔'' عنایت اللہ کی حالت دیکھتے ہوئے ایک بزرگ شخصیت آگے آئی۔ ''آخر بچوں کے رشتے کا معاملہ ہے۔''

''بس بزرگوار یہ رشتہ اب ختم سمجھیے۔'' شاہنواز صاحب نے گویا کوئی صور پھونکا تھا جو سب یک دم خاموش ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے عنایت اللہ آگے بڑھے جیسے کسی قوت نے انہیں جھنجھوڑ دیا ہو۔

''رب دا واسطہ اے..... ایسے مت کریں۔ میں کل تک اپنی بے گناہی ثابت کر دوں گا۔ میرا یقین کریں۔''

''اب اس ڈرامے کی ضرورت نہیں ہے۔ ثبوت میرے پاس ہے۔ ہیرا پھیری کی ہے آپ نے پورے مال میں اور میں یہ کبھی معاف نہیں کر سکتا دھوکے باز لوگوں سے میں ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا، رشتہ کیسے جوڑ سکتا ہوں۔'' پتھریلے لہجے میں بولتے وہ مڑے تھے۔ عالیان سامنے ہی کھڑا تھا، بالکل جامد۔

''چلو عالیان۔ تمہارا نکاح اب نہیں ہوگا۔'' سنجیدگی سے بولتے انہوں نے مجمع کے پیچھے کھڑی خواتین میں فائقہ بیگم کو دیکھ کر گویا اشارہ کیا تھا جو گھبرائی ہوئی سی کھڑی تھیں۔

عنایت اللہ نے ان کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی ساکت کھڑے عالیان کا بازو پکڑ لیا۔

''میری بیٹی بے قصور ہے۔ اس کے ساتھ ایسا ظلم نہ کرو۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ۔ خدا کے لیے یہ رشتہ نہ توڑو۔'' کیسی بے چارگی تھی اس باپ کے لہجے میں۔

''تم نے سنا نہیں عالیان چلو یہاں سے۔'' شاہنواز صاحب سختی سے بولے۔ عنایت اللہ پر سے نگاہ ہٹا کر اس نے باپ کو دیکھا۔

''بابا۔'' اس کے لب ہلے اور کیسی التجا تھی اس لفظ میں اور آنکھوں میں کیسی اذیت مگر وہ نہ کچھ سن رہے تھے نہ ہی دیکھنے کے روادار تھے۔

''کان کھول کر سن لو عالیان۔ اگر آج تم نے میرا فیصلہ نہ مان کر اس شخص کی بیٹی کو اپنایا تو ہم سے تمہارا ہر رشتہ

ختم ہو جائے گا۔ مرتے دم تک شاہنواز ولا کی دہلیز پار نہیں کر سکوں گی۔'' وہ سفاکی سے بولے اور عالیان کے اندر جیسے چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔ قسمت نے اپنا آخری وار کر دیا تھا۔ اٹ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نے عنایت اللہ کے سامنے جوڑ دیے اور آنکھیں جھکا لیں۔

☆☆☆

وہ سب واپس آ گئے تھے۔ شاہنواز ولا جو شادی کے ہنگاموں سے گونج رہا تھا اب وہاں سناٹوں کا راج تھا۔ سب نے گویا لب سی لیے تھے اور جانے کتنے دن یونہی گزر جاتے اگر عالیان کی وہ حالت نہ ہو جاتی۔ تیسرے دن حسان اس سے ملنے آیا تو وہ اسے اپنے کمرے میں بے ہوشی کی حالت میں ملا تھا۔ سب کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ شاہنواز صاحب بھی دفتر سے دوڑے دوڑے آئے تھے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ نہ کھانے پینے کی وجہ سے اس کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا اور اگر وہ ہسپتال نہ پہنچ پاتا تو یقین ممکن تھا کہ اس کی زندگی ختم ہو چکی ہوتی۔ فائقہ بیگم نے جب سے سنا تھا، رو رو کر ان کی بری حالت تھی اور

شاہنواز صاحب کو دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی تھیں۔

"آپ ذمہ دار ہیں اس سب کے۔ کاروبار میں دوستی اور دوستی میں رشتہ داری آپ نے جوڑی تھی اور اس سب میں بربادی صرف میرے بیٹے کی ہوئی ہے۔" وہ سپاٹ چہرہ لیے، خاموش رہے تھے۔

"مجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ تو ہمیشہ اپنی خواہشوں کو ماں باپ کی خوشی پر قربان کرتا آیا ہے پھر اس بار اتنا شدید ردعمل کیوں؟" حنان اس کے بستر کے پاس کھڑا سوال کر رہا تھا۔

"اس بار میں نے اپنا آپ قربان کر دیا ہے۔" دو دن بعد اسے ہوش آیا تھا اور اس کے لہجے میں اتنی مایوسی اور چہرے پہ ایسی مردنی پھیلی تھی کہ حنان کو عجیب سی اذیت محسوس ہوئی۔

دو ہفتوں تک وہ کچھ صحت یاب ہوا تھا۔ وہ بھی فائقہ بیگم کی حالت دیکھ کر مجبوراً دوائیں اور خوراک لینے کی وجہ سے ورنہ وہ تو جیسے زندگی سے ہی مایوس ہو گیا تھا۔ اور ایسے وقت میں حنان نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ صحیح معنوں میں دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کا داخلہ باہر کی یونیورسٹی میں ہو گیا تھا مگر وہ نہیں گیا تھا۔ ہر وقت عالیان کے ساتھ سائے کی طرح رہتا اسی کے اکسانے پر عالیان ہمت کر کے معافی مانگنے کے لیے عنایہ اللہ کی حویلی تک آ گیا تھا مگر وہاں تالا لگا تھا۔ حنان نے ایک لڑکے کو روک کر ان کے متعلق پوچھا۔

"عنایت اللہ تو وفات پا گئے۔"

"اور باقی گھر والے۔" وہ گاؤں چلے گئے ہوں گے جی۔ میں خود آج واپس آیا ہوں گھر اور جی اس بات کو تو دو مہینے ہو گئے۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔" عالیان کے منہ سے پھسلا۔ حنان نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈالا۔

"ایسے مت سوچو۔"

نہ سوچنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔" سنجیدگی سے بولتا وہ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

کتنے کتنے گھنٹے وہ خاموش بیٹھا رہتا تھا اور صرف حنان بولتا رہتا۔ وہ دونوں ایم بی اے میں ایڈمیشن لے چکے تھے اور اکثر وہ جا کر مومنی کے ڈپارٹمنٹ میں بیٹھ جاتا۔

"تم نے کہا تھا نا وہ پھر ڈپارٹمنٹ میں نظر نہیں آئے گی۔ سچ کہا تھا تم نے۔ اب وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔" وہ ایسی گہری اداسی سے بولا کہ حنان کو اپنے لفظوں پر افسوس ہوا۔

وقت کسی کے لیے نہیں رکتا۔ اس کے لیے بھی نہیں رکا تھا، پر لگا کر اڑ گیا تھا اور وقت ساتھ عالیان سنبھل تو گیا تھا پر نہ تو اس کا پچھتاوا کم ہوا تھا نہ ہی وہ اپنی محبت کو بھلا پایا تھا۔

☆☆☆

وہ تن فن کرتی اس کے دفتر آئی تھی۔ دونوں نے حیران ہو کر اس کے یوں دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر آنے کو دیکھا۔

"مس یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے دفتر میں آنے کا۔" ارحم نے تحمل سے پوچھا۔ پیچھے ریسپشنسٹ بھی منمناتی ہوئی آئی تھی۔

"سر! میں انہیں منع کر رہی تھی مگر انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔"

"مس انیلا! آپ جائیے۔" ارحم نے انیلا سے کہا تو وہ سر ہلاتی چلی گئی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"بیٹھو۔" ارحم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی۔ تم پر واضح کرنے آئی ہوں کہ پہلے میں حقیقت سے لاعلم تھی ورنہ تمہاری باتوں میں نہ آتی۔" وہ سخت تپی ہوئی تھی۔

"میں ماضی کا ذکر نہیں کرنا چاہتا، میں یہ جانتا ہوں کہ عالیان بھائی آج بھی مومی گل سے محبت کرتے ہیں اور اسی لیے انہوں نے شادی نہیں کی۔" ارحم نے تحمل سے کہا۔

"اچھا تو دس سال پہلے کہاں تھی ان کی یہ محبت۔ اس وقت کیوں نہ نبھا سکے۔" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"وہ مجبور تھے۔ مگر آج بھی اس فیصلے پر

پھنسا رہے ہیں، تم ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ ہم اب بھی سب ٹھیک کر سکتے ہیں پھر سے....." پریشے نے درشتی سے اس کی بات کاٹی۔

"کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے، سب حساب دے سکتے ہو۔ ہمارے گھرانے کی بربادی کا..... وہ وقت واپس لا سکتے ہو؟ نہیں مسٹر ارحم شاہنواز! وقت اگر ریت کی مانند ہاتھ سے پھسل جائے تو اس کی واپسی ممکن نہیں رہتی۔ نہ ہی ان دکھوں اور تکلیفوں کا ازالہ ہو سکتا ہے جو اس وقت لوگوں نے جھیلی ہوتی ہیں۔"

"میں نے کہا نا ماضی کی بات نہیں کروں گا۔ ماضی اگر بیچ میں آیا تو مت بھولو، تم لوگوں کے بھی کچھ حساب ہماری طرف نکلتے ہیں۔" اس بار ارحم کا لہجہ تلخی لیے ہوئے تھے۔ پریشے کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔

"میں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ ہم سے اب رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔" تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی مگر ارحم کی آواز نے اس کے قدم روک لیے تھے۔

"گھر بیٹھ کر آرام سے کچھ سوالوں کے جواب ڈھونڈنا۔ یہ وقت کی کیسی چال ہے کہ اس نے ہمیں آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے؟ تمہاری خالہ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی اور کہیں تم اپنی جذباتیت میں ان کا نقصان تو نہیں کر رہیں؟" ارحم کے مطمئن لہجے پر وہ غصے سے مڑی۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے اور آئندہ مجھے فون مت کرنا۔" اسے وارن کرتی وہ تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ کمرے میں آ کر سونے کی تیاری کر رہا تھا جب اس کا موبائل بج اٹھا۔ بستر پر نیم دراز ہوتے اس نے مسکرا کر کال ریسیو کی۔

"السلام علیکم۔ کیسے ہو بھانجے۔" ان کی زندہ دل آواز سنائی دی تھی۔

"وعلیکم السلام ڈیئر ماموں۔ ہمیشہ کی طرح خوش باش ہوں۔" جواباً ارحم چہک کر بولا۔

"کیا چل رہا ہے؟" بابا کے مطابق جھک مار رہا ہوں اور میرے خیال سے کام میں بے حد مصروف ہوں۔" دوسری جانب سے ان کی زوردار ہنسی گونجی۔

"بھائی صاحب کو بڑی شکایتیں ہیں تم سے۔"

"خیر یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ شوخی سے بولا۔

"ماموں آپ کو وہ لوگ یاد ہیں جن کی بیٹی سے عالیان بھائی کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ چونکے۔

"یونہی، عالیان بھائی نے ابھی تک شادی نہیں کی نا تو خیال آیا کہ اگر وہ لڑکی پھر سے مل جائے تو کیا ایسا کچھ ممکن ہے۔ بابا مان جائیں گے۔" ارحم نے سرسری سا انداز اپنایا۔

"ایسا سوچنا بھی مت بھتنا میں بھائی صاحب کو جانتا ہوں وہ کبھی اس دھوکے بازی کو معاف نہیں کریں گے اور اس بات کو اتنے سال گزر چکے ہیں اب تو اس بچی کی بھی شادی ہو چکی ہو گی یہ تو عالیان ہی شادی کی حامی نہیں بھرتا۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا عالیان کو دستک دے کر اندر آتے دیکھ کر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"ماموں..... میں پھر بات کرتا ہوں آپ سے۔" الوداعی کلمات کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"بیٹھیں بھائی۔" اس نے بستر پر اس کے لیے جگہ بنائی۔ پورے دو دن کے بعد عالیان یوں اس سے بات کرنے آیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا بات ہو سکتی ہے جو وہ رات کے اس پہر اس کے کمرے میں آیا تھا۔

"میں موی سے ملنا چاہتا ہوں تم بات کرو پریشے سے اس بارے میں۔" وہ سنجیدگی سے بولا نظریں قالین کے نقش و نگار پر جمی تھیں۔

"آں جی۔" ارحم گڑبڑایا۔ اس کا ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔ "میری بات ہوئی تھی پریشے سے، آپ کچھ دن رک جائیں۔ پھر ہم آپ دونوں کی ملاقات کرواتے ہیں۔ اصل میں وہ بہت مصروف ہوتی ہیں۔ بوتیک، فیکٹری ان سب کے جھنجھٹوں سے وقت ہی کب ملتا ہے۔"

''ہوں..... میں انتظار کروں گا۔'' اسے شب بخیر کہتا وہ چلا گیا۔ اور ارحم سوچ رہا تھا کہ خود کو کس مشکل میں ڈال لیا تھا اس نے ایک طرف پریشے بات کرنے کو تیار نہیں تھی تو دوسری جانب وہ عالیان کے پرانے زخم، انجانے میں ہی سہی پھر سے ادھیڑ چکا تھا اور اب ایک آس کی ڈور جو اس نے تھام لی تھی اس کا انجام کیا ہونے والا تھا۔ یہ سوچ ارحم کو بے چین کیے جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ سامنے صوفے پر بیٹھا نظر آ گیا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے، اکڑ کر بیٹھا وہ اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ موی پر نظر پڑی تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی بہتر ہوتا آپ دفتر آ جاتے۔ بہر حال تشریف رکھیے۔'' اس کا گھر آنا موی کو سخت ناگوار گزرا تھا مگر اس نے ظاہر نہیں کیا اسے اپنے تاثرات چھپانے اچھے سے آتے تھے۔ وہ پھر سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گیا۔

''کچھ باتیں دفتر کے ماحول میں نہیں کی جا سکتیں۔ اس لیے آنا پڑا۔''

''کاروبار سے منسلک لوگوں کے گھر آنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ ان کا دفتر تک محدود رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' موی سنجیدگی سے جتا کر بولی۔

''ہوں خاصی محتاط ہیں آپ مس موی گل.....! اچھی بات ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں..... ہاں..... دودھ کا جلا، چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔'' طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی تھی۔ موی نے الجھ کر اسے دیکھا آخر وہ کہنا کیا چاہ رہا تھا۔

''کام کی بات کیجیے۔''

''بات تو وہی ہے مس گل۔ آپ ہمارے پیسوں کی ادائیگی کر دیجیے۔ ہمارا کھاتا صاف ہو جائے گا۔'' وہ مطلب کی بات پر آیا، انداز ہلکا پھلکا سا تھا۔

''یہ بات میں پہلے بھی آپ کو بتا چکی ہوں عاصم رضا صاحب کے پیسوں کی ادائیگی آپ کے اور آفتاب صاحب کے مشترکہ کاروبار کو ہو سکتی ہے، چونکہ مال ہم نے اسی کمپنی سے لیا تھا اور آپ اگر اس غلط فہمی میں ہیں کہ وہ رقم آپ کی کمپنی کو ملے گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ آفتاب صاحب کی موت کے بعد آپ نے اس حصے پر قبضہ تو کر لیا، ساری قانونی کارروائی بھی کر لی اور اب آپ چاہتے ہیں کہ اس دھوکا دہی میں میں آپ کا ساتھ دوں تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ آفتاب صاحب کی بیوہ اور ان کے بچوں کا حق میں آپ کو ہضم نہیں کرنے دوں گی۔ بہتر اب آپ کو مسز آفتاب کی طرف سے کیے جانے والے کیس کا لیگل نوٹس مل گیا ہوگا تو بہتر ہوگا یہاں وقت ضائع کرنے کے بجائے آپ کوئی اچھا وکیل تلاش کریں۔'' سنجیدگی سے مشورہ دیتی وہ مطمئن انداز میں بولی۔

''یہ عدالتوں کے چکر ہم مردوں کے لیے بنے ہیں۔ ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ آپ عورتیں اس سے بچی رہیں پر آپ خواتین باز نہیں آتیں۔'' عاصم رضا نے کھڑے ہو کر موبائل اور دو قدم آگے بڑھ کر سنجیدہ سی کھڑی موی گل کے قریب آیا۔

''آپ بہت محنتی ہیں مس گل۔ کتنے کم عرصے میں آپ نے اپنی محنت سے اس کاروبار کو کھڑا کیا۔ آج مارکیٹ میں آپ کا نام ہے، ساکھ ہے، مگر کیا ہے کہ یہ سب یک دم ملتا تو نہیں ہے پر تباہ چٹکیوں میں ہو جاتا ہے۔'' بظاہر وہ مسکرایا تھا مگر انداز سراسر دھمکانے والا تھا۔

''اور پھر ماضی میں بڑی مثالیں ملتی ہیں۔ بڑا نام ہوا کرتا تھا عنایت ٹریڈرز کا۔'' موی کا چہرہ لمحے بھر کے لیے سفید پڑا تھا، عاصم رضا کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔ ''عنایت اللہ کیسے ایماندار مشہور تھے۔ ایک چھوٹا سا فراڈ کیسی تباہی لایا تھا ان کے لیے۔ بیٹی کی شادی رک گئی، کاروبار تباہ ہو گیا۔ خود قبر میں جا بیٹھے..... کچھ خیال کیجیے مس گل کل بزرگوں کو فراڈ لے بیٹھا تھا کہیں آج آپ کو آپ کی ایمانداری اور اصول پسندی نہ لے ڈوبے۔ یاد رکھیے گا کہ مقابلے پہ عاصم رضا کھڑا ہے اور ہم..... ہم تو دشمن کی سانس تک گن لیتے ہیں۔'' آخر میں سرد انداز میں کہتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلا تھا۔

"موی گل ان دھمکیوں میں آنے والی نہیں ہے۔" اپنی نم پیشانی کو ٹشو سے پونچھتی وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی پورے آسمان کو بادلوں نے گھیر لیا تھا۔ بجلی کے کڑکتے ہی موسلا دار بارش شروع ہو گئی تھی۔

"بوا..... کہاں ہو بوا۔" انہیں پکارتی وہ باورچی خانے میں آئی جہاں وہ پکوڑے تلنے میں مصروف تھیں۔

"بوا! ماما کی گھڑی نہیں مل رہی، خالہ کی ساری الماری دیکھ آئی ہوں۔ وہ کہہ رہی تھیں ان کی جیولری میں ہی ہوگی مگر مجھے تو کہیں نہیں ملی۔"

کل اس کے کالج میں فنکشن تھا اور سب لڑکیاں اپنی ماؤں کی کوئی نہ کوئی چیز پہن رہی تھیں۔ اسی مقصد کے لیے وہ اپنی ماں کی گھڑی پہن کر جانا چاہ رہی تھی۔

"موی بٹیا نے کچھ پرانا سامان اکٹھا کر کے رکھا تو۔ اسی میں دیکھ لو۔" تلے ہوئے پکوڑے پلیٹ میں نکالتے کسی بوا نے کہا۔

"کہاں پر؟" پریشے نے پوچھا۔

"بٹیا کے کمرے میں ہی ایک الماری ہے۔ نانی تالا لگا رکھا تھا بٹیا نے۔ اسے کھول کر دیکھ لو۔"

سر ہلاتی وہ جلدی سے موی کے کمرے تک آئی۔ ان کی سائڈ ٹیبل کی دراز سے چابی نکال کر پھر سے الماری کے پٹ کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک حصہ ایک تھا جسے اس نے چابی کی مدد سے کھولا اندر دو خانے تھے جن میں سے ایک میں نانا کی جیکٹ، ٹوپی، جائے نماز پڑی تھی ساتھ میں نانی کی چادر اور اسی طرح کی چند اور چیزیں۔ دوسرے خانے میں کچھ کتابیں تھیں، جیولری باکس تھا جو اس کی ماں کا تھا۔ جیولری باکس نکالتے ہوئے اس کے ساتھ پڑی کچھ کتابیں کارپٹ پر گر پڑیں۔ وہ وہیں چوکڑی مار کر بیٹھی اور جلدی سے جیولری باکس کھولا۔ گھڑی اس میں پڑی تھی جس کو اس نے فوراً برآمد کر لیا تھا۔ بیس منٹ تک وہ محبت بھری نگاہوں سے اپنی ماں کی ہر چیز کو دیکھتی رہی پھر باکس بند کر کے اٹھ گئی۔ جلدی سے نیچے گری کتابیں سمیٹیں۔ اسی اثناء میں آخر میں پڑی ڈائری اٹھاتے ہوئے کچھ اس میں سے پھسل کر نیچے گرا تھا۔ اس نے جھک کر اٹھایا وہ کوئی تصویر تھی۔ تصویر کو سیدھا کرتے ہی چند پل لگے تھے اسے یہ جاننے میں کہ وہ تصویر کس کی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈائری کھولی مگر اس میں ٹوگرافس کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور تصویر کی یہاں موجودگی خود بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ الماری بند کرتی وہ لاؤنج میں آ گئی۔ جہاں بوا پکوڑوں اور چائے کے ساتھ پہلے سے موجود تھیں۔

"بٹیا گھر نہیں آئیں ابھی تک۔ موسم بھی خراب ہے۔" موسم کے تیور دیکھتی وہ تشویش سے بولیں۔

پریشے کے چہرے پر پرسوچ لکیریں پھیلی تھیں وہ ٹانگیں چڑھا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بوا..... انسان پرانی چیزوں کو سنبھال کر کیوں رکھتا ہے؟"

"اے لو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بٹیا! پرانی چیزوں سے انسان کو انسیت ہوتی ہے۔ پیار اور لگاؤ ہوتا ہے۔ اسی لیے تو سنبھال کر رکھتا ہے۔" پکوڑوں کی پلیٹ اس کی سامنے رکھتے بوا نے جیسے اسے سمجھایا تھا۔

"پھر انسان اپنے آپ سے جھوٹ کیوں بولتا ہے۔ دھوکا کیوں دیتا ہے خود کو۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ بوا نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"کیا کہہ رہی ہو بٹیا۔"

"کچھ نہیں بوا۔" طویل سانس لیتی وہ پکوڑا اٹھا کر کھانے لگی مگر ذہن بہت سے تانے بانے بن رہا تھا۔

☆☆☆

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ پہلے بات تک کرنے کو تیار نہیں تھیں اور اب جب میں کلائنٹ کے ساتھ بیٹھا ہوں تو تھوڑا سا انتظار نہیں کر سکتیں۔" جھنجلاہٹ زدہ انداز میں بولتا ارحم اس کی سامنے والی

کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"یہ جو تمہارے عجیب و غریب سے کلائنٹس ہیں نا ان کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے انہیں فارغ کرو۔ دس منٹ سے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اب مزید نہیں کروں گی۔" وہ اکڑ کر بولی۔ جس پر وہ اسے گھورتا ہوا اٹھ گیا۔ کلائنٹس کو فارغ کر کے اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ ایسی کیا افتاد آن پڑی کہ مجھ سے ملنا ضروری ہو گیا۔ تم تو بڑے تنتنے سے کہہ کر گئی تھیں کہ اب رابطہ کرنے کی کوشش بھی نہ کروں۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا در حقیقت اسے پریشے کے فون کر کے بلانے پر حیرانی جتنا بھی اطمینان نصیب ہوا ہو وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اب تم اس طرح ملنے دو گے تو ٹیم ورک نہیں ہو سکتا۔" پریشے نے تیکھے تیوروں سے اسے گھورا۔

"کون سا ٹیم ورک؟" ارحم حیران ہوا۔

"وہی جو ہم مل کر کریں گے۔ دیکھو تم نے ٹھیک کہا تھا ہم پچھلی باتیں نہیں کریں گے۔ پر یہ میں نے مان لیا ہے کہ عالیان بھائی ہی خالہ کے لیے ٹھیک ہیں۔ شاید یہی تقدیر کا فیصلہ ہے کہ ہم یوں اتنے برس گزرنے کے بعد بھی آمنے سامنے آ گئے۔ یہ بات کل تک میں نہیں سمجھ پا رہی تھی مگر خالہ کے پرانے سامان سے مجھے عالیان بھائی کی تصویر ملی تو لگا جیسے یہی سچ ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ارحم کی آنکھیں چمکیں۔

"واقعی میں.....!"

"ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ فوراً مان جائیں گی۔ وقت لگے گا انہیں قائل کرنے میں۔"

"ٹھیک ہے مگر یاد رکھنا تم کسی حال میں پیچھے نہیں ہٹو گی۔ میں نہیں چاہتا عالیان بھائی کو امید دلا کر میں پھر سے انہیں کوئی نیا دھچکا پہنچاؤں۔" ارحم نے اس پر واضح کرنا چاہا کہ یہ معاملہ اس کے لیے کتنا اہم تھا۔

"تمہارے گھر والے تو مان جائیں گے نا۔" پریشے کو خیال آیا۔

"اس بار انہیں ماننا ہوگا۔"

"اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس بار عالیان بھائی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ پوری تسلی چاہتی تھی۔

"اس بات کی ضمانت وہ دس سال ہیں جو بھائی نے گزارے اور وہ اذیت ہے جو انہوں نے جھیلی۔" جواب ارحم کے پاس بھی کم نہ تھے۔

"اچھا..... آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ میری کلاس میں، میں پہنچ کر لوں تو مجھے کانچ ڈراپ کر دینا۔" گھڑی پر نگاہ ڈالتے وہ ایسے بولی جیسے وہ اس کا ڈرائیور ہو۔ ساتھ میں کھانا بھی شروع کر دیا۔

"ہمارے انگیریمنٹ میں کیا تمہاری پک اینڈ ڈراپ بھی شامل ہے۔" ارحم جل کر بولا۔

"یہی سمجھ لو۔" کولڈ ڈرنک کا سپ لیتی وہ مزے سے بولی۔

"بندہ مر دنا ہی کھانے کا پوچھ لیتا ہے۔" ارحم نے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔ اب وہ کرسی سے ٹیک لگائے اسے جلدی جلدی کھاتے دیکھ رہا تھا مگر سامنے بھی پریشے فرہاد تھی جو اس کی بات ان سنی کیے مزے سے کھائے جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ موبائل کان سے لگائے کرن سے کل ہونے والا ٹیسٹ ڈسکس کر رہی تھی۔ بات مکمل کر کے جیسے ہی اس نے فون رکھا ارحم کا فون آ گیا۔

"کچھ سوچا تم نے؟" اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"نہیں تمہارے پاس کوئی پلان ہے۔" کتاب بند کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ان دونوں کی ملاقات کرواتے ہیں۔ عالیان بھائی تو آ جائیں گے تم کسی بہانے سے اپنی خالہ کو لے آنا۔"

"پلان اچھا ہے۔ پر خالہ عالیان بھائی کو دیکھتے ہی پہلے کی طرح اٹھ کر چلی گئیں تب پلان تو فلاپ ہو گیا نا۔" پریشے پر سوچ انداز میں بولی۔

"بس تم فوراً نقطہ اعتراض نکال لو۔ ظاہر ہے فوراً

ہے تو وہ مان نہیں جائیں گی۔ کچھ کوشش ہمیں کرنی ہوگی۔ ان کو اس صورت حال میں روکنا بھی ہمارا کام ہوگا۔" ارحم دوسری طرف سے جھنجلا کر بولا۔

"وہ میری خالہ ہیں میں انہیں زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں کوئی دو سال کی بچی نہیں ہیں جو میں کہوں گی وہی کریں گی۔" پریشے بھی اس کے انداز پر تلملا اٹھی۔

"ہاں تو تمہیں زیادہ اچھی طرح پتا ہونا چاہیے کہ انہیں ہینڈل کیسے کرنا ہے۔ آفٹر آل وہ تمہاری خالہ ہیں۔" ارحم نے جتاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو..... یہ تو میری خواہش ہے کہ وہ عالیان بھائی سے شادی کرلیں خود تو وہ ان کا نام بھی نہیں سننا چاہتیں اور انہیں ہینڈل کرنا اتنا آسان نہیں ہے کہ میں اپنی مرضی ان پر مسلط کرتی رہوں۔ یوں بھی عالیان بھائی کو انہیں منانا چاہیے۔"

"ملاقات تو کروادو۔ کرلیں گے وہ بات بھی۔" ارحم کا اپنا سر پیٹ لینے کو دل چاہا، اتنی دیر سے وہ یہی تو سمجھانے کی کوشش کررہا تھا اور وہ جواباً نکتہ چینی کررہی تھی۔

"اچھا میں دن اور جگہ طے کرکے بتادوں گی۔ ایک بار عالیان بھائی خالہ کو منالیں نا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں اور تم فکر نہ کرو میں اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ آخر اس میں میری بھی تو خوشی ہے اور پھر....."

یک دم کسی نے پیچھے سے اس کے ہاتھ سے موبائل کھینچا تھا۔ وہ جھٹکے سے صوفے پر سے اچھل کر کھڑی ہوئی۔ موی اس کا موبائل پکڑے اس کے سامنے آئی تھی۔ پریشے کا تو گویا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ موی نے کال کاٹ کر سنجیدگی سے اسے دیکھا جو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑستی نظریں چرا رہی تھی، چہرے کا رنگ فق ہوگیا تھا۔

"تم اتنی بڑی کب سے ہوگئیں کہ اپنے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی فیصلے کرنے لگی ہو۔" جواباً وہ خاموشی سے لب کاٹتی رہی۔

"میں سمجھ رہی تھی بوا سے سب جاننے کے بعد تم ارحم سے رابطہ نہیں کروگی۔ مگر تم تو رشتہ داریاں بڑھانے کا سوچے بیٹھی ہو۔"

"خالہ میں کچھ غلط نہیں سوچ رہی۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں عالیان بھائی اتنے قصوروار نہیں کہ ان کو معاف نہ کیا جاسکے۔ آپ ایک بار ٹھنڈے دماغ سے سوچیں تو سہی۔" ہمت کرکے وہ بول پڑی۔ آخر کو بات تو کھل ہی چکی تھی۔

"بس آج کے بعد میں ان لوگوں کا ذکر نہیں سننا چاہتی بہتر ہوگا تم یہ بات سمجھ لو۔" موی کا انداز حتمی تھا۔ پر پریشے اب چپ رہنے والی نہیں تھی۔

"آپ کیوں نہیں سمجھ لیتیں کہ وہ آج بھی آپ کے انتظار میں ہیں انہوں نے آج تک شادی نہیں کی وہ ماضی کے پچھتاوے کو نہیں بھول پائے آپ....."

موی نے درشتی سے اس کی بات کاٹی۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ نہ ہی تمہیں اس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔" وہ تیزی سے مڑی تھی۔

"آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی خالہ اور یہ میرا مسئلہ ہے۔"

اس کی بات پر وہ ٹھٹک کر رکی۔ پھر اس کی جانب گھومی۔ کسی بوا جائے کے کپ ٹرے میں رکھے چند منٹ پہلے ہی لاؤنج میں آئی تھیں اور اب ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔

"تمہیں لگتا ہے میں نے اس شخص کی وجہ سے شادی نہیں کی۔" عجیب بھیگا سا لہجہ تھا۔

"جی اور اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ ان کی تصویر آج بھی آپ کے سامان میں پڑی ہے۔ آپ اپنے دل پر ظلم کیوں کررہی ہیں خالہ۔" پریشے نے اپنا پورا زور لگادینا چاہا تھا۔

موی نے ایک نگاہ خاموش کھڑی بوا پر ڈالی پھر اس کو دیکھ کر تلخی سے مسکرائی۔

"اس بات کا جواب میں تمہیں بہت اچھے سے دوں گی۔" ٹرے سے چائے کا کپ اٹھاتی وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ پریشے شرمندہ سی ہوگئی تھی اسے احساس تھا۔ موی اس سے بے حد ناراض ہوگئی ہے۔

☆☆☆

اگلے چند دن اسی خاموشی سے گزر گئے تھے۔ دونوں کے درمیان کھنچی رسمی سی گفتگو ہوتی۔ وہ کالج کے متعلق پوچھ لیتی اور انداز اتنا سنجیدگی لیے ہوتا کہ پریشے کچھ کہہ ہی نہ پاتی۔

اگرچہ وہ اپنی بات پر قائم تھی مگر موی کو دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ اس سے معذرت کر کے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرے۔ پر وہ موقع دیتی تب نا۔

پھر ایک دن وہ شام ڈھلے ہی گھر آ گئی تھی۔ اور اس کے انداز میں بھی کچھ جھجک سی تھی کہ پریشے نے سوچ لیا کہ آج اس سے ضرور بات کرے گی۔ آج ارحم سے بھی اس کی لمبی بحث ہوئی تھی اور وہ بضد تھا کہ وہ موی کو منائے تاکہ سلسلے کو آگے بڑھایا جا سکے۔ چنانچہ ذہن میں الفاظ ترتیب دیتے وہ بات کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ شمی بوا چائے بنا لائیں اور اب وہ تینوں لاؤنج کے صوفوں پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

''میں آپ دونوں کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' ادھر ادھر کی باتیں کرتے اچانک موی نے موضوع بدلا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' بوا نے پوچھا جبکہ پریشے کا بسکٹ کی پلیٹ کی جانب بڑھتا ہاتھ رک گیا۔

''میں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس نے پریشے کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر خوشگوار تاثرات پھیلے تھے۔ وہ شمی بوا کی جانب مڑی جو بے حد خوش تھیں۔

''بیٹا ہم تو کب سے یہی چاہتے ہیں۔'' موی زیر لب مسکرائی۔

''اسی لیے تو جلد نکاح کا فیصلہ کیا ہے بوا۔''

''نکاح؟ بھلا کس سے؟'' پریشے کی مسکراہٹ سکڑی۔

''میں ریاض احمد سے نکاح کر رہی ہوں بوا۔'' پوری کی پوری چھت گویا پریشے کے اوپر آ گری تھی۔ شمی بوا بھی ہکا بکا سی موی کی صورت دیکھ رہی تھیں جو بے حد اطمینان سے بتا رہی تھی۔

''کل شام عصر کے بعد ہمارا نکاح ہوگا۔ ان کے ساتھ کچھ مہمان آئیں گے جن کے کھانے پینے کا انتظام میں نے ہوٹل سے کر لیا ہے۔ آپ بس سب دیکھ لیجیے گا۔'' اس نے پریشے پر نگاہ ڈالی جس کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات تھے اور آنکھوں میں بے یقینی اتر آئی تھی۔ ''ابھی صرف نکاح ہوگا۔ رخصتی پریشے کی شادی کے بعد ہوگی۔'' دونوں کو خاموش دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر پریشے سے مخاطب ہوئی۔

''تم نے پوچھا تھا نا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔'' پریشے خاموش رہی زبان ہلانے تک کی سکت نہ رہی تھی۔ ''اس وقت میرے پاس شادی کا آپشن نہیں تھا اور پھر سب سے بڑی وجہ تم تھیں اور کوئی غیر شخص اس کی وجہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے کبھی شادی کا فیصلہ اہم نہیں لگا کیونکہ تم مجھے عزیز تھیں اتنی کہ اگر میرے اس فیصلے کا برا اثر تم پر پڑتا تو میں برداشت نہ کر پاتی۔'' سنجیدگی سے بولتی وہ بہت سے آنسو حلق سے نیچے اتار گئی کہ اسے یہ فن آتا تھا۔ اپنے درد کو چھپا لینا بہت عرصہ ہوا اس نے سیکھ لیا تھا۔ تیز قدم اٹھاتی وہ چلی گئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں جما ہوتے آنسو یک دم پلکوں کی باڑھ پھلانگتے بہہ نکلے تھے اور وہ بے اختیار سی ہو کر بوا کی جانب بڑھی۔

''بوا..... بوا خالہ کو روک لیں۔ یہ کیا کرنے جا رہی ہیں وہ۔ مجھ سے ناراض ہیں تو خود کو کیوں سزا دے رہی ہیں۔ ریاض انکل وہ..... وہ تو کہیں سے بھی خالہ کا جوڑ نہیں ہیں۔ کتنے بڑے ہیں وہ ان سے۔ پلیز، بوا پلیز آپ بات کریں نا، خالہ سے، آپ کی تو بہت سنتی ہیں وہ۔'' شمی بوا نے طویل سانس اندر کھینچتے ہوئے پریشے سے کہا۔

''ہم سے موی بٹیا نے مشورہ ہی کب کیا ہے۔ ہمیں بھی ابھی خبر ہوئی ہے بیٹا۔ جب ہم آپ کے نانا کے گھر گئے تو بے اولاد تھے پھر زہرہ بی بی نے اپنی دونوں بچیاں ہماری گود میں ڈالیں تو لگا گود بھر گئی ہے ہماری۔''

آنکھیں پونچھتی وہ اٹھ گئیں۔
اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے اس نے صوفے پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا۔ جلدی سے ارحم کو کال ملا کر اسے یہ خبر سنائی جس پر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔
"نہیں نہیں۔ وہ مذاق کر رہی ہوں گی۔ ایسے کیسے ہوسکتا ہے۔" شاک سے نکلتے ہی وہ بولا۔
"یہ مذاق نہیں ہے۔ نہ خالہ ایسے مذاق کرتی ہیں۔" وہ درشتی سے بولی۔ پھر سانس ہموار کرتی بھیگے لہجے میں بولی۔ "کچھ کرو ارحم ورنہ کل کے بعد ہمارے پاس امید بھی باقی نہیں رہے گی۔"
اس نے فون بند کر دیا تھا اور دوسری جانب ارحم کی گویا جان پر بن آئی تھی۔ یہ کیا ہونے جا رہا تھا اور بھلا وہ کیسے روک سکتا تھا یہ نکاح ہونے سے۔

☆☆☆

رات موی کا کمرا جلد اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ مگر اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ ساری رات آنسو بہاتے یاد یا میں گزرتے گزری تھی۔ فجر کے بعد اس کی آنکھ لگی تھی۔ دوپہر کو بوا کے اٹھانے پر وہ اٹھی۔ بوا عام سے انداز میں انتظامات دیکھتی پھر رہی تھیں۔ موی دفتر گئی ہوئی تھی۔ کھانے کے وقت اس کی واپسی ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد وہ اسے تیار ہونے کی تاکید کرتی خود تیار ہونے چلی گئی۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر بے دلی سے ہی سہی اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ہلکے سبز رنگ کی کامدار فراک پہنے وہ موی کے کمرے تک آئی تھی۔ سنگار میز کے سامنے کھڑی، آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ دوپٹا ٹھیک کر رہی تھی جب کسی بوا کمرے میں آئیں۔
"ہوٹل والوں نے میزیں لگا دی ہیں۔ نکاح کے بعد وہ چائے اور دیگر لوازمات لگا دیں گے۔ چند مہمان بھی مہمان خانے میں بیٹھے ہیں۔" جواباً موی خاموشی سے چلتی ان کے قریب آئی۔ نرمی سے ان کا ہاتھ تھاما۔ بوا نے استفہامیہ نظروں سے موی گل کو دیکھا جو سفید رنگ کی کامدار میکسی میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ہلکا سا میک اپ اس نے خود ہی کر لیا تھا جس سے چہرے کے نقوش کچھ اور نکھر آئے تھے۔
"میں جانتی ہوں بوا۔ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میرے فیصلے سے خوش نہیں ہیں۔ مگر میں کیا کرتی بوا۔ آپ مجھے یہ فیصلہ لینے نہ دیتیں حالانکہ اس وقت میرے لیے یہ قدم اٹھانا لازمی ہو گیا تھا کیونکہ جو پریشے سوچ بیٹھی ہے وہ میرے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا آپ تو سب جانتی ہیں بوا۔ پھر یوں اپنی بیٹیا سے ایسے موقعے پر ناراض نہ ہوں۔ ریاض احمد عمر میں بڑے سہی پر وہ بے حد مخلص انسان ہیں۔ اسی لیے میں نے ان کو چنا۔" اس کے لہجے میں ایسی نرمی اور محبت گھلی تھی کہ بوا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
"خوش رہیے بٹیا۔" اس کا ماتھا چومتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے سے نکلی تھیں۔ دروازے پر بیزار سی پریشے کھڑی تھی۔ اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئیں۔
پریشے گہرا سانس لیتی کمرے میں گھس گئی۔ سامنے ہی موی تیار کھڑی تھی اس کا دل جل کر خاک ہو گیا۔
اتنی تیاری وہ بھی ان ریاض انکل کے لیے ہونہہ۔
"مہمان آگئے؟" وہ انٹر کام پر پوچھ رہی تھی۔
"جی بی بی..... ریاض احمد اور ان کے ساتھ کچھ لوگ آئے ہیں اور مولوی صاحب بھی ہیں۔"
دوسری طرف سے آتی آواز پر پریشے کے ارمانوں پر اوس گری۔ وہ جو کل سے کسی معجزے کی منتظر تھی۔ تو آج وہ امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔
سامنے نکاح کے لیے تیار ہوئی موی کے اطمینان کو دیکھ کر پریشے کو دل ہی دل میں اور زیادہ غصہ آرہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی ہنگامہ کر دے اور مہمانوں کو واپس بھیج دے۔ ہائے مگر کیا کیجیے کہ یہ محض دل کی خواہش تھی۔ جسے وہ منظر عام پر نہیں لا سکتی تھی۔
دروازے پر ہوئی دستک نے اسے سوچوں سے باہر نکالا تھا۔ موی کے جواب دینے پر دروازہ کھلا اور سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر جہاں موی ٹھٹک کر

کھڑی ہوئی وہیں پریشے بھی حیران ہوئی پھر بے اختیار خوشی سے آگے بڑھی۔

"دادا ابو!" باپ کے رشتے سے وہ اس کے دادا ہی تو تھے۔

"انکل آپ۔ یوں اچانک۔" موی نے نظریں چرائیں۔

"ہم نے بلایا ہے بھائی صاحب کو۔" پیچھے کھڑی شمسی بوا نے جواب دیا۔

"بہت اچھا کیا شمسی بہن نے ورنہ اتنے اہم موقعے پر تم نے تو مجھے بلانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" شکایتی لہجے میں بولتے ہوئے وہ اس کے قریب آئے۔

پریشے کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ کوئی تو تھا جو موی کی کلاس لے سکتا تھا۔

"اچھا ہوا انکل آپ آگئے ہیں، فیصلہ کچھ اتنی جلدی میں کیا کہ بتا نہیں سکی۔" موی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بہرحال مجھے یہ فیصلہ پسند نہیں آیا اور میں نے ریاض احمد کو واپس بھیج دیا ہے۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"پر کیوں، اب جبکہ نکاح ہونے والا تھا۔" موی نے پریشانی سے انہیں دیکھا۔ ساتھ کھڑی پریشے کا البتہ خوشی سے برا حال تھا۔

"نکاح آج ہی ہوگا۔ مگر اب میری مرضی سے اور مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی میرا مان رکھے گی۔" انہوں نے محبت سے موی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر وہ مڑ کر دروازے کی جانب بڑھے۔

"انکل۔" موی نے تذبذب کا شکار ہو کر پکارا۔

"اب یہ کون نئی انٹری دینے والا ہے۔" پریشے زیر لب بڑبڑائی۔ ساری خوشی ریت کی مانند بیٹھ گئی تھی۔

"آجایئے۔" سلیم انکل نے مولوی صاحب کو کمرے کے اندر بلایا ان کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔

"بسم اللہ کیجیے۔" موی خاموشی سے بستر پر بیٹھ گئی۔

"موی گل ولد عنایت اللہ آپ کو عالیان شاہنواز ولد شاہنواز سلطان کے نکاح میں دیا جاتا ہے [illegible] پچاس لاکھ سکہ رائج الوقت، آپ کو قبول ہے۔" [illegible] پہلے کی ایک شام اسے شدت سے یاد آئی۔ جب وہ ان الفاظ کی منتظر رہی تھی اور آج جب خواہش پوری ہو رہی تھی تو یہ الفاظ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح لگے تھے۔ سلیم انکل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جواب دو بیٹی۔"

وہ تو سب جانتے تھے پھر کیوں؟ اس نے سوچا مگر اس نے ان کا مان نہیں توڑا تھا۔ "جی" کہتے ہوئے اس نے سر پر پڑتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے تھے۔

پریشے کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ چہکتی ہوئی وہ کمرے سے نکلی کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی اسے ارحم مل گیا۔ ہاتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا پکڑ رکھا تھا۔

"مبارک ہو۔" اسے دیکھتے ہی بولا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو پر یہ ہوا کیسے مجھے کال کر کے ہی بتا دیتے۔ میں کچھ ڈھنگ کا تیار ہو جاتی۔" گلاب جامن اٹھا کر کھاتے ہوئے وہ بولی۔

"صبح ہی سب کچھ ہوا ہے اور یہ سارا کمال سلیم انکل کا ہے۔"

"دادا ابو تو ہیں ہی گریٹ....." خوش ہوتی وہ شمسی بوا کی تلاش میں باورچی خانے کی جانب چل پڑی۔ آخر اس معرکہ میں بوا کا بھی تو ہاتھ تھا۔

☆☆☆

"مہمان چلے گئے بوا!" کپڑے تبدیل کر کے وہ نیچے آئی۔

"باقی تو چلے گئے۔ سلیم بھائی بھی نہیں رکے۔ وہ عالیان بیٹا بیٹھے ہیں۔" شمسی بوا نے آہستگی سے کہہ کر نظریں چرائیں۔

"کیوں؟" موی نے ابرو اچکائے۔ اور ان کا جواب سنے بغیر۔ تیز قدموں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ صوفے پر بیٹھا وہ پریشے سے کوئی بات کر رہا تھا۔ چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔

"میں پوچھ سکتی ہوں۔ آپ ابھی تک یہاں کیوں تشریف فرما ہیں۔" اس کے عین سامنے

بار کر وہ بے مروتی سے بولی۔ عالیان نے اپنی جگہ کھڑا ہوا، چہرے پر مسکراہٹ ہنوز برقرار تھی۔
"چند باتیں کرنے کی اجازت ملے گی۔" شائستہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔
"آپ لوگ تو ایسی اعلا ظرفی کے قائل نہیں پھر یہ دل سے یہ امید چہ خوب" استہزائیہ انداز میں بولتی وہ گھوم کر گئی۔ جو عالیان کو چابک کی طرح لگا۔ اس کی مسکراہٹ گہری پھر خود کو سنبھالتا وہ نرمی سے بولا۔
"آپ پر یقین ہے کہ ہم سے بہتر سلوک کریں گی، ہماری والی غلطی نہیں دہرائیں گی۔"
"بات تو آپ سے ہوگی مگر اس وقت یہاں سے چلے جایئے۔ ابھی میں کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتی۔" آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتی یہ تو کوئی اور ہی موی تھی۔ اس سے قطعاً مختلف جو سرخ چہرے کے ساتھ پلکیں جھالیا کرتی تھی۔
عالیان نے سر ہلاتے ہوئے جھک کر میز پر سے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر وہ تیزی سے مڑ گئی۔ موی کے مڑتے ہی پریشے بول پڑی۔
"عالیان بھائی خالہ کو چھوڑیں وہ تو غصے میں کہہ گئی ہیں۔ آپ بیٹھیں میں اچھی سی کافی پلاتی ہوں آپ کو" وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔
وہ مسکرایا۔
"میں چلتا ہوں پھر آؤں گا۔ اور جہاں تک تمہاری خالہ کی بات ہے وہ اپنے رویے میں حق بجانب ہیں پر تم فکر نہ کرو اگلی بار دل زیادہ بڑا کر کے آؤں گا مجھے یقین ہے تمہاری خالہ کے پاس کڑوی کسیلی باتوں کا اسٹاک وافر مقدار میں موجود ہوگا۔" آخر میں شرارتی لہجے میں بولتا وہ اسے ہنسنے پر مجبور کر گیا تھا۔ اسے چھوڑ نے وہ بیرونی دروازے تک گئی۔

☆☆☆

حنان نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ خوشی سے چمکتا چہرہ، لبوں پر بھرپور مسکراہٹ جو پچھلے دس منٹوں میں ایک پل کے لیے بھی لبوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔
"دو دن میں شہر سے باہر کیا گزار آیا۔ تمہاری تو کایا ہی پلٹ گئی۔ خیر تو ہے بھائی ایسا کیا ہو گیا ہے۔"
عالیان نے جواب دینے کے بجائے آگے ہو کر میز پر اس کے سامنے اپنا نکاح نامہ رکھا۔
"پر یہ ہوا کیسے؟"
حنان نے نکاح نامے کو حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔
"شمسی بوا اور سلیم انکل کی وجہ سے۔" پھر اس نے شروع سے بتایا کہ کیسے سلیم انکل اسے ڈھونڈتے ہوئے دفتر پہنچے اور پھر عین وقت پر پہنچ کر انہوں نے نکاح ہونے سے روکا اور اس کا اور موی گل کا نکاح پڑھوایا۔
"یار ویسے بڑی فلمی کہانی ہے مجھے تو یقین نہیں آرہا۔" کرسی سے ٹیک لگا کر پیچھے ہوتا حنان دلچسپی سے بولا۔
"معجزہ ہے ورنہ اس کا نکاح اس بڑی عمر کے شخص سے ہو جاتا تو میرے دل پر کچھ اور بوجھ پڑ جاتا" عالیان کے لہجے میں شکر گزاری تھی۔
"اور انکل آنٹی؟" حنان نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔
"انہیں نہیں معلوم ابھی۔ وہ دوبئی سے واپس آئیں گے تبھی بات ہوگی۔"
"چلو ایک مرحلہ تو سر ہوا۔ ابھی تو بھابھی کو منانے کا مرحلہ بھی باقی ہے دوست!" حنان شرارت سے گویا ہوا۔ عالیان کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ پھر معدوم ہوگئی۔
"وہ بہت بدل گئی ہے یار! وہ پہلے جیسی موی نہیں رہی۔"
"وقت بھی تو بہت گزر گیا ہے کیا خبر کن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ تمہیں اعتراض ہے اس کے بدلنے پر؟" حنان نے اسے ٹٹولنا چاہا۔ نظریں اس کے سنجیدہ چہرے پر تھیں۔
"اونہوں..... وہ موی گل ہے اور مجھے ہر حال میں قبول ہے۔" اس کے لب پھر سے کھل اٹھے۔
"چل پھر اسی خوشی میں گلے مل۔" حنان اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ عالیان بھی خوشی سے اٹھ کر اس کے

گلے لگا۔ ایک وہی تو تھا جو اس کی خوشی میں ہمیشہ ساتھ رہا تھا۔

☆☆☆

ہم سے مت الجھو کہ اب ہم
سراپا سوال بھی ہیں اور حاضر جواب بھی

شاندار سے دفتر میں آرام دہ کرسی پر بیٹھی وہ فون کان سے لگائے دوسری طرف کی آواز سن رہی تھی چند سیکنڈ گزرے تو وہ بولی۔

"میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں مسز آفتاب! آپ سب سے پہلے اپنی گھبراہٹ پر قابو پائیں۔ عاصم رضا جیسے لوگ دھمکیاں دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سیکورٹی گارڈز سے بات کروں گی۔ آپ کے گھر کی سیکورٹی بھی بڑھا دیں گے۔ بچوں کے اسکول کے لیے بھی دو گارڈز تعینات کر دیں گے۔" انہیں مطمئن کر کے موی نے الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے فون رکھا۔ اسی وقت دوسری گھنٹی بجی۔

"یس۔" اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"میم آپ سے کوئی عالیان شاہنواز ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔" موی نے گہرا سانس لیا۔

"بھیج دیجیے" دو لفظی جملہ بول کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی اور اس کے "یس" کہنے پر عالیان چلتا ہوا اندر آ گیا۔ موی نے فائل پر سے نظریں نہیں اٹھائیں۔

"بیٹھیے" ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ سلام کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ موی نے دستخط کر کے فائل بند کی اور اس کی جانب دیکھا جو سامنے والی کرسی پر بیٹھا محویت سے اسے تک رہا تھا۔

"کیسی ہو موی؟" وہ دھیمے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"میرا نام موی گل ہے۔ اتنا تو یاد ہو گا آپ کو۔" سپاٹ انداز میں بولتی وہ طنز کر گئی۔

عالیان مسکرایا۔

"مجھے سب یاد ہے کچھ نہیں بھولا اپنی اور اپنے خاندان والوں کی زیادتی بھی۔"

اس کی بات کو نظر انداز کر کے موی بولی۔

"اپنے والد کین سے پوچھیے گا کہ اس پر طلاق کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے کانپے ہاتھوں کو کیونکہ سلیم انکل کے قتل کی ذمہ دار آپ کی فیملی ہے۔"

عالیان تڑپ ہی تو گیا تھا۔ میز پر دونوں ہاتھ رکھے بے اختیار آگے ہوا۔

"میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مت بھولیں۔ آپ، پہلے بھی شے چھوڑ چکے ہیں۔ میرے باپ کے بڑھے ہاتھ بھی آپ کو نہیں روک سکے تھے۔" دو چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں آج بھی اس لمحے کے پچھتاوے میں ہوں ـــ جلتا سلگتا رہا ہوں ان دس سالوں میں۔ اس کا ٹوٹا بکھرا لہجہ بھی سامنے بیٹھی لڑکی کے برف جیسے جذبات کو پگھلا نہیں سکا تھا۔

"جل تو میں رہی ہوں عالیان شاہنواز جب سے آپ کا نام جڑا ہے میرے نام کے ساتھ ایک الاؤ دہک رہا ہے میرے اندر، تپش ہے کہ کم نہیں ہوتی۔ آپ لوگوں کا حوالہ میرے لیے اذیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔" چہرہ ضبط کے باعث سرخ پڑ گیا تھا۔ خود پر قابو پانے کے لیے وہ کرسی پر سے اٹھ کر رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہم ماضی کی غلطیوں کو بھول کر، آج کی خوشیوں کو تلاش نہیں کر سکتے؟" آس سی تھی اس کے لہجے میں۔ موی کل اس کی جانب مڑی۔

"آپ کہہ سکتے ہیں کیونکہ زندگی آپ نے گزاری ہے آپ پر بیتی نہیں ہے۔" اپنے جبڑے بھینچ سے دستک دیتے ہوئے وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"میں نے دیکھا ہے مشکل حالات میں کھڑا ہونا کیسا ہوتا ہے۔ زندگی اگر منہ کے بل گرا دے اور کوئی ہاتھ تھامنے والا نہ ہو تو خود کھڑا ہونا کیسا ہوتا ہے اور جو مشکل وقت میں کھڑا ہونا سیکھ لے اسے پھر کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔" بات مکمل کرتے ہوئے وہ رخ پھیر گئی تھی۔

کرسی پر کچھ اور آگے کو کھسکا۔
پچھلے سالوں میں ایسا کیا ہوا ہے موی پلیز! جانا چاہتا ہوں وہ کون سی اذیتیں ہیں کیسے؟" اس کے تلخی لہجے میں اصرار تھا۔
موی آہستگی سے اس کی طرف مڑی۔ عالیان دیکھا اس کی آنکھوں کے زرین کنارے سرخی پکوں پر آنسو ٹھہر سے گئے تھے اور چہرے معصومیت تھی جو اسے اس کی جانب متوجہ کرگئی نگاہوں میں ان کے شکوے تھے جن کی تحریر کو عالیان پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ کچھ تو ایسا تھا اس کی کہانی جس نے اسے اس قدر متنفر کردیا تھا۔

☆☆☆

وقا کے دھندے وہ سارے بھلا گیا چپ چاپ
وہ مرے دل کی دیواریں ہلا گیا چپ چاپ
تم حیات کے تپتے ہوئے بیاباں میں
ہمیں چھوڑ کے وہ تنہا چلا گیا چپ چاپ
نہ جانے کون سا وہ بدنصیب لمحہ تھا
جو غم کی آگ میں مجھ کو جلا گیا چپ چاپ
میں جس کو چھوتی ہوں، وہ زخم دیتا ہے
وہ پھول ایسے چمن میں کھلا گیا چپ چاپ

ڈھولک کی آواز، مہندی کے گانوں کا شور اور لوگوں کی خوش گپیاں کرتی آوازیں سب کچھ جیسے تھم گیا تھا۔ بالکل اس کے وجود کی طرح جو ساکت ہوگیا تھا۔ وہ کسی بت کی مانند بیٹھی تھی۔ اسے دھچکا لگا تھا۔ وہ لب بے خاموش بیٹھی تھی اسے نہ لوگوں کی ترحم آمیز نظروں کا احساس تھا نہ ہی ان چہ مگوئیوں کا جو اس کے آس پاس کتنی دیر سے جاری تھیں۔ وہ تو بس صدمے کی کیفیت میں تھی۔ ان کے باپ کے مضبوط ہاتھوں کی پروا کیے بغیر وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ اور ایسا کب تھا کہ یوں بیچ راستے میں چھوڑ جاتا۔ اس کی سہیلیاں اسے تسلیاں دے رہی تھیں۔ پانی پلانے کی کوشش کررہی تھیں۔ مگر وہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔ شاید مستقل طور پر اسی حالت میں چلی جاتی اگر یک دم عجیب سا شور نہ اٹھتا۔

"عنایت اللہ بھائی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔" کسی خاتون کی آواز تھی۔

"اباجی۔" اس کے لب ہلے اور پھر وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر باہر بھاگی تھی۔

"عنایت اللہ کو افراتفری کے عالم میں اسپتال لایا گیا تھا۔ ان کی حالت نازک تھی۔ گھنٹے بعد ہی گھر کی خواتین اسپتال پہنچ گئی تھیں۔ زیرلب دعائیں پڑھتی وہ ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے جھل جھل آنسو گر رہے تھے جنہیں وہ ہر تھوڑی دیر بعد ہتھیلی کی پشت سے صاف کرلیتی تھی۔

"بھاء جی اتنی لاپروائی نہ کرتے تو آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔" چاچا نے افسوس سے ہنکارا بھرا۔

موی نے قریب بیٹھی زہرہ بی بی پر نگاہ ڈالی جن کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ دوسری جانب بیٹھی چاچی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"صبر کرو اب بھر جائی۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا شریکاں نے وچ رشتہ نہ کرو۔ میرا بھانجا اتنا کہتا، کتنی بار رشتہ دیا اس کا، دیکھا بھالا بچہ ہے ہماری گود میں پلا بڑھا ہے مگر بھر جائی تم لوگوں کو تو اس کی تعلیم کم لگتی تھی۔ اب نتیجہ دیکھ لو۔"

ان کے سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی شائلہ کو چاچی کا انداز زہر لگا تھا مگر وہ اماں جی کی حالت دیکھتے ہوئے خاموش رہی۔

ساری۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ صبح کے وقت کہیں عنایت اللہ کی حالت کچھ سنبھلی تھی مگر ابھی بھی وہ آئی سی یو میں ہی تھے۔ شائلہ تو رات میں پریشانی کی وجہ سے گھر چلی گئی تھی۔ البتہ وہ، زہرہ بی بی، فرہاد اور چاچا اسپتال میں ہی تھے۔

فجر کی نماز پڑھ کر وہ جیسے ہی اٹھی۔ سامنے سے آتے سلیم انکل کو دیکھ کر اس کے رکے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ چہرے پر پریشانی رقم تھی۔ وہ کسی کام سے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے مہندی کے فنکشن میں

شرکت نہیں کر سکے تھے۔ آج انہیں بارات میں شریک ہونا تھا اور فرحت اسپتال لے آئی تھی۔ انہوں نے زہرہ بی بی کو فون کر دیا۔ فرہاد آفس سے مل کر آیا تو بتایا کہ عنایت اللہ موی سے ملنا چاہتے ہیں۔

موی سلیم انکل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ مہینوں میں جیسے ابا جی کچھ اور کمزور لگ رہے تھے چہرے پر بلا کا سکوت تھا۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

"موی میری بچی۔" ان کے لب ہلے۔ آنکھوں میں نمی کی چمک نمودار ہوئی تھی۔

"جی ابا جی۔" وہ کچھ اور قریب کھسکی۔

"بس یقین رکھنا کہ تمہارے ابا جی بے ایمان اور دھوکے باز نہیں ہو سکتے۔"

"ابا جی۔" اس نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا تھا۔ عنایت اللہ کی آنکھ سے آنسو پھسل کر کن پٹی میں جذب ہو گیا تھا۔

اگلے روز عنایت اللہ کی سرجری شروع ہو گئی۔ ابھی وہ سب اسی پریشانی میں تھے کہ سلیم انکل کے پاس کسی کا فون آیا۔ وہ انتہائی پریشانی کی حالت میں باہر چلے گئے کچھ دیر بعد انہیں چاچا اور فرہاد بھائی کو ایک طرف لے جاتے دیکھ کر وہ بے پاؤں ان کے پیچھے گئی۔

"بابا کیا بات ہے؟" فرہاد بھائی کی آواز آئی۔

"فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے خاصا نقصان ہو گیا ہے اور آگ کسی خرابی کے باعث نہیں لگی۔ لگ یہی رہا ہے کہ لگائی گئی ہے۔" وہ پریشانی سے بولے۔

"سچ سچ۔ بھائی کے نصیب۔" چاچی جی افسوس سے بولے۔

"یہ یقیناً ان لوگوں کا کام ہوگا۔ انہوں نے صرف موی کا رشتہ تو ڈکرا دیا بس نہیں کی بلکہ بدلہ لینے کا یہ اچھا طریقہ اپنایا ہے۔ ورنہ ابا جی کی کسی سے کیا دشمنی۔" فرہاد نے جذباتیت سے کہا۔ سلیم انکل خاموش رہے، کہنے کے لیے جیسے کچھ باقی نہیں تھا۔

دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی موی گل کو اپنا وجود سرد ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

زہرہ بی بی نے اسپتال میں معاملہ سنبھالا تھا۔ مگر ان کی دعائیں بھی ملک المو ت کو روک نہ پائیں اور عنایت اللہ زندگی کی بازی ہار بیٹھے۔

عنایت اللہ کی حویلی میں صف ماتم بچھ گیا تھا۔ ان کی بیٹیوں کی سسکیاں اور بیوہ کی آہیں ہر آنکھ کو اشکبار کیے دے رہی تھیں۔ جنازہ گاؤں میں پڑھایا جانا تھا چونکہ ان کا خاندانی قبرستان وہیں پر تھا۔ جبکہ زہرہ بی بی یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے مرد رشتہ دار عنایت اللہ کی میت یہیں سے رخصت کروا کر گاؤں کے قبرستان کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ شہر سے بھی کچھ لوگ تھے جو جنازے میں شرکت کی غرض سے ساتھ چل دیے تھے۔

وہ ایک اداس سا دن تھا۔ آج عنایت اللہ مرحوم کو پورے چھ دن گزر چکے تھے۔ سلیم صاحب کچھ ضروری باتیں براہ راست زہرہ بی بی سے کرنا چاہتے تھے۔ عدت میں ہونے کے باعث وہ پردے کے اہتمام کے ساتھ مہمان خانے کے کونے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ان کے قریب موی بیٹھی تھی جبکہ درمیان میں چادر سی لٹکائی گئی تھی۔ جس کے دوسرے جانب سلیم صاحب اور فرہاد بیٹھے تھے۔

"معافی چاہتا ہوں بھرجائی۔ آپ کو زحمت دی مگر کچھ باتیں آپ کو بتانا بے حد ضروری تھیں۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ کہیے بھائی جی۔"

"فیکٹری میں آگ لگنے کی وجہ سے خاصے بڑے پیمانے پر نقصان ہوا ہے۔ فیکٹری کے چند ملازم بھی زخمی اور دو کی ہلاکت بھی ہوئی ہے۔ اب گو کہ کام تو رک چکا ہے مگر ملازمین اپنی تنخواہوں کا تقاضا کر رہے ہیں اور..... اور کچھ کاروباری لوگوں کے واجبات کی ادائیگی ہمیں کرنی ہوگی۔"

سلیم صاحب کو انہیں صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے خاصی دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔

زہرہ بی بی نے ضبط سے آنکھوں میں آئی نمی کو اندر اتارا۔ جبکہ ساتھ بیٹھی موی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"آپ فکر نہ کریں اماں جی۔ یہ یقیناً شاہنواز کا کیا دھرا ہے۔ انہوں نے ہی فیکٹری میں آگ لگوا کر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان پر کیس کریں گے۔ انہیں عدالت میں گھسیٹیں گے۔" فرہاد نے جذباتی ہو کر بولا۔ سلیم صاحب البتہ خاموش رہے۔

"نہیں فرہاد مجھے کسی کو سزا نہیں دینی میرا رب بہترین منصف ہے۔ سلیم بھائی آپ جس طرح بہتر سمجھیں ادائیگی کر دیں۔ فیکٹری تو اب یوں بھی نہیں چل سکے گی اس لیے اگر اس میں سے بھی کچھ بچا ہے تو اس کی بھی قیمت لگا دیں۔" زہرہ بی بی نے بڑے حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ حویلی بھی بیچنی پڑے۔" سلیم صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔ زہرہ بی بی نے ضبط سے آنکھیں میچیں۔

"جو رب دی مرضی۔" انہوں نے بات ختم کر دی تھی۔

ساری رات مومی پریشانی سے اباجی کے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ آنکھیں تھیں کہ سوکھنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ کبھی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور بلب کی مدھم سی روشنی میں اماں جی کو دیکھتی جو جائے نماز بچھائے جانے کون سے نوافل ادا کر رہی تھیں۔ فجر کی نماز پڑھ کر جب وہ لیٹی تو غنودگی میں جانے سے پہلے اس نے اماں جی کو سجدے میں گڑگڑاتے ہوئے پایا تھا۔ صبح اس کی آنکھ شائلہ باجی کے اٹھانے پر کھلی۔

"مومی! اماں جی اباجی بھی ہمیں چھوڑ گئیں اب وہ ہم میں نہیں رہیں۔" بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے یہ خبر سنائی تھی۔ اور وہ بے یقین نظروں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق ان کی موت حرکت قلب بند ہونے کے باعث ہوئی تھی پر وہ جانتی تھی کہ اماں جی اندر سے ختم ہو گئی تھیں۔ اباجی کی موت انہیں لے ڈوبی تھی اور آخری کیل اباجی کی محنت سے بنائی فیکٹری کی بربادی نے ٹھونک دی تھی۔

اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔ سارا سارا دن وہ ایک جگہ بیٹھے روتے ہوئے گزار دیتی۔ شمسی بوا اور شائلہ اس کو سنبھالنے میں ہلکان ہو جاتیں۔ وہ اماں جی کے قل کا دن تھا جب فرہاد نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"مومی بیٹا۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تمہارے باپ جیسا بھائی اور ابھی زندہ ہے۔ میں اور تمہاری بہن تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑیں گے۔"

فرہاد نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جلد از جلد مومی کے کاغذات تیار کروائے گا اور وہ اسے ساتھ لے جائیں گے اور اسی دن سے اس نے اس کام کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی۔

فرہاد کے کسی جاننے والے کی بدولت اس کا ویزا جلد لگ گیا تھا۔ فرہاد نے ٹکٹ بھی خرید لیے تھے اس کی چھٹیاں جو ختم ہونے کو تھیں۔

مومی کی تیاری کرواتے ہوئے شمسی بوا کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ان کا خاندان تو عنایت اللہ کے گھرانے سے تھا۔ اب نہ وہ رہے تھے نہ ہی مومی یہاں رہ سکتی تھی۔ مومی انہیں محض تسلی ہی دے سکتی تھی اور کچھ تو اس کے بس میں نہ تھا۔

ان کی روانگی میں ہفتہ باقی تھا کہ اچانک فرہاد کے دو عزیز بڑے تایا کے انتقال کی اطلاع آ گئی۔ خبر ملتے ہی وہ اور شائلہ جنازے میں شرکت کرنے کی غرض سے نکل پڑے۔ پریشے کو انہوں نے مومی اور شمسی بوا کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

وہ ایک طوفانی رات تھی۔ بجلی کڑکنے کے شور سے اس کا چڑیا جیسا دل لرز جاتا اور وہ سوئی ہوئی پریشے کو کچھ اور خود میں بھینچ لیتی۔ دل پر عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی۔ اور نگاہیں گھڑی کی ٹک ٹک پر لگی تھیں۔ وہ شدت سے ان کی واپسی کی منتظر تھی۔ مگر نہیں جانتی تھی کہ یہ انتظار لاحاصل ثابت ہونے والا تھا کیونکہ وہ دونوں آئے تو تھے مگر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہونے کے لیے۔ واپسی پر ان کا بہت خوف ناک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس میں دونوں ہی جانبر نہ ہو سکے تھے۔ ان کی میت کو سامنے دیکھ کر بھی وہ کتنی دیر بے یقین رہی تھی۔ بھلا باجی اور فرہاد بھائی اسے اکیلا کیسے چھوڑ سکتے تھے پر حقیقت نہ ماننے

سے کب مفر ہے۔ اسے بھی تقدیر کے فیصلے کو تسلیم کرنا ہی پڑا تھا وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ اس بار کوئی تسلی کوئی دلاسا اسے چپ نہیں کروا سکا تھا۔ کتنے ہی گھنٹے وہ مسلسل روئے چلی گئی تھی۔ اور شاید یہ سلسلہ مزید چلتا اگر وہ پریشے کو نہ دیکھ لیتی۔ وہ چھوٹی سی بچی جس کے ماں باپ اس کو دنیا میں تنہا کر گئے تھے۔ اس کے لیے یہ ماننا مشکل تھا کہ وہ ان سے نہیں مل سکتی۔ اس کے دکھ کا احساس ہوتے ہی موی کے آنسو رک سے گئے تھے اور آگے بڑھ کر اس نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔

☆☆☆

چاند کو زمین پر اترتے دیکھا ہے
لفظوں کا مطلب بدلتے دیکھا ہے
یوں لوگوں سے امید نہ باندھ غالب
میں نے وقت کو رنگ بدلتے دیکھا ہے

چاچا کے اصرار پر وہ پریشے، شمسی بوا اور اکمل چاچا کے ساتھ گاؤں والی حویلی آ گئی تھی۔ ابھی انہیں آئے دو ہی دن ہوئے تھے اور جانے کیوں اسے چاچی کا رویہ کچھ روکھا سا محسوس ہونے لگا تھا اور اس خیال کو وہ اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیتی جو چاچا اور چاچی کی باتیں نہ سن لیتی۔

"میں کہتی ہوں کیا ضرورت تھی بھانجی کی ذمہ داری لینے کی اور دو جا اس کے ساتھ ٹبر کو دی رکھ لیا شاوا بھی شاوا۔" چاچی کی تمسخرانہ آواز نے اس کے قدم روک لیے تھے۔

"اری او نیک بخت کسی فیدے کے لیے رکھا ہے ورنہ وہ سلیم تو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔" جواباً چاچا کی آواز سنائی دی۔

"نا کیسا فیدا؟"

"دیکھ فیکٹری جلنے کا جو نقصان ہوا سو ہوا۔ پر جب واجبات ادا ہوں گے تے کج تے بچے گا نا..... بھاء جی نے دی کچھ کم نہ سمیٹا ہوگا۔ یہ سلیم ویلے مجھے کج دی نہ دے پر اس ٹبر کے نام پر میں اس سے نکلوا ہی لوں گا۔"

"نا تو آگے کیا کریں گے۔" چاچی کو تسلی نہ ہوئی۔

"آگے کیا کرنا ہے اس اکمل اور اس کی بیوی کو چاہے تو نکال دینا یا حویلی میں کسی کام پر لگا لینا۔ کوہم اسلم سے بیاہ دیں گے اور رہا بچی کا سوال تو اس سلیم کے حوالے کر دیں گے یوں بھی دادا کتنے دن کا وہی پالے گا۔" چاچا نے سارے مسئلوں کے حل تلاش کر رکھے تھے۔

"موی نہیں مانے گی بچی دینے پر۔"

"تو ادھر گاؤں کے اسکول میں ڈال دیں گے۔ شادی کے بعد وہ آپے ہی من جائے گی۔"

بھاری قدموں کے ساتھ وہ اپنے کمرے کی جانب مڑ گئی۔ ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ کتنے بھیانک تھے اس کے اپنوں کے چہرے۔ محبت سے سر پر ہاتھ رکھنے والے چاچا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے والی چاچی..... تو کیا وہ سب فریب تھا؟ وقت کے ساتھ یہ لوگ بھی بدل گئے تھے۔ جو بھی تھا اس کا دل ان کی باتوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔

اگلا پورا دن اس نے ان کے رویوں کو پرکھتے گزارا تھا۔ چاچی کے بظاہر میٹھے لفظوں میں چھپی بیزاری اسے محسوس ہونے لگی تھی۔ شمسی بوا کے ساتھ تو ان کا رویہ خاصا روکھا تھا۔ سارے دن انہیں کام پر لگائے رکھا تھا۔ پریشے کو بھی تین چار بار جھڑک چکی تھیں۔ کتنی ہی بار ان کی بڑبڑاہٹیں سن کر اس نے اپنی نم آنکھیں پونچھی تھیں۔

اسی دن دوپہر میں اسلم کی شکار سے واپسی ہو گئی۔ اپنی بڑی بڑی سیاہ مونچھوں کو تاؤ دیتے اسلم کی نظریں جب اس کے آر پار ہوتیں تو اس کے اندر پھریری سی دوڑ جاتی۔ کہیں چھپ جانے کا دل کرتا جبکہ وہ اس کے سہم جانے کا مزا لیتا کچھ اور اکڑ جاتا۔ اسی کی نظروں سے بچنے کی خاطر وہ کمرے ہی کمرے سے نکلتی تھی۔ ایک روز وہ کمرے میں بیٹھی تھی جب پریشے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ بھاگ کر باہر آئی۔ اس سے کھیلتے ہوئے چاچی کے جہیز کا شیشے کا جگ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے پاؤں پر بھی چوٹ آئی تھی اس کے باوجود چاچی نے اس کو تھپڑ مارا تھا۔ موی کا دل جیسے کسی

کی میں زور سے مسلا تھا۔ بیٹے کو اپنے سینے
لگاتے اس کے اپنے آنسو نکل آئے تھے۔ رات
بیٹے جلد سو گئی وہ بھی لیٹنے لگی تھی جب دروازے
پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اسلم
کھڑا تھا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا وہ بڑے دلبرانہ
انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"جی کوئی کام ہے آپ کو؟" موی نے دل کڑا
کرکے پوچھا۔

"کسی دن کام بھی کہہ لیں گے۔ ابھی تو اماں
(بوا) کے رویے کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔
ان کی باتوں پر دل چھوٹا نہ کیا کرو۔ غصے میں تو وہ مجھے
بھی نہیں بخشتیں"۔ عجیب مسکراتا ہوا سا انداز تھا۔ پر
اس نے جان چھڑانے کے لیے سر ہلا دیا وہ جلدی
سے دروازہ بند کرنے لگی تھی کہ اس نے بڑھ کر موی کا
ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے تو گویا تن بدن میں آگ لگ گئی
جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچا اور اس کی پروا کیے بغیر جلدی
سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ اسلم کو دھکا سا
لگا تھا وہ کچھ بڑبڑاتا ہو چلا گیا۔ جبکہ اندر دروازے
سے لگی کھڑی موی کو اپنا وجود بہکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

مشکل وقت میں انسان کے پاس دو راستے
ہوتے ہیں یا تو وہ دوسروں کا منہ دیکھے یا خود کو خود ہی
سہارا دے کر آگے بڑھ جائے۔ اور اس کے پاس بھی
یہی دو راستے بچے تھے۔ وہ ساری رات اس نے آنکھوں
میں کاٹی تھی۔ پہلی بار اس نے اپنی زندگی کے بارے میں
خود سے سوچنا شروع کیا تھا۔ اور فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس نے
ان دو رستوں میں سے ایک راستہ منتخب کر لیا تھا۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی وہ سوچوں کے بھنور
سے نکلی۔ وضو کر کے نماز پڑھتے اس کے اندر ایک نئی
توانائی آ گئی تھی یہ تمام دن اس نے اپنا لائحہ عمل طے
کرتے گزارا تھا۔

"بوا میں نے فیصلہ کیا ہے اب ہم یہاں نہیں
رہیں گے۔"

موی نے آہستگی سے انہیں آگاہ کیا۔ بوا جو اس

کے بلانے پر اس کے کمرے میں آئی تھیں، نے حیرت
سے اسے دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹیا اور کہاں
جائیں گے۔"

"خدا کی زمین بہت بڑی ہے بوا۔ کوئی نہ کوئی
ٹھکانا ہم بھی بنا لیں گے۔" اس کے لہجے میں مضبوطی
تھی جو بوا کو چونکا رہی تھی۔

"تمہارا اکمل چاچا بیمار رہنے لگا ہے۔ اگر اس
میں کوئی زور ہوتا تو میں کہتی وہ ہمارا بوجھ اٹھا لے گا پر
اب ہم کیسے پرائی دنیا میں نکل کھڑے ہوں۔" وہ
پریشان ہوئیں۔

"بوا ہمیں اپنا سہارا خود بننا ہے۔ ہم مل کر اپنی
الگ دنیا بنا سکتے ہیں۔" اس نے سمجھانا چاہا۔

بیٹیا یہ آپ کے اپنے ہیں اور ابھی آپ ان کے
رویے سے دل برداشتہ ہیں پر اس چھت کے علاوہ
آپ کو اور کہاں پناہ ملے گی۔"

"یہی تو میں آپ کو سمجھا رہی ہوں بوا۔ جب اپنے
خنجر نکال لیں تو اجنبی دنیا میں ہی بسیرا کر لینا چاہیے۔"
اس کا لہجہ تلخ ہوا۔ "آپ کو پتا ہے بوا! اماں جی ہمیشہ دعا
مانگا کرتی تھیں کہ اللہ انہیں ہر قسم کی محتاجی سے بچائے۔"
اپنی ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھتی وہ کہہ رہی تھی۔ "اور میں
سوچا کرتی تھی جانے اماں جی کس چیز سے خائف ہیں
کون سی محتاجی ہے جس سے ڈرتی ہیں۔ پر اب مجھے سمجھ
آ گئی ہے بوا۔ وہ صرف جسمانی محتاجی کا ذکر نہیں کرتی
تھیں وہ ہر اس محتاجی سے ڈرتی تھیں جس میں دوسرے
انسان پر انحصار کرنا پڑے۔" آنکھوں سے پھسلتے
آنسوؤں کو اس نے ہتھیلی کی پوروں سے پونچھا۔

"میں زہرہ بی بی اور عنایت کی بیٹی ہوں بوا اور
مجھے اپنی زندگی کے راستے خود تلاش کرنے ہیں۔" بوا
کو منہ کھولے دیکھ کر وہ مزید گویا ہوئی۔ "میں نے
اپنوں کے جنازے اٹھتے دیکھے ہیں بوا بہت تکلیف
سے گزری ہوں۔ مانا کہ وہ قدرت کے فیصلے تھے پر
اب میں حالات کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گی۔"

ایک عزم سے بولتی موی کل میں انہیں عنایت
اللہ کی جھلک نظر آئی تھی۔ پھر اس نے مڑ کر سوئی ہوئی

پریشے کو دیکھا۔ چہرے پر ملامت سی آ گئی۔

''اس معصوم کا بھی تو مجھے ہی سوچنا ہے جس کو باقی میری گود میں ڈال گئی ہیں۔ اس کا مستقبل میں تاریک نہیں ہونے دوں گی کہ روزِ محشر باقی مجھ سے سوال کریں تو میرا سر جھکا ہوا نہ ہو۔'' پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے بیگ سامنے رکھے۔ جو وہ تیار کر چکی تھی۔ بوا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ اپنا اور انکل چاچا کا سامان باندھ لیں بوا ظہر کے وقت سے کچھ پہلے ہم اس حویلی سے نکل جائیں گے۔ نماز کے فوراً بعد جو ٹرین ملتی ہے ہمیں اس میں بیٹھ کر شہر جانا ہے۔'' وہ سب کچھ طے کیے بیٹھی تھی۔

بوا نے بھی سر ہلا دیا وہ اس کے ساتھ کھڑی تھیں۔

☆☆☆

صبح کی ٹرین سے وہ اپنے شہر پہنچ گئے تھے۔ سلیم انکل کو اس نے اسٹیشن سے ہی فون کر دیا تھا۔ جب وہ ٹیکسی پر اپنی حویلی پہنچے تو سلیم انکل پہلے سے وہاں کھڑے تھے۔ حویلی کی چابیاں انکل کے پاس ہی تھیں۔ اندر اطمینان سے بیٹھتے ہی سلیم انکل نے اس کے یوں اچانک آنے کا مقصد پوچھا۔ اس نے بھی شروع سے آخر تک سب بتا دیا۔ سن کر وہ فوراً بولے۔

''بالکل ٹھیک کیا تم نے بیٹا۔ تم سب میرے ساتھ چلو۔ میری تو پہلے بھی یہی خواہش تھی۔''

''نہیں انکل۔ آپ اگر مجھے بیٹی مانتے ہیں تو آئندہ ایسی بات مت کیجیے گا۔ آپ کا ہونا ہی میرے لیے اہم ہے۔ مگر میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ اپنا بوجھ میں خود اٹھاؤں گی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ سوچ چکی تھی کہ اسے انکل کو کیسے روکنا ہے۔ وہ شروع سے ان کے حالات جانتی تھی اسی لیے ان کی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یوں بھی اب تو انہیں بھی دوسرے شہر میں نوکری مل گئی تھی۔ اور اگلے مہینے سے انہیں جانا تھا پھر وہ ان سے واجبات کی ادائیگی کی تفصیلات پوچھنے لگی۔

زیادہ تر ادائیگی کی جا چکی تھی اور جو رہ گئی تھی وہ حویلی بکنے پر کی جانی تھی۔ حویلی کا سودا بھی طے تھا بس

اس کے چاچا نے کل کا دن [illegible] سامنے کروانا چاہتے تھے۔ [illegible] دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو آج ہی [illegible] مضبوط کر کے اس نے آخری بار [illegible] دیکھا تھا کچھ سامان ساتھ باندھا تھا [illegible] گھر خریداروں کے حوالے کرنے کے [illegible] آئے۔ باقی سب کو انکل کے گھر [illegible] ساتھ دفتر گئی تھی۔ دفتر کی جگہ بھی دوسرے [illegible] قبضہ دیا تھا۔ وہاں بیٹھ کر انہوں نے [illegible] حساب کیا اور جو پیسے اس کے حصے میں آئے [illegible] سے وہ ایک فلیٹ خرید سکتے تھے۔ شام تک [illegible] تلاش میں سرگرداں رہے چونکہ موبی بیٹھ [illegible] کرنا چاہتی تھی۔ رات تک اسے ایک فلیٹ [illegible] آ گیا تھا۔ پیسوں کی ادائیگی چونکہ صبح ہونی تھی [illegible] لیے اس رات وہ سلیم انکل کے ہاں ہی رک گئے۔ اس دوران چاچا کی کال سلیم انکل کو آ چکی تھی اور [illegible] کے منع کرنے پر انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح [illegible] تھی اور گھر کا سودا کر کے اب جا چکی ہے۔ موبی [illegible] چاہتی تھی کہ چاچا یا کسی کو بھی اس کے نئے ٹھکانے [illegible] خبر ہو اور سلیم انکل پر اسے پورا اعتماد تھا کہ وہ کسی کو [illegible] اس تک پہنچنے نہیں دیں گے۔

☆☆☆

یہاں سے اس کی زندگی کے نئے سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔ پریشے کے اسکول کے ساتھ ساتھ اسے نوکری کا انتظام بھی کرنا تھا اور یہ اسے سب سے مشکل مرحلہ لگا تھا۔ اس کے پاس صرف ایف ایس سی کی ڈگری تھی، شیکسٹائل ڈیزائننگ تو کب کی ادھوری رہ گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے کمپنیوں میں نوکری حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر ڈگری کے بغیر کوئی اسے ڈیزائنر رکھنے کا روادار تھا۔ بینک میں کچھ پیسہ تو تھا مگر اتنا نہیں کہ دو زیادہ عرصہ اس پر گزارا کر سکتی۔ پھر پریشے کا داخلہ، اکمل چاچا جو بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی دوائیں اور گھر کے دیگر اخراجات پورے کرنے کے

یہاں کی نوکری کرنا بے حد ضروری تھا۔

کسی بوا کی دعائیں اور اس کی خواری رنگ لائی تھی اور آخر کار قدرت اس پر مہربان ہو ہی گئی۔ اسے ایک اسکول میں نوکری مل گئی۔ زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چل پڑی تھی۔ اسکول کی پرنسپل میڈم نبیلہ کی وہ بہت احسان مند تھی جنہوں نے اسے ڈگری نہ ہونے کے باوجود نوکری پر رکھ لیا تھا۔ تھکن سے اس کا برا حال ہو جاتا۔ انہی دنوں وہ میڈم نبیلہ کے دفتر گئی تو وہ مس فریحہ کے ساتھ کچھ حساب کھولے بیٹھی تھیں ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی وہ وہیں بیٹھ گئی۔

''میرا خیال ہے میڈم یہ چالیس ہزار بنے گا۔'' مس فریحہ متذبذب سی بولیں۔

''پچاس ہزار آٹھ سو ساٹھ روپے۔'' مومی کے منہ سے پھسلا وہ جو اتنی دیر سے ان کا حساب کتاب سن رہی تھی تو ذہن نشین کر لیا تھا۔

مس فریحہ اور میڈم نبیلہ نے بے اختیار اس کی جانب دیکھا وہ جھل ہوئی۔

''معذرت چاہتی ہوں میڈم، وہ میرے منہ سے نکل گیا۔''

''اس میں معذرت کی کیا بات ہے بلکہ اچھا ہو گیا اس سے ہمارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

''مس گل۔ مجھے آپ سے غور چاہیے۔ دراصل ہمارا اکاؤنٹنٹ دو مہینے کی چھٹی پر گیا ہوا ہے تو اگر آپ یہ ذمہ داری اٹھالیں تو ہماری پریشانی کچھ کم ہو جائے گی۔'' میڈم نبیلہ کے لہجے میں اصرار تھا۔

مومی کو خوشی ہوئی۔

''جی میڈم مجھے آپ کی پریشانی دور کر کے خوشی ہوگی۔ آپ میرے اوپر اتنا اعتماد کر رہی ہیں میرے لیے خوشی کی بات ہے۔''

''گڈ۔'' میڈم خوش ہو گئیں۔

اگلے دن سے اس نے یہ ذمہ داری اٹھالی۔ مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے ایک بہت بھاری ذمہ داری اٹھالی تھی۔ پچھلے اکاؤنٹنٹ افتخار صاحب خاصے پرانے ملازم تھے اور عرصہ دراز سے یہاں نوکری کر رہے تھے۔ مگر ہر کھاتے میں انہوں نے گڑبڑ کی ہوئی تھی جسے دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ کچھ دنوں میں اسکول کے مالکان نے اسکول کا چکر لگانا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اس سے پہلے میڈم کو اس صورت حال سے آگاہ کر دے اور جب اس نے ان کے سامنے سارے ثبوت رکھے اور ساری سچائی بتائی تو وہ کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گئیں۔

''میری بات سنیں مس گل۔ آپ اس بات کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہیں گی یہی آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ تیس پرسنٹ ہر ماہ تمہاری تنخواہ میں جائے گا۔'' وہ گویا اس کے ایمان کو آزما رہی تھیں۔ بولو منظور ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ میں آپ کے اس کھیل میں حصہ دار نہیں بنوں گی۔'' مومی کے مضبوط لہجے پر ان کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ''ابھی اتنی بے ضمیر نہیں ہوئی کہ پیسوں کے لیے اپنا ایمان بیچ دوں۔ میں وہی رپورٹ بناؤں گی جو سچ پر مبنی ہوگی۔ دھوکا نہیں دوں گی کسی کو۔ میری مانیں آپ بھی توبہ کر لیں۔ یہ حرام کی کمائی آپ کو کچھ نہیں دے گی۔''

یک دم میڈم نبیلہ کی آنکھوں میں سختی اتر آئی لہجہ سرد ہو گیا۔

''اپنی بھانجی کو لو اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ کیونکہ نہ وہ اب یہاں پڑھے گی اور نہ تم یہاں نوکری کرو گی۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ میری اس مہینے کی تنخواہ دے دیں یوں بھی کل مجھے یہاں کام کرتے ہوئے مہینہ ہونے والا ہے۔'' مومی نے آنسو ضبط کیے ورنہ اپنی بے بسی پر اسے رونا آ رہا تھا۔ اتنی مشکلوں سے ملنے والی نوکری ختم ہو رہی تھی وہ بھی ان حالات میں۔

''کون سی تنخواہ تمہیں تو میں نے رجسٹر تک نہیں کیا۔ کون مانے گا کہ تم یہاں نوکری کرتی رہی ہو؟'' تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہنوز سرد لہجے میں بول رہی تھیں۔

''آپ آپ میرے ساتھ ایسے کیسے کر سکتی ہیں میری تنخواہ.....'' مومی روہانسی ہوئی مگر وہ بات کاٹ

گئیں۔

"جاؤ جا کر وکیل کرو اور ثابت کر دو کیونکہ میں تو تمہیں کوئی پیسہ نہیں دینے والی۔ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں چوکیدار کو بلاؤں۔"

"وہ چپ چاپ مڑ گئی۔ آنسو گالوں پر پھسلتے چلے گئے مگر اس بار اس نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔"

☆☆☆

زندگی کچھ اور مشکل ہو گئی تھی مہینہ ختم ہو گیا تھا اور خرچے منہ کھولے کھڑے تھے۔ بینک میں اتنے ہی پیسے بچے تھے کہ اس مہینے کے بل ادا کر دیے جاتے۔ باقی اگلی چاچا کی دوائیں اور گھر کا راشن اور اگلی چاچا کی دوائیں وہ کسی نہ کسی طرح انہوں نے پورا کر لیا تھا۔ بات فاقوں تک پہنچتی نظر آ رہی تھی۔ پریشے ایگ بولائی بولائی پھرتی۔ اس بڑی کی دنیا بار بار بکھر جاتی تھی وہ جو اسکول جانے سے کچھ سنبھلی تھی ایک بار پھر ٹوٹ سی گئی تھی۔

صبح میں نوکری کی تلاش کرتی دوپہر تک وہ بے حال ہو جاتی۔ کچھ دن گزرے تو ساتھ والے فلیٹ کی آنٹی نے اسے اپنے بچوں کو ٹیوشن دینے کا کہا وہ اس کے حالات سے بھی کسی قدر واقف تھیں۔ ان کی مشکور ہوتے اسے بھی یہ خیال آیا کہ آس پاس کے فلیٹ کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیا کرے۔ یوں یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور اسے کچھ تسلی ہوئی۔ یہ مہینہ کسی نہ کسی طرح گزر گیا۔

اگلے مہینے کے شروع میں اسے ایک دفتر میں ریسپشنسٹ کی نوکری مل گئی۔ خدا کا شکر ادا کرتے اس نے یہ نوکری بھی شروع کر دی۔ پریشے کو اس نے فلیٹ کے قریب موجود ایک چھوٹے سے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ یوں زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح گھسٹ گھسٹ کر چل پڑی مگر آسانیاں زندگی سے کب کی ختم ہو چکی تھیں۔ یہ وقت بھی اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ دفتر اس کی رہائش سے خاصا دور پڑتا۔ پیدل تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا جو وہ روز طے کرتی اس کے فلیٹ سے کوئی بس نہیں ملتی تھی اور رکشے والا پیسے زیادہ مانگتا تھا۔ وہ کچھ مجبوری میں اور کچھ اپنا خرچا بچانے کے چکر میں پیدل آنی جاتی۔ شروع شروع میں آدھا فاصلہ وہ پیدل بے بسی پر آنسو بہاتے گزار دیتی۔ اسے بھلا کہاں عادت تھی اس طرح کی خواری کاٹنے کی۔ وہ تو لاڈوں میں پلی تھی۔ آرام سے اپنی گاڑی میں آیا جایا کرتی اور اب یوں دھوپ گرمی میں روز پیدل چلنا کہ پاؤں دکھنے لگتے۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ بے حال ہو جاتی۔ کسی بوا اس کی حالت دیکھتیں تو آنکھیں نم ہو جاتیں۔ کون جانتا تھا کہ عنایت اللہ اور زہرہ بی بی کی اولاد ایسے حالوں تک پہنچ جائے گی۔

وقت کے ساتھ اس کے اندر ایک ٹھہراؤ آ رہا تھا۔ اس نے حالات کے ساتھ لڑنا اور کسی حد تک سمجھوتا کرنا سیکھ لیا تھا۔ اب وہ بات بات پر روتی نہیں تھی بلکہ اپنے جذبات پر قابو پا لیتی۔ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ اس کے زخموں پر بھی وقت نے اپنے بے رحم ہاتھوں سے مرہم لگا یا تھا یوں کہ وہ بلبلائی تڑپی سنبھل گئی۔ ٹھوکر لگنے سے گری تو اپنا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ وقت کی بھٹی میں گویا وہ کندن بن کر ابھری تھی۔

ایک سال بعد اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ وہ جو دفتر کے فارغ وقت میں اکثر کاغذ پر ڈیزائن بنا کر بنا کر اپنا ڈیزائننگ کا شوق پورا کرتی رہتی۔ ایک روز روزینہ اقبال کی نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ اس کی باس میڈم رابیل کی دوست تھیں اور اکثر چکر لگاتی رہتی تھیں۔

"مس موی آپ کے ڈیزائنز تو بہت اچھے ہیں۔" انہوں نے توصیفی نظروں سے اس کے میز پر پڑے کاغذوں کو دیکھا۔ جن پر خوب صورت ڈیزائنز بنائے گئے تھے۔

"شکریہ میڈم مجھے ہمیشہ سے ڈیزائننگ کا شوق تھا۔ ٹیکسٹائل ڈیزائننگ پڑھ رہی تھی جب کچھ گھریلو مسائل کی وجہ سے پڑھائی مکمل نہ کر سکی۔" موی نے سنجیدگی سے بتایا۔ اب اس کے لہجے میں پہلے جیسی بے چارگی نہ تھی۔

"ہوں۔" انہوں نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ پھر اگلے روز وہ اس کے لیے ایک آفر لائی تھیں۔

"موی میں چاہتی ہوں کہ ہم مل کر کپڑے کی فیکٹری لگائیں۔ جس میں تم کپڑے ڈیزائن کرو۔ مجھے تمہارے ڈیزائنز بہت پسند آئے ہیں۔"

"میڈم پر میں کیسے میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں اور پھر پتا نہیں میں اتنے بڑے پیمانے پر یہ کر سکوں گی یا نہیں۔" موی حیرت زدہ سی انہیں دیکھے گئی۔

"تمہارے پاس تمہارا ٹیلنٹ تو ہے نا اور پھر میں سپانسر کروں گی۔ تم آہستہ آہستہ اپنے جہیز کی رقم ادا کر دینا۔ یوں ہم اپنی پارٹنر شپ برقرار رکھیں گے۔" روزینہ نے پورے خلوص سے حل پیش کیا۔

اور یوں حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ اس کام میں محنت بہت تھی پر اب وہ محنت سے گھبراتی نہیں تھی رات رات بھر تک وہ کام میں جتی رہتی۔ اسے جیسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ گھر کی اسے زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ کبھی بوا اس سے بڑھ کر پریشے کا خیال رکھتیں۔ آہستہ آہستہ ان کی زندگی میں خوشحالی آتی جا رہی تھی اور یہ سب اس کی محنت کا ثمر تھا۔

سات سال انہوں نے ساتھ کام کیا تھا اور ایسے میں ان کا تعلق کچھ اور مضبوط ہو گیا تھا۔ وہ موی کی ساری کہانی جان گئی تھیں اور اکثر اس کی ہمت کو سراہتیں۔ پھر ان کا بیٹا جو امریکہ میں زیر تعلیم تھا وہ انہیں اپنے پاس بلانے پر اصرار کرنے لگا۔ اب چونکہ اس کو اچھی نوکری مل گئی تھی وہ اپنی ماں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ جاتے جاتے وہ اپنا حصہ موی کو بخشنا دینا چاہتی تھیں مگر موی نہ مانی ان کا آدھا حصہ اس نے خرید لیا اور باقی کے حصے کا منافع ہر ماہ ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انہیں پیسوں کی کسی قسم کی کمی ہو۔ اکثر وہ منافع سے زیادہ رقم ان کو بھجوا دیتی۔ اور یہ رقم کسی بھی طرح ان کے اس احسان کو اتار نہیں سکتی تھی جو انہوں نے اس پر اعتماد کر کے کیا تھا۔ ورنہ وہ ساری زندگی اس چھوٹے سے دفتر میں ریسپشنسٹ کی نوکری کرتے گزار دیتی۔

☆☆☆

"پریشے کب بڑی ہو گی تم۔ معلوم بھی ہے میں کتنی مصروف ہوتی ہوں، اس پر یہ لنچ کا پلان!" بگڑتی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"خالہ اتنے عرصے سے ہم نے باہر کھانا نہیں کھایا۔ اسی لیے میں نے سوچا لنچ کر لیتے ہیں۔" پریشے نے مزے سے کہا۔

ان کے آپس کے تعلقات کافی بہتر ہو چکے تھے۔ اسی لیے اس نے موی کو میسج کر دیا تھا کہ وہ ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ لنچ اکٹھے کریں گے اور اسی پر اب موی ناراض ہو رہی تھی۔

"تو ڈنر کا پلان کر لیتے یا ابھی آ جاتیں۔" موی اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔ اسے ہر موقعے پر بوا یاد رہتی تھیں۔

"ڈنر بھی کر لیں گے۔"

"شاپنگ کر کے آ رہی ہو۔ کالج نہیں گئیں؟" کرسی پر رکھے شاپنگ بیگز دیکھ کر موی کو خیال آیا۔

"گئی تھی خالہ دیکھیں ابھی تک یونیفارم میں ہوں۔ پر وہ آخری کلاس بنک کر کے ہم دوستیں شاپنگ پر چلی گئیں۔ ندا کے بھائی کی شادی ہے نا کچھ دنوں میں۔" انگلیاں چٹخاتی وہ صفائی دینے والے انداز میں بولی۔

"منع کیا تھا نا کلاس بنک نہیں کرنی۔" موی نے ناراضی سے اسے دیکھا پہلے بھی دو بار وہ اسے سرزنش کر چکی تھی۔

"اچھا سوری، اب نہیں کروں گی۔"

"السلام علیکم۔"

موی نے حیرت سے سر اٹھایا۔ سامنے مسکراتا ہوا ارحم اور ساتھ میں عالیان تھا جو پریشے سے حال احوال پوچھنے لگا۔ موی نے سنجیدہ نظروں سے پریشے کو دیکھا۔ وہ انہیں بیٹھنے کی دعوت دیتی اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"کیسی ہیں بھابھی آپ؟" ارحم چہکتا ہوا بولا۔ پریشے نے اسے گھورا جبکہ موی اس طرح مخاطب کیے جانے پر جز بز ہوئی۔ عالیان کی خاموش نظریں اسی پر تھیں۔

"بھابھی کیوں کہہ رہے ہو۔ کچھ اور نہیں کہہ سکتے۔" پریشے جلدی سے بولی اسے ڈر تھا موی اٹھ کر

چلی نہ جائے۔

"اور کیا کہوں تم جو اتنی ینگ خاتون کو خالہ کہہ کر بلاتی ہو تو میں اپنی بھابھی کو بھابھی کہہ کر مخاطب نہیں کرسکتا کیوں بھابھی مجھے تو نہیں روکیں گی نا آپ۔" جواب طلب نظروں سے موی کو دیکھتے اس کے لہجے میں انتہائی عزت اور اپنائیت تھی وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"مرضی ہے تمہاری۔" اس کے سنجیدگی سے کہنے پر عالیان ہولے سے مسکرایا اور پریشے کس قدر حیران ہوئی۔

"اور یہ بنک والی بات بالکل ٹھیک کررہی تھیں ـــــ آپ، اس کے کان کھینچیں یہ بہت کلاسز بنک کرتی ہے۔" ارحم مزید پھیل گیا۔

"تمہارے کان بڑے تیز ہیں۔" پریشے کو جی بھر کرتاؤ آیا۔

"ہوں کان تو کھینچنے پڑیں گے۔" موی نے کہہ کر مینو کارڈ اٹھا کر اپنے سامنے کرلیا۔

"عالیان بھائی آپ دیکھ رہے ہیں یہ ارحم میری کیسی شکایتیں لگا رہا ہے۔ یہ کون سا میرے کالج میں پڑھتا ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ اس کے کان میں گھر جا کر خوب اچھی طرح کھینچوں گا۔" عالیان نے اسے تسلی دی۔ جس پر وہ خوش ہوگئی۔

"تم یہ بتاؤ اس کو برداشت کیسے کرلیتی ہو۔ ہر وقت تو یہ تم سے بحث کرتا رہتا ہے۔" عالیان کے شرارتی انداز پر پریشے پھیلی۔

"بس عالیان بھائی مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

"بھائی بڑے افسوس کی بات ہے اسے دیکھتے ہی آپ کو اپنا بھائی یاد نہیں رہتا۔" ارحم نے شکایت کی۔

"ہاں تو اس سے دہرے رشتے ہیں میرے۔ بہن بھی ہے بیٹی بھی ہے۔" مسکراتے لہجے میں بولتے اس نے سامنے دیکھا۔ موی کا چہرہ کارڈ کے پیچھے چھپا تھا۔ پھر ارحم کی جانب مڑا۔ "اور پھر تمہاری وجہ سے تیسرا رشتہ بھی بن جائے گا۔"

خوش ہوتی پریشے سٹپٹائی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ارحم کو اشارہ کیا کہ وہ کچھ بولے جواباً اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"میں لنچ آرڈر کررہی ہوں۔ مجھے واپس بھی پہنچنا ہے۔" موی نے یک دم زوردار آواز سے مینو کارڈ میز پر رکھا، لہجے میں واضح ناپسندیدگی تھی۔ میز پر بیٹھے وہ تینوں نفوس کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ موی نے دور کھڑے ویٹر کو اشارہ کیا تو وہ آرڈر لینے کے لیے آگیا۔

"مجھے کچھ خریدنا ہے پاس سے میں لنچ آنے تک آجاؤں گا۔" ارحم سامنے بیٹھی پریشے کو اشارہ کرکے کرسی کھینچ کر کھڑا ہوا۔

"میں ساتھ چلتی ہوں۔" "تب تک آپ دونوں گپ شپ کریں۔" وہ جلدی سے اپنی جگہ پر سے اٹھی۔

"یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟" پریشے باہر نکلتے ہی بول پڑی۔

"بھائی بھابھی کو ملانے کی سبیل جس میں تم بھی میرے ساتھ ہو۔" وہ مطمئن سا بولا۔

"انجان مت بنو۔ میں اس سچ کی بات کررہی ہوں جو تم بتا نہیں رہے۔ اب کیا قباحت ہے بتانے میں کہ ہمارے درمیان ایسا ویسا کچھ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہے ہیں۔"

"تمہیں کون سا انعام ملے گا یہ سچ بتا کر۔ الٹا نقصان ہی ہوگا۔"

"کیسا نقصان؟" وہ ٹھٹکی وہ اب ایک دکان کے اندر داخل ہوچکے تھے۔ ارحم اس کی طرف مڑا۔

"دیکھو تم اپنی خالہ کا ویک پوائنٹ ہو۔ وہ اپنے رشتے کو لے شک اہمیت نہ دیں مگر تمہاری خواہش کو آج نہیں تو کل انہیں سنجیدگی سے لینا پڑے گا۔ اس

طرح وہ اپنے اور عالیان بھائی کے رشتے کو قبول کرنے پر بھی راضی ہو سکتی ہیں۔ مگر اب اگر تم یہ بات کو بتا دیتی ہو کہ تم مجھ میں انٹرسٹڈ نہیں ہو تو وہ ریلیکس ہو جائیں گی۔ ان کے لیے یہ رشتہ ہمیشہ بے حسی رہے گا۔" ارحم کے سمجھانے پر وہ قائل ہو گئی۔ ہامی میں سر ہلایا۔

"شکر کرو میری سمجھ داری کام آ گئی ورنہ تم نے سب اگل کر بھانڈا پھوڑ دینا تھا۔ پھر میری ساری پلاننگ پر پانی پھر جاتا۔" وہ اپنے مخصوص چڑانے والے انداز میں بولا جس پر وہ واقعی چڑ گئی۔

"اب یہ مت سمجھ لینا کہ عقل کل تم ہی ہو۔" تمہاری یہ پلاننگ نہ تو اتنی زبردست ہے کہ اس پر داد دی جائے اور نہ میری خالہ اتنی آسانی سے مجبور ہونے والی ہیں کہ میری خواہش کے آگے گھٹنے ٹیک دیں۔ یہ صرف تکا ہے لگ گیا تو لگ گیا ورنہ نتیجہ صفر۔"

"بندہ بات ہی اچھی کر لیتا ہے۔" اپنی بات کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔

اس کی آدھے ادھورے جملے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ "بدتمیز" پیر پٹختی وہ تلملا کر دوسری جانب مڑ گئی۔

موی کو جی بھر کر پریشے پر غصہ آ رہا تھا جو اپنی من مانیاں کرتی پھر رہی تھی۔ اب یوں ارحم کے ساتھ اٹھ کر چلے جانا اسے مزید تاؤ دلا رہا تھا۔

"موی۔" ان کے درمیان موجود خاموشی کو عالیان کی نرم آواز نے توڑا۔

"آپ سے کہا تھا نا میرا نام موی گل ہے۔" وہ اندر تک سلگ اٹھی اس کے یوں پکارنے پر۔

"کیا اب بھی میں اس جسارت کا حق نہیں رکھتا۔" کیسی آس تھی اس کے لہجے میں۔ مگر سامنے بھی لڑکی دس سال پہلے والی موی نہیں تھی۔ وہ ہنوز کھڑکی سے بولی۔

"آپ مجھ پر کوئی حق نہیں رکھتے اور نہ ہی میں کوئی حق آپ کو دوں گی۔"

"پریشے۔" موی نے درشتی سے عالیان کی بات کاٹی۔

"پریشے کا نام مت لیں۔ وہ میری ذمہ داری ہے۔ سرپرست ہوں میں اس کی۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہوں۔"

"اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے مگر ارحم اور پریشے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تم اچھی طرح جانتی ہو۔" عالیان نے دھیمے لہجے میں سمجھانا چاہا۔ وہ اس کی سرد مہری کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

"افسوس ہے مجھے کہ ارحم آپ لوگوں میں سے ہے اور اسی لیے مجھے یہ قبول نہیں۔ بہتر ہوگا آپ دونوں بھائی اس بات کو سمجھ لیں۔" ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولتی وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ کیسی تپش تھی اس کی آنکھوں میں عالیان کچھ لمحوں کے لیے سٹپٹا کر رہ گیا۔ پھر مضطرب سا بولا۔

"کیا اب مجھے کبھی معافی نہیں ملے گی۔ کیا یہ امتحان کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

"امتحان۔ آپ کا امتحان تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب آپ ہمارے گھر کی دہلیز پار کر گئے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ پیچھے کتنے لوگ برباد ہو گئے۔" وہ تڑپ ہی تو گئی تھی۔

عالیان نے نگاہیں چرائیں۔

"ازالے کا موقع نہیں دو گی۔" اس کی آس تھی کہ ٹوٹ ہی نہیں رہی تھی۔

موی نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ لوگوں نے دیا تھا صفائی کا موقع۔ مسٹر عالیان شاہنواز وقت گزر جائے تو ازالے کی ضرورت رہتی ہے نہ اہمیت بس تاوان بھرنے پڑتے ہیں۔" کیسی کاٹ تھی اس کے لہجے میں کہ عالیان کا دل چھلنی ہو گیا۔

مقروض تھا وہ اس کا اور وہ نہ قرض اتارنے دے رہی تھی نہ معاف کرنے کو تیار تھی۔

☆☆☆

شاہنواز صاحب اور فائقہ بیگم کل رات کی فلائٹ سے پاکستان پہنچے تھے اور ان کی واپسی کی خبر

سنتے ہی تعبیر بھاگی چلی آئی تھی۔ اس کے آتے ساتھ فائقہ بیگم نے ناشتا لگوا دیا چونکہ وہ صبح ہوتے ہی ناشتے کے بغیر آگئی تھی۔ اب ڈائننگ ٹیبل پر فائقہ بیگم کے برابر بیٹھی باتیں بگھار رہی تھی۔ ارحم تیار ہو کر سیڑھیاں اترتا نیچے آیا۔

"اچھا تو آپ آئی ہوئی ہیں۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ کون خاتون ہیں جن کی آواز میرے کمرے تک آرہی ہے بھول گیا تھا کہ ایک تابی آپی ہی ہیں جو صبح صبح وارد ہو سکتی ہیں۔" اپنے مخصوص چڑانے والے انداز میں بولتا وہ کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

تعبیر نے ناشتے کی طرف بڑھتا ہاتھ روک کر اسے گھورا۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے۔ میری مرضی جس وقت آؤں۔ میرا بھی گھر ہے یہ۔"

"اور وہ جو دوسرا گھر ہے جہاں آپ کو روانہ کیا تھا۔ میاں، بچے کوئی ذمہ داری نہیں ہے آپ پر۔ انہیں کس آسرے پر چھوڑ آئی ہیں۔" مزے سے ناشتا پلیٹ میں نکالتا وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

"میاں دفتر جا چکے ہیں اور بچوں کو اسکول چھوڑ کر آرہی ہوں۔ تمہیں زیادہ میری ماں بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" اسے جواب دیتی وہ فائقہ بیگم کی طرف مڑی۔

"ماما میں نے آپ دونوں کو بہت مس کیا اس بار بہت لمبا ٹرپ تھا۔"

"آپ کی باتوں کا اسٹاک جو اوور فلو ہو گیا ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا۔ سسرالیوں کی گوسپ کس سے کریں۔ ماما جو یہاں نہیں تھیں۔" فائقہ بیگم سے پہلے ارحم بول پڑا۔

"دیکھ رہی ہیں ماما! میرا گھر آنا کیسا چبھ رہا ہے اسے۔" تعبیر فوراً جذباتی ہوئی۔

"ارحم.....!" فائقہ بیگم نے تنبیہہ نظروں سے اسے دیکھا اگرچہ وہ اس کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں۔

"کیا ماما۔ آتے ہی یہ نمبر بنانا شروع کر دیتی ہیں جیسے ہم تو شکرانے کے نوافل ادا کر رہے تھے دونوں کے جانے پر۔ ویسے میں تو بابا کی ڈانٹ کو مس کر رہا تھا۔ لگتا ہے عرصہ گزر گیا ان کی ڈانٹ سنے۔" آخر میں آنکھ دباتا آہستگی سے بولا جس پر وہ دونوں ہنس پڑیں۔

"تمہاری جس لڑکی سے شادی ہوگی نا وہ کانوں کو ہاتھ لگائے گی۔ بے چاری۔" تعبیر نے حساب برابر کیا۔

"میرے ساتھ رہنے سے کم از کم برداشت کا مادہ تو اس میں آجائے گا۔" وہ محظوظ ہوا۔

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے پہلے عالیان بھائی کی شادی ہوگی۔"

اس کے برابر بیٹھی فائقہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھرتے چائے کی پیالی لبوں سے لگائی۔ اپنا یہ ارمان انہیں پورا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسی وقت تازہ دم سا عالیان سلام کرتا کرسی کھینچ کر ارحم کے برابر بیٹھا۔

فائقہ بیگم نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ کیسا روشن چہرہ تھا ان کے بیٹے کا اور آنکھیں، شفاف ہر کھوٹ سے پاک، مردانہ وجاہت کے ساتھ اس کی شخصیت کا سحر لاجواب تھا۔ ان کی نظروں کے ارتکاز پر چائے ڈالتے عالیان نے چند لمحوں کے لیے نگاہیں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں کا بدلاؤ جیسے ان پر کھل گیا تھا۔

"کوئی بات ہے عالیان تو بتاؤ بیٹا۔" ان کے بے ساختگی سے کہنے پر عالیان نے ہاتھ روک کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی جھجک وہ آج بھی پہچان لیتی تھیں۔ بس نگاہیں ٹھہر جانے کی بات تھی اس کی مشکل آسان ہو جاتی۔

"آپ آج بھی جان گئیں کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" ماں کا چہرہ تکتا وہ محبت سے بولا۔

"تم ہم سے کچھ چھپاتے جو نہیں ہو۔" وہ مسکرائیں۔ ارحم کے حلق میں کچھ اٹکا۔ جلدی سے عالیان کو دیکھا کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا ماما بابا کے آتے ہی

پر پھوڑ دیں۔

"بھائی ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" ارحم نے عالیان کو روکنا چاہا مگر وہ اپنے ارادے سے پیچھے نہ ہٹا۔

"آپ کو سچ بتائے بغیر میرے حلق سے نوالہ نہیں اترے گا۔" اس کی صاف گوئی عروج پر تھی۔

ارحم کو سانس لینا دشوار لگا۔ تعبیر چائے پینا بھول کر عالیان کو تکنے لگی۔

"میں نے نکاح کرلیا ہے۔" دونوں نے حیرت سے عالیان کے سنجیدہ انداز کو دیکھا۔ اس کے منہ سے ایسی بات سننے کا تو انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ "حالات کچھ ایسے تھے کہ مجھے آپ کی اجازت کے بغیر یہ فیصلہ کرنا پڑا۔"

"کون کس سے؟" فائقہ بیگم نے منہ سے بمشکل نکل پایا۔

"منوی محل سے۔" عالیان نے بلا آخر سچ اگل دیا۔

فائقہ بیگم الجھن آمیز نظروں سے اسے تکے گئیں۔ شاید نام سننے میں ان سے غلطی ہوئی تھی۔ جبکہ ساتھ بیٹھی تعبیر کا تو پورا کا پورا منہ کھل گیا تھا حیرت کے مارے۔ یک دم اس کی نظر دروازے میں ایستادہ ثانیہ نواز صاحبہ پر پڑی جن کی سماعت تک یقیناً یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ تبھی ان کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔ اگلے لمحے وہ غضب ناک انداز میں آگے بڑھے۔

"کس سے پوچھ کر تم نے عنایت اللہ کی بیٹی سے رشتہ جوڑا؟ اس لڑکی کو اگر بہو بنانا ہوتا تو یہ کام میں دس سال پہلے ہی کر چکا ہوتا۔"

عالیان انہیں سامنے پا کر اپنی جگہ سے احتراماً کھڑا ہوا۔ تعبیر اور ارحم ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر کھڑے ہوئے۔ باپ کو اس قدر غصے میں دیکھ کر وہ گنگ ہی رہ گئے تھے۔ جبکہ فائقہ بیگم خود میں اتنی سکت نہ پا رہی تھیں کہ اپنی جگہ سے ہلتیں۔

"آپ اطمینان سے بیٹھیں میں ساری بات بتا ہوں آپ کو۔"

"اطمینان تو رخصت ہو گیا۔ جب اولاد خود سے اتنے بڑے فیصلے کرنے لگے تو ماں باپ کی زندگی سے یہ عیاشی ختم ہو جاتی ہے۔ سیدھی طرح بتاؤ اب کی بار ان لوگوں نے ایسا کون سا جال بنا ہے جو تم بے وقوفوں کی طرح ان کی بیٹی سے نکاح کر بیٹھے۔ باپ سے پوچھنا تو درکنار بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔"

"بابا پلیز، ان دونوں میاں بیوی کا انتقال ہو چکا ہے ان کا ذکر رہنے دیں۔"

چند لمحوں کے لیے وہ خاموش ہوئے مگر غصہ کم نہیں ہوا۔

"تم کان کھول کر سن لو کہ وہ لڑکی بیاہ کر اس گھر میں نہیں آسکتی۔ بے ایمانی اور دھوکا دہی میں کبھی معاف نہیں کرتا۔"

"کیوں بابا! اس لڑکی کا تو کوئی قصور نہیں تھا اس سب میں اور پھر ہمارا تو کچھ نہیں گیا۔ سارا نقصان تو اس کے حصے میں آیا۔" پہلی بار عالیان ان کے سامنے یوں کھڑا ہوا تھا مگر اس کے لہجے میں گستاخی نہیں تھی۔

"کیا آپ جانتے ہیں ان کی فیکٹری میں آگ لگ گئی تھی۔ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔" عالیان نے گہری نگاہ ان پر ڈالی تھی اور ان کی زیرک نگاہ اس کے اندر مچلتے سوال کو جان گئی تھی۔ وہ یکدم بھڑکے۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ وہ آگ میں نے لگائی تھی۔ میں ذمہ دار ہوں ان کی بربادی کا۔"

عالیان نے نظریں جھکائیں۔ پیشانی عراق آلود ہو گئی۔ باپ کے یوں بھید پالینے پر اسے شرمندگی نے گھیرا۔ دونوں میں تم میں یہ ہمت آگئی ہے کہ باپ سے سوال کر سکو۔"

"ایسی بات نہیں..... میں....." انہوں نے اس کی بات کاٹی، لہجہ سرد تھا۔

"کب چھوڑ رہے ہو۔ اس لڑکی کو، کیونکہ ہماری زندگیوں میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"سوری بابا، میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ نکاح

کیا ہے میں نے اس سے۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔
"تو نکل جاؤ میرے گھر سے۔" اس نے بے یقینی سے باپ کا پتھریلا چہرہ دیکھا۔
"بابا۔" تعبیر اور ارحم کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ "شاہنواز یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" فائقہ بیگم بھی خاموش نہیں رہ پائیں۔
"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس کو میرے فیصلے سے انکار ہے تو مجھے بھی ایسی نافرمان اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے منہ پھیر لیا۔
"اگر آپ کا دوسرا حکم یہی ہے تو سر آنکھوں پر میں چلا جاتا ہوں اس گھر سے۔"
"ایک شکایت ہے مجھے آپ سے۔ آپ کی محبت اور احترام میں میں نے ہمیشہ اپنی خواہش پر آپ کی خواہش اور فیصلے کو ترجیح دی مگر اس رات آپ کو اپنے بیٹے کی آنکھوں میں چھپی التجا اور اذیت کیوں نہیں نظر آئی۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں تھا کہ آپ میری خوشی کو مقدم رکھتے یا مجھے اس سزا سے بچا لیتے جو میں نے دس سال کی وہ اذیت وہ تکلیف جو کسی کی بربادی کی تھی میں آج بھی اس تکلیف میں مبتلا ہوں۔"
فائقہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ شاہنواز صاحب ہنوز رخ پھیرے کھڑے رہے۔
عالیان آنکھوں کی نمی اندر اتارتا۔ ایک نظر ماں پر ڈالتا تیز قدموں سے نکلتا چلا گیا۔
"میرے بیٹے کو روک لیں شاہنواز۔" فائقہ بیگم کا لہجہ التجا تھا مگر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئے۔
بت بنی تعبیر روتی ہوئی ماں کی جانب لپکی۔ ارحم نے باہر کی جانب دوڑ لگائی۔ اس کے گیراج میں پہنچتے ہی عالیان کی گاڑی تیزی سے بیرونی گیٹ سے نکلی اور وہ آوازیں دیتا وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

"یہ تو بہت برا ہوا۔" ارحم کی زبانی صبح کا واقعہ سن کر پریشے کو افسوس ہوا۔ آج آخری دو کلائنٹس کینسل ہونے کی وجہ سے وہ ڈرائیور کو فون کر کے گاڑی منگوانے کا سوچ رہی تھی جب ارحم کالج آ گیا۔ وہ کالج کے باہر ہی موجود تھا۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ قریبی کافی شاپ تک اسے لے گیا۔
"رابطہ ہوا عالیان بھائی سے۔" پریشے نے فکر مندی سے دریافت کیا۔
"فون پر مختصر سی بات ہوئی تھی۔ پر انہوں نے بتایا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ حنان بھائی بھی شہر میں نہیں ہیں ورنہ انہیں ضرور معلوم ہوتا۔" کافی کا گھونٹ بھرتا وہ پریشان سا لگا۔
"تمہاری طرف کیا حالات ہیں؟"
"خالہ خفا خفا سی ہیں۔ کل دادا ابو سے بھی شکایت کر رہی تھیں۔ وہ کہہ تو رہے تھے کہ آ کر تفصیل سے بات کریں گے۔ ابھی تو دادو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ نکاح والے روز بھی وہ اسی وجہ سے رک نہیں سکے تھے۔" اس نے تفصیلاً حالات سے آگاہ کیا۔
"مجھے تو یہ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا آخر یہ شادی چلے گی کیسے..... ایک طرف تمہارے والد اس نکاح کو ماننے کو تیار نہیں ہیں تو دوسری طرف خالہ کچھ سننے پر راضی نہیں ہوتیں۔ اگلے دس سال بھی کہیں اسی آنکھ مچولی میں نہ گزر جائیں۔" اس نے خدشے کا اظہار کیا۔
"مایوس نہ ہو، کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔ آخر یہ نکاح بھی تو سب کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ فی الحال تو میں عالیان بھائی کے ٹھکانے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔"
ارحم کے تسلی آمیز انداز پر پریشے کی ڈھارس بندھی۔
"ان کے باقی دوستوں سے پتا کرو۔"
"ہوں..... چلو تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔"
گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے گاڑی ریورس کی سڑک پر چہل پہل تو تھی مگر رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اطمینان سے گاڑی ڈرائیو کرتا وہ مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا کہ یک دم گلی سے ایک موٹر سائیکل خاصی تیزی سے نکلی۔ ارحم کے بریک

گاڑی لی تھی ہاتم نے اتنے ٹھنڈے مزاج کے تو نہیں لگتے تم۔" درحقیقت وہ اس کے اس کے نئے روپ کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ کتنا گہرا اور حساس تھا وہ۔

"بس تم نے تو مجھے جھگڑالو تصور کر لیا ہے۔" وہ اپنی جون میں لوٹا۔ "اور یہ تم جو موبائل کا رونا رو رہی ہو تو تھوڑے پیسے خرچ کر کے نیا لے لینا اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔" چند لمحوں کے لیے گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ بولی تو انداز بے حد سنجیدہ تھا۔

"تمہیں پتا ہے میرے لیے چیزیں اتنی اہم کیوں ہیں۔" کچھ تھا اس کے لہجے میں کہ ارحم گاڑی اسٹارٹ کرنا بھول گیا۔ نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔

"بہت غربت دیکھی ہے میں نے۔ ہمارے حالات ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے بہت مشکلات اٹھائی ہیں خالہ نے یہاں تک پہنچنے کے لیے۔ ماں باپ تو رہے نہیں تھے۔ خالہ پیسے جوڑ جوڑ کر میری فیس بھرتی تھیں۔ ایسے میں کھلونوں کو دیکھ کر میں دور سے پلٹتی رہتی۔ انہیں پانے کی خواہش اخراجات کے بوجھ تلے دب جاتی۔ اس لیے آج بھی میں اپنی چیزوں کو بہت سنبھال کر رکھتی ہوں۔ کیونکہ مجھے ان کی قدر و قیمت کا احساس ہے۔" لب کاٹتی وہ آنکھوں میں اتری نمی چھپا رہی تھی۔ ارحم کو شرمندگی نے گھیرا۔

آئی ایم سوری۔ مجھے تمہیں جج نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہر ایک کی زندگی مختلف ہوتی ہے اسی لیے شاید اس کے دیکھنے کا زاویہ بھی ایک سا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنا بچپن ماموں کے ساتھ گزارا ہے۔ وہ کہنے کو سوشل ورکر ہیں مگر ان کے ساتھ رہنے پر احساس ہوا کہ وہ صحیح معنوں میں ہمدرد اور انسان دوست ہیں۔ راہ چلتے انسان کی پریشانی بھی ان سے برداشت نہیں ہوتی۔ فوراً سے مدد کو تیار ہو جاتے۔" ان کے ذکر پر ارحم کے لب مسکرائے۔ "بس انہی کے ساتھ رہ کر میں نے سیکھا اور جانا کہ انسان کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ اپنی مذہبی تعلیمات کو بھول کر ہم اپنے الگ ہی معیار بنا لیتے ہیں۔ کبھی شاید انسان کی قدر و قیمت کم ہوتی جا رہی ہے۔" افسردگی سے بولتا وہ گاڑی

کرنے لگا۔

آنکھوں کی نمی صاف کرتی وہ ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھنے لگی۔ جانے اس سے اتنی اپنائیت کیوں محسوس ہونے لگی تھی کہ لگا ہیں پلٹنا بھول گئی تھیں۔

☆☆☆

دفتر میں بیٹھی وہ کام میں اس قدر مصروف تھی کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ مختلف ڈیزائنز کو چیک کرتی وہ ذہن میں ابھرتے ڈیزائنز کو بھی کاغذ پر اتارنے لگی۔ موبائل کی مسلسل بجتی گھنٹی نے اسے متوجہ کیا تو اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری جانب ارحم تھا۔

"عالیان بھائی سے کوئی بات ہوئی آپ کی۔ کچھ معلوم ہے وہ کہاں ہوں گے۔" اس کی پریشانی میں ڈوبی آواز پر وہ چونکی۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ سب خیریت ہے؟"

"بابا نے بھائی کو گھر سے نکال دیا ہے وہ آپ دونوں کے نکاح کے بارے میں سب جان گئے ہیں۔" ارحم کے لہجے سے پشیمانی جھلک رہی تھی۔ "وہ گھر سے نکلے تو ایک آدھ بار میری بات ہوئی۔ مگر اب کل شام سے ان کا موبائل بند ہے۔ پتا نہیں کہاں گئے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"تم ان کے دوستوں سے معلوم کرو۔ اس کے علاوہ کہاں جا سکتے ہیں۔" اس نے مشورہ دیا۔ فون رکھ کر وہ کام کی طرف متوجہ ہوئی۔ مگر کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ تھک کر اس نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کل کا منظر اس کے ذہن میں روشن ہو گیا جب وہ اچانک اس کے دفتر پہنچ گیا تھا۔

"آپ کیوں میرا سکون برباد کرنے آ جاتے ہیں۔" وہ سختی سے پیش آئی۔ تیکھے تیور عالیان کے چہرے پر تھے جہاں غیر معمولی سنجیدگی پھیلی تھی۔

"تھوڑا وقت دو کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔"

وہ میز کے دوسری جانب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ نہ

"آپ کیوں نہیں سمجھ جاتے عالیان صاحب کہ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں بچا۔ بہتر ہوگا آپ اپنا وقت برباد مت کریں بلکہ ایک احسان کریں مجھ پر۔ آزاد کردیں مجھے اس نام نہاد رشتے سے۔"

اشتعال کی لہر اٹھی تھی عالیان کے وجود میں۔ دونوں ہاتھ زور سے میز پر جماتا وہ آگے کو جھکا، سرخی مائل آنکھیں موی پر ٹھہر گئیں۔

"اس وقت ہمارے درمیان نکاح جیسا مضبوط رشتہ نہیں تھا کہ جس کو ڈھال بنا کر میں سب سے لڑ سکتا۔ تمہاری بے گناہی کا پرچار کرسکتا۔ مگر اب جب یہ رشتہ جڑ چکا ہے تو عالیان شاہنواز میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہے کہ اس کو بچانے کے لیے سب سے جنگ کرسکے چاہے اسے اکیلا ہی کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے۔ اب یہ رشتہ میری سانسوں کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔"

ٹھوس لہجے میں بولتا وہ جھٹکے سے سیدھا ہوا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

تصور ٹوٹا تو ایک خیال بڑی تیزی سے ذہن میں ابھرا کہ "کہیں جذبات میں وہ کچھ کرنہ لے۔ مگر وہ بچہ تو نہیں ہے۔" دل کی بے چینی پر خود کو حوصلہ دیا۔

"میری وجہ سے اگر کچھ ہوگیا تو....." مضطربانہ انداز میں کھڑکی پشت سے پیشانی مسلتی وہ سوچوں کے گرداب میں کچھ اس طرح سے دھنستی جارہی تھی کہ دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ جب بے چینی حد سے سوا ہوئی تو اس نے سرعت سے ارحم کو کال ملائی۔

"کچھ معلوم ہوا۔"

"جی حنان بھائی کو کال کی تھی۔ ان کے فلیٹ کی چابی عالیان بھائی کے پاس تھی۔ ان کے مہمانوں نے آنا تھا جنہیں بھائی نے ریسیو کرکے وہاں ٹھہرانا تھا مگر وہ مہمان کسی وجہ سے نہیں آسکے تو ہوسکتا ہے بھائی اسی فلیٹ میں موجود ہوں۔ میں فلیٹ کے باہر ہی کھڑا ہوں۔ کافی دیر سے بیل بجا رہا ہوں مگر کوئی دروازہ نہیں کھول رہا۔"

ارحم نے تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس سے اسے معلوم ہوگیا تھا کہ ایک شخص دو دن پہلے یہاں آیا تھا پھر کسی نے اسے دیکھا نہیں اور یہی بات اس کا دل ہولائے دے رہی تھی کہ اگر عالیان اندر تھا تو وہ دروازہ کیوں نہیں کھول رہا۔

"مجھے پتا بتاؤ میں آرہی ہوں۔" اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے اس نے ہینڈ بیگ اٹھایا۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں وہ آدھے گھنٹے کا راستہ محض پندرہ منٹ میں طے کرکے مطلوبہ پتے پر پہنچی تھی۔ فلیٹ کے دروازے پر پریشے اور ارحم موجود تھے۔ ارحم لاک کھولنے والے کو لے آیا تھا جو اب لاک کھول رہا تھا۔

"اللہ خیر کرے۔ عالیان بھائی ٹھیک ہوں۔" پریشے متفکر سی بولی۔ ارحم ..... کی کال سنتے ہی وہ بے تابی کا مظاہرہ کرتی فوراً پہنچ گئی تھی۔ لاک کھولنے کی آواز پر ان کے دل گویا ڈوب کر ابھرے۔

لاک والے کو فارغ کرکے وہ تیز قدموں سے اندر گھسے۔ ارحم نے عجلت میں نیچے کا پورشن دیکھا مگر وہ خالی تھا پھر اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر وہ دونوں بھی پیچھے لپکیں۔ اوپر چھوٹا سا سٹنگ ایریا تھا۔ جس کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آڑا ترچھا پڑا عالیان انہیں نظر آگیا۔ وہ بے سدھ پڑا تھا۔ ارحم جلدی سے قریب آیا۔ اسے چھوتے ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ بخار میں تپ رہا تھا۔

"بھائی..... عالیان بھائی۔" اس کے آوازیں دینے اور چہرہ تھپتھپانے پر اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی تو انہیں کچھ اطمینان ہوا۔

"ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔" موی نے تشویش سے۔

قریب میں میرے کلائنٹ کا کلینک ہے۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔" ارحم کہہ کر جلدی سے باہر چلا گیا۔ دس منٹ میں اس کی واپسی ہوئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرکے دوائیں کاغذ پر لکھ دیں اور ٹھنڈی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کرتا وہ رخصت ہوگیا۔

"یہ پٹیاں تو میں لے آیا تھا۔ آپ ایسا کریں ٹھنڈی پٹیاں رکھیں میں تب تک دوائیں لے کر آتا

ہوں۔" ارحم کے مخاطب کرنے پر موی چونکی۔ ایک نظر بے سدھ پڑے عالیان پر ڈالی۔ ایک بیمار شخص کے لیے وہ اتنا تو کر ہی سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" پر اعتمادی سے بولتی وہ شاپر سے پٹیاں نکالنے لگی۔

پریشے جلدی سے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی بھر لائی ساتھ والے سنگل صوفے پر آگے کو ہو کر بیٹھتے اس نے عالیان کے ماتھے پر پٹیاں رکھنی شروع کیں۔ اس کا ماتھا تو گرم توے کی طرح تپ رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ پٹیاں رکھتی رہی۔ ارحم دوائیں لے آیا۔ عالیان کا بخار کافی حد تک اتر چکا تھا۔ اس کے آنکھیں کھولتے ہی موی نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں اسے تکتا وہ کہنی کے زور پر آہستگی سے اٹھ بیٹھا۔ آنکھوں کی پتلیوں پر بے یقینی اتر آئی۔ اس نے کب تصور کیا تھا کہ وہ یوں اس کی عیادت کو آئے گی۔ اس کے نرم ہاتھوں کا لمس ہی تھا جسے محسوس کرتا وہ آنکھیں کھول بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں خود پر محسوس کرنے کے باوجود موی مصروف سے انداز میں پٹیاں سمیٹنے لگی۔ اس کی حالت سے محظوظ ہوتا ارحم کھنکارا اس کے متوجہ ہونے پر پریشے بول پڑی۔

"عالیان بھائی۔ آپ نے تو پریشان کر دیا ہم سب کو۔"

"موبائل بھی بند تھا آپ کا ساری رات میں نے پریشانی میں کاٹی۔" ارحم نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"ہوں..... موبائل کی بیٹری لو تھی شاید۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"پریشان تو آپ نے ہمیں اچھا خاصا کر دیا۔ بھابھی بھی اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر آئی بیٹھی ہیں۔" ارحم نے شرارت سے کہا۔ اس کی نظریں بھٹک کر بے نیاز بنی موی پر گئیں۔

"میں سوپ بناتی ہوں۔ دوائیں لیتی ہوں گی۔" وہ یہاں سے غائب ہونے کا جواز پیش کرتے ہوئے جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

اسی وقت عالیان نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چونک کر اس کی جانب گھومی۔ ایسی جسارت تو اس نے کبھی نہ کی تھی۔ وہ اسے ڈانٹ دینا چاہتی تھی۔ اس کی کمزوری کی گرفت سے ہاتھ چھڑا لینا چاہتی تھی۔ مگر اس کا بجھا بجھا چہرہ آنکھوں میں ہلکورے لیتی التجا۔ ٹوٹا بکھرا انداز دیکھ کر وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس پر ایک نظر ڈالنا گویا قیامت ہو گیا تھا۔ اس پر اس کے الفاظ "کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ پلیز....." اس انجانی سی کیفیت کا شکار وہ آہستگی سے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ ہنوز اس کے ہاتھ میں دبا تھا اور اس غیر متوقع منظر کو دیکھتی پریشے کا گویا حلق میں اٹکا سانس بحال ہوا۔

"آپ بیٹھیں ہم سوپ بناتے ہیں۔" مسکراہٹ چھپاتا ارحم جلدی سے بولا۔

"ہوں یہ ٹھیک ہے۔" پریشے خوش ہو کر اس کے ساتھ کچن کی جانب بڑھ گئی۔

کچن صاف ستھرا تھا اور اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ جو یقیناً ان مہمانوں کے لیے لائی گئی تھیں جو کسی وجہ سے نہ آ سکے تھے۔

"چیزیں تو ساری موجود ہیں۔ چلو اچھا ہے سوپ بن جائے گا۔" فریج سے سبزیاں نکالتا وہ اطمینان سے بولا۔

"مجھے تو سوپ بنانا نہیں آتا ایسا کرو بازار سے لے آؤ۔" ہچکچاہٹ کا اظہار کرتی آخر میں وہ مزے سے بولی۔

"تمہیں سوپ بنانا نہیں آتا۔" ہاتھ روک کر ارحم نے اسے شرمندہ کرنے والی نظروں سے گھورا۔

"ہاں تو میں پڑھائی میں مصروف ہوتی ہوں۔ کچھ پکانا وکانا نہیں آتا مجھے۔" بغیر شرمندہ ہوئے اس نے اعتراف کیا۔

"چلو پھر میں بناتا ہوں۔ ایسا مزے دار سوپ تم نے پہلے نہیں پیا ہوگا۔ میں اور ماموں اکثر کچھ نہ کچھ پکاتے رہتے تھے۔" ماہرانہ انداز میں سبزیاں کاٹتا وہ بولے جا رہا تھا۔ پریشے نے دلچسپی سے ارحم کا یہ روپ

دیکھا۔ اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھتے جانے کیوں اچھوتا سا احساس من میں جاگنے لگا۔

"یہ پڑھائی کا بہانہ تم لڑکیوں نے اچھا بنایا ہے۔ اب اگر تھوڑا بہت کچھ سیکھ لوگی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔" اپنی عادت سے مجبور وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔ مگر میٹھے سے احساسات میں گھری، لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کے ساتھ وہ سادگی سے بولی۔

"سیکھ لوں گی۔ ایسی کون سی بڑی بات ہے۔"

"سیکھ لو ورنہ شادی کے بعد آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا اور وہ بے چارہ جس سے تمہاری شادی ہوگی۔ تمہارے پھوہڑ پن کی شکایتیں لے کر روز بھابھی کی ناک میں دم کرنے آجایا کرے گا۔" چولہے پر پکتی کھچڑی کے نیچے آنچ آہستہ کرتا اسے وہ بھڑکانے کو بولا۔

پریشے کی برداشت بس یہیں تک تھی۔ پانی پینے غرض سے تھامے گلاس کو اس نے زور سے کاؤنٹر پر پٹخا سارے میٹھے جذبے گویا چولہے میں جا پڑے تھے۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے میں چاہے جل کر پانی بھی نہ پیوں۔ تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ساری عمر بازاروں اور ہوٹلوں سے کھاؤں میری مرضی۔ بڑے آئے ماسٹر شیف۔" بمشکل غصہ دبائی وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔ دل پر الگ تاؤ آرہا تھا جو نجانے اس کے بارے میں کیا کیا سوچے جارہا تھا۔

"ریلیکس اپنے میاں کا خرچا کراؤ گی۔ میرا کیا جارہا ہے۔" اسے پیٹے دیکھ کر وہ محظوظ ہوا۔

"سوپ پر دھیان دو۔ تمہارے سکھڑاپے کا پول بھی کچھ دیر میں کھل جانا ہے۔" طنز کرتی وہ خود کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کا گلاس لبوں سے لگا گئی۔

☆☆☆

مجھے نہ دیکھ، مگر اتنا بے خبر تو نہ بن
تیری طرف میرا قرض نکلتا ہے

ان کے بیچ معنی خیزی خاموشی سانس لے رہی تھی۔ اس کی قربت کا اثر تھا یا ارد گرد پھیلے حصار کا کہ وہ اس کے ہاتھ میں دبا اپنا ہاتھ کھینچ نہ سکی اس سے نظر ملانے سے خائف وہ پلکیں جھکائے ہوئے تھی۔ پر دل گویا ہتھیلی پر دھرا تھا جو اس کی محبت کی چاشنی پر دھیرے دھیرے پگھلنے لگا۔ ایک ہاتھ میں اس کا ہاتھ کسی متاع کی طرح تھامے دوسرے بازو کو صوفے کے بازو پر پھیلائے، اس پر ٹھوڑی ٹکائے، آگے ہو کر بیٹھا، قریب بیٹھی موی کو وہ محویت سے تک رہا تھا۔ جس کا نیم رخ اس کی جانب تھا۔ مگر چہرے پر پھیلتی سرخی نمایاں تھی۔

"موی۔" دھیمے لہجے میں ایسی مٹھاس تھی کہ موی گل کو اپنا دل بے ترتیب ہوتا محسوس ہوا۔

"تمہیں مجھ میں پہلے والا عالیان نظر نہیں آتا۔" حسرت سے پر لہجہ موی نے ہونٹوں پر زبان پھیری بولی تو لہجے میں تلخی مفقود تھی۔

"دس سال بہت ہوتے ہیں۔" ادھورا جملہ بھی جیسے اپنی جگہ مکمل تھا۔

"مگر میں تو ابھی بھی وہیں کھڑا ہوں۔ لائبریری کے کوریڈور میں۔ آگے بڑھنا بھی چاہوں تو بڑھ نہیں سکتا۔" موی نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ جس کے چہرے پر محبت کا ایک جہان آباد تھا۔

"میں آگے بڑھ گئی ہوں۔ اتنا کہ اب پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی چاہوں تو اذیت اور تکلیف کی بھٹی میں پستی لڑکی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ زہرا بی بی کی مینا اور عنایت اللہ کی موی گل تو کب کی ختم ہوگئی۔"

اس کی آنکھوں میں جھانکتے عالیان نے اس کے دکھ کو اندر تک محسوس کیا۔ یک دم موی کا موبائل بج اٹھا، کوئی طلسم سا ٹوٹا تھا جیسے۔ اس کے ہاتھ سے اپنا بھیگا ہاتھ سرعت سے کھینچا اور آنکھوں کی نمی کو اندر اتارتے کال اٹینڈ کی۔ وہ اسے تکتا رہا جو بڑی پر اعتمادی سے اپنے تاثرات چھپائے دوسری جانب موجود شخص سے بات کررہی تھی۔ دس سال پہلے والی موی سے قطعی مختلف، فیروزی رنگ کے جوڑے میں ملبوس، خوب صورت بالوں کی فرنچ بنائے جو

کندھے سے ہوتی کمر تک جا رہی تھی، وہ پٹاکہ ہوں پر چلتے سے پھیلائے وہ ایک پراعتماد اور کنگ دمن تھی۔ آئی تھی۔ مجھے لگا اس دن کی باتوں سے شاید آپ دل برداشتہ ہو کر کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھے ہوں۔" فون بند کرتی وہ بولی تو دوبارہ سے اپنے خول میں بند ہو چکی تھی۔

"یار تو ابھی بھی ہوں۔" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"اس سے زیادہ اعتبار ہی نہیں کر سکتی۔ یوں بھی اب آپ ٹھیک ہیں۔" وہی لاتعلق انداز۔

ان کے دیکھنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شرارت سے شعر پڑھتا وہ بالکل پہلے جیسا عالیان لگا۔

"کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہو گئے ہیں۔" طنز کرتی وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

"تمہاری موجودگی کا اثر ہے۔" وہ جذب سے بولا۔ اس کی بات کو نظر انداز کرتی وہ کھڑی ہوئی پھر سنجیدگی سے بولی۔

"گھر والوں سے دور رہ کر ایک دن میں یہ حال ہو گیا ہے۔ ضد چھوڑیں اور واپس چلے جائیں۔ خود پر یہ ظلم مت کریں تو بہتر ہے۔" تیزی سے سیڑھیاں اترتی وہ کچن کی طرف بڑھی۔ پریشے کو گھر چھوڑ کر اسے دفتر بھی پہنچنا تھا۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے موی نے اس پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ صرف کالج جائے گی اور وہاں سے سیدھا گھر آئے گی۔ ایسے میں سہیلیوں کے گھر جانے پر بھی پابندی تھی اور کالج کے اوقات کے دوران ڈرائیور گاڑی سمیت گیٹ پر رہتا موی کی اس پر کڑی نظر تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ارحم سے ملنے کی کوشش بھی کرے۔ اتنی پابندیوں پر وہ محض دل مسوس کر رہ گئی۔ اس دوران ارحم کو چھٹی مرتبہ کال کی وہ اپنی مصروفیت ظاہر کرتا فون بند کر دیتا اور وہ پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔

آج ہفتہ تھا، کالج سے چھٹی تھی۔ سو وہ صبح دیر سے بیدار ہوئی۔ تگڑے سے ناشتے کے بعد فی دی کے سامنے بیٹھی تو دوبارہ سے ارحم کو کال ملا دی مگر اس کا نمبر بزی جا رہا تھا۔ دس منٹ کی کوشش کے بعد اس نے جھنجلا کر دفتر کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب غالباً ریسپشنسٹ تھی۔

"ارحم سے بات کرواؤ۔"

"آپ میسج دے دیجیے میں پہنچا دوں گی۔" وہ اسے کلائنٹ سمجھی تھی شاید۔

"کیوں میں خود کیوں نہیں بات کر سکتی۔" پریشے پہلے ہی جلی بیٹھی تھی مزید تپ گئی۔

"فی الحال وہ مصروف ہیں۔"

"انہیں بتاؤ پریشے فرہاد کا فون ہے۔" غصہ دباتی وہ بولی۔

"آپ ان کی کون ہیں؟" انداز چبھتا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے تو وہ گڑبڑا گئی۔

"میں جو کوئی بھی ہوں تم انہیں فون دو۔"

"ارحم سر مصروف ہیں اور یوں بھی وہ ہر کسی سے بات نہیں کرتے۔ آپ فضول میں یہاں فون کر کے اپنا وقت برباد مت کریں۔" ارحم کا نام لگاوٹ سے لیتے ہوئے دوٹوک الفاظ بولتی وہ فون بند کر چکی تھی۔

پریشے کے تو تلوؤں پر لگی سر پر بجھی۔ کون تھی آخر جو اتنی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ موبائل میں گھس کر اس کی خبر لیتی اپنے اوپر بھی خوب تاؤ آیا۔ مگر کیا کرتی وہ کمبخت دل کو اچھا لگ گیا تھا اور اب بے چینی کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔ جب کسی طور چین نہ آیا تو کسی ہوا کے ہزار روکنے کے باوجود دوست سے ضروری نوٹس لینے کا بہانہ کر کے وہ ڈرائیور کو لیے گھر سے نکل گئی۔

ریسپشنسٹ پر نگاہِ غلط ڈالے بغیر وہ تیزی سے ارحم کے کمرے کی جانب بڑھی۔ کمرہ خالی تھا مگر میز پر پڑی چائے کی پیالیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ کچھ دیر پہلے یہاں دس بارہ لوگ موجود تھے۔ ریسپشنسٹ لڑکی

بڑائی ہوئی اندر آئی اور غصے سے اسے گھورا جو بڑے
تی سے کمرے میں موجود تھی۔
"کس سے ملنا ہے آپ کو اور یوں اجازت
کے بغیر کمرے میں کیوں تشریف لے آئی ہیں۔"
کمرے کا جائزہ لیتی وہ مڑی، سامنے کھڑی نئی لڑکی کو
دیکھا جو اسٹائلش جوڑے میں فل میک اپ کے
ساتھ کسی ماڈل سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اسے ہلکی سی
جلن ہوئی مگر ظاہر کرنا اس کی سرشت میں نہ
تھا، سو مزید اترائی۔
"ارحم کہاں ہے۔ مجھے زیادہ انتظار کرنے کی
عادت نہیں ہے۔"
"سر کلائنٹس کو چھوڑنے گئے ہیں۔ آپ پھر کسی
وقت آئیے گا۔" تیکھے تیوروں سے اس چھوٹے بالوں
والی لڑکی کو دیکھا جو میک اپ کے بغیر بھی کسی نوخیز کلی
کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔
"مجھے وقت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں
پریشے فرہاد ہوں۔" انداز شاہانہ تھا گویا کوئی جانی
پہچانی شخصیت ہو۔
"اچھا وہ فون والی۔" اسے بروقت
یاد آیا۔ "میں ارحم سر کی پرسنل سیکرٹری ہوں فضا اور بھی
بہت کچھ ہو سکتی ہوں۔" لبوں پر دل آویز مسکان
سجائے، معنی خیز انداز میں بولی تو پریشے کا گویا آدھا
خون جل گیا دوسرے لمحے اس کا جملہ بے ساختہ تھا۔
"اور میں ارحم کی منگیتر ہوں۔" اس کا متغیر ہوتا
چہرہ دیکھ کر خوب ہی مزا آیا۔ ابھی وہ تصدیق بھی نہ کر
پائی تھی کہ دروازہ کھلا۔ دونوں نے اندر آتے ارحم اور
نادر کو دیکھا۔
"سر یہ....." فضا شاک کی کیفیت میں تھی۔
"یہ کہہ رہی ہیں۔ آپ کی منگیتر ہیں۔" ارحم
نپٹایا، نارمل انداز میں کھڑی پریشے کو گھورا۔ نادر الگ
حیران پریشان تھا۔
"آں..... ہاں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" ارحم کے
اقرار پر جہاں فضا کا چہرہ تاریک ہوا وہاں پریشے کے
دل پر ٹھنڈی پھوار پڑی۔ فضا کے تیزی سے کمرے
سے نکلتے ہی ارحم اس کی طرف بڑھا۔
"یہ منگیتر والا کیا شوشا چھوڑا ہے۔" ایک ہاتھ
کمر پر رکھے وہ باز پرس کر رہا تھا۔ وہ گڑبڑائی۔
"ہاں تو عالیان بھائی اور خالہ کے سامنے بھی تو
ہم یہی ڈرامہ کر رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا تو کیا
ہوا۔ ویسے بھی یہ لڑکی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔ نیت
خراب ہے اس کی تم پر، پتا نہیں کیسے کیسے لوگ رکھ لیتے
ہو۔"
"بڑی مہربانی بہت بڑے نقصان سے بچا لیا
ہے آپ نے۔" ارحم نے طنز کیا۔
"فون کیوں نہیں اٹھا رہے۔ بہت مشکل سے
آئی ہوں میں۔"
"مصروف تھا بھئی۔"
"بڑے منسٹر لگے ہوئے ہو۔" پریشے کو بھی تاؤ
آیا۔
"منسٹر تو فارغ ہوتے ہوں گے۔ مجھے تو کام
کرنا ہے۔ تین رشتے پکے کرا چکا ہوں۔" وہ اترایا۔
"اچھا میں جا رہی ہوں۔ فون پر بات کروں
گی۔" عجلت میں کہتی وہ چلی گئی۔
"او بھائی یہ کیا ڈرامہ ہے؟" کونے میں کھڑا
نادر قریب آیا انداز کریدنے والا تھا۔
"ڈرامہ ہی سمجھ۔"
"مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔" مشکوک
نظروں سے ارحم کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھا۔
"چل پھر دیکھتے ہیں تیرے انداز نے نشانے پر
لگتے ہیں یا نہیں۔" محظوظ کن انداز میں ہنستا وہ اپنی
کرسی کی جانب بڑھا۔ "اور ہاں مس انیلا کو فون کر
کے پوچھو۔ کب تک واپس آئیں گی۔ میں تو خود مس
فضا سے تھک گیا ہوں یار کام پر تو دھیان ہوتا نہیں
ہے محترمہ کا۔" نادر نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

آج دفتر میں بیٹھے اسے کافی دیر ہو گئی تھی۔
بوتیک میں سارا دن گزر گیا تھا اسی وجہ سے بہت سا
کام ادھورا رہ گیا تھا۔ بوا اور پریشے کی بھی کافی کالز آ

چکی تھیں۔ باقی کا کام گھر لے جانے کا ارادہ کر کے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ موبائل کی تلاش میں میز پر نظریں دوڑائیں، مگر موبائل غائب تھا۔ کچھ دیر پہلے یہیں تو رکھا تھا۔ حیران ہوتے ہوئے وہ بیگ میں تلاش کرنے لگی مگر موبائل کہیں نہیں تھا۔ تشویش میں مبتلا وہ بیگ کا اسٹرپ کندھے پر ڈالتی دروازے کی جانب بڑھی۔ جوں ہی ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر گھمایا، اس پر ادراک ہوا کہ دروازہ باہر سے لاک تھا۔ دو تین بار مزید کوشش کی مگر دروازہ لاک تھا۔ اس کا دل لرز اٹھا۔ دفتر اس وقت تک خالی ہو چکا تھا اور وہ یہاں تنہا تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی چوکیدار اس سے اجازت لے کر گیا تھا۔

اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ جب چوکیدار اندر آیا تو اس نے ہوا سے بات کر کے موبائل میز پر رکھا تھا یعنی موبائل اسی نے غائب کیا تھا اور باہر لاک بھی وہی لگا کر گیا تھا۔ یہ چوکیدار مہینہ پہلے ہی رکھا گیا تھا۔ مگر وہ ایسا کیوں کرے گا اور کیوں کا جواب بھی جلد مل گیا۔ عاصم رضا کی صبح والی فون کال اور اس کی دھمکیاں جن کو وہ خاطر میں نہیں لائی تھی، اب ذہن میں گونجیں تو اس کے دل پر دہشت پھیلتی چلی گئی۔ وہ یہاں پھنس چکی تھی اور یقیناً اس سب کا مقصد خطرناک تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، دماغ الگ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔

"یا اللہ۔" لب پکار اٹھے۔

یک لخت دفتر کا فون بجا تو وہ بری طرح چونکی اور بھاگ کر میز تک آئی۔ جلدی سے فون سے لگایا۔

"موی۔"

"عالیان۔" اس کے لب ہلے۔ اس وقت اس کی کال کسی نعمت سے کم نہ تھی۔

"تمہاری گاڑی دیکھتے ہی مجھے شک گزرا تھا کہ تم ابھی تک دفتر میں بیٹھی ہو گی۔ شاباش نیچے آؤ تمہیں لے لیتا ہوں کہیں جاؤں گا۔" اپنی دھن میں وہ محبت سے بولا تو موی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"میں دفتر میں پھنس گئی۔"

اسی وقت فون ڈیڈ ہو گیا۔ دوسرے لمحے بجلی بند ہو گئی۔ اس کا سانس حلق میں اٹک گیا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی وہ دروازے کے قریب آئی۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے ذرا سی روشنی بھی کمرے تک نہیں آ رہی تھی۔ وقت سست رفتاری سے گزر رہا تھا اور وہ دم سادھے کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد کسی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔ ساتھ میں عالیان کی آواز آنے پر اس کی سانس میں سانس آئی اور وہ دروازے کی طرف لپکی۔

"موی تم پریشان نہ ہو میں دروازہ کھول رہا ہوں۔" اس نے تسلی دی تھی۔

موی اسے لاک کھولنے کا طریقہ سمجھانے لگی۔ کچھ عرصہ پہلے ہی اس نے یہ لاک لگوایا تھا جس کو باہر سے کھولنے کا مخصوص طریقہ تھا۔ چند منٹوں کی کوشش کے بعد لاک کھل گیا۔

دروازہ کھولتے ہی وہ بے ساختہ اس کی جانب بڑھی۔ کیسی ڈھارس ہوئی تھی اسے دیکھ کر۔

"موی تم ٹھیک ہو۔" عالیان نے اس کے ہاتھ تھام لیے، لہجے میں تشویش پنہاں تھی۔

"میں ٹھیک ہوں، یہاں سے چلیں۔" اپنے ازلے حواس قابو میں کرتی وہ بولی۔ پھر یونہی ہاتھ تھامے وہ سیڑھیاں اترتے نیچے پہنچے۔

"میری گاڑی میں بیٹھو میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔" وہ اپنی گاڑی کے پاس رکی تو عالیان بھی ساتھ ہی رک گیا۔ وہ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ وہ اسے اکیلے بھیجنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا نہ اس نے ابھی کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ اس سچویشن میں کیسے پھنس گئی۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک عالیان کے ہاتھ میں دبا تھا۔ احساس ہونے پر اس نے ہاتھ آہستگی سے کھینچا، مگر بولی تو لہجے میں انکار نہیں تھا۔

"چلیں میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

اس کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ دھماکے کی آواز ابھری۔ وہ سہم کر عالیان کے سینے سے جا لگی۔ اس کے گرد بازو حمائل کرتے اس نے اسے اپنی موجودگی کا

بر پور احساس دلایا۔ نظریں پریشانی سے اوپری منزل پر ٹکی تھیں۔ دھماکا اتنا بڑا نہیں تھا مگر نشانہ موی کے دفتر کو بنایا گیا تھا۔ آخر ایسا کون تھا جو اس کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔ ساتھ میں شکر گزاری کا بھرپور احساس دل میں سرایت کر گیا کہ وہ محفوظ تھی۔

''موی سب ٹھیک ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا اور نہ میں کسی کو تمہیں نقصان پہنچانے دوں گا۔'' ملائمت سے کہتا وہ تسلی دے رہا تھا۔ دایاں ہاتھ اس کے گھنے بالوں پر ٹھہر گیا تھا۔ اس کے لمس کو محسوس کرتی وہ آہستگی سے الگ ہوئی۔ چہرہ ضبط سے سرخ تھا۔ پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس کے قریب جانے کا تصور بھی نہ کرتی اس کے باوجود کہ وہ اس کا محرم تھا۔ مگر ان لمحات میں وہ کئی کیفیات کا شکار تھی۔ نگاہوں میں اس کے لیے ڈھیروں احترام اتر آیا تھا۔ جو اس کا محسن تھا۔ وہ پولیس اور فائر بریگیڈ کو کال ملا رہا تھا۔ ساتھ میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مگر کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز پر وہ موبائل جیب میں ڈالتا مڑا۔ دفتر کی عمارت کے پچھلے حصے سے کوئی بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

''موی تم گاڑی میں بیٹھو۔'' اسے ہدایت دیتے عالیان نے اپنی پتلون کی جیب سے پستول نکالا تو اس کا ارادہ بھانپتی موی اندر تک لرز گئی۔

''عالیان نہیں پلیز چلیں یہاں سے۔'' موی نے اس کا بازو تھاما۔

''گاڑی میں بیٹھو موی۔ میں اسے جانے نہیں دوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ خود کو چھڑاتا وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ شخص یک دم سامنے آیا۔ عالیان کو دیکھ کر ٹھٹکا یا۔ یہاں کسی کی موجودگی اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔

''ہتھیار پھینک دو۔'' عالیان کا انداز نڈر تھا۔ گھبراہٹ کا شکار وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مخالف سمت سے ایک گاڑی تیز رفتاری سے قریب آئی۔ گولیوں کا کھیل تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور نے گولیاں چلائی تھیں۔ فضا گولیوں کے شور اور موی کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ وہ شخص دوڑ کر گاڑی میں سوار ہوا اور وہ دونوں لمحوں میں فرار ہو گئے۔ موی بھاگ کر اس کے قریب آئی اور گرنے کے سے انداز میں اس کے پاس بیٹھی۔ ایک گولی اس کا بازو چھوتے ہوئے گزر گئی تھی جبکہ دو سینے پر لگی تھیں۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور وہ آنکھیں جھپک جھپک کر کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے اثرات نمایاں تھے۔

''عالیان۔'' اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر اسے ہوش آیا تھا۔ اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے موبائل نکالا۔

''موی۔'' وہ شاید کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ جلدی سے ایمرجنسی ڈائلر سے شاہنواز سلطان کا نمبر ڈھونڈ کر اب انہیں کال کر رہی تھی۔ وہ اب شاید کلمہ پڑھ رہا تھا۔ الفاظ ادھورے رہ گئے وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گیا اور موی کی گویا سانسیں تھمنے لگیں۔ دوسری طرف کی بیل سنتی وہ عالیان کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی جبکہ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

☆☆☆

رات کے ایک بجے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں اس وقت شاہنواز صاحب کا پورا گھرانہ موجود تھا۔ آئی سی یو کے باہر موجود ویٹنگ ایریا کے صوفے پر بیٹھی فائقہ بیگم مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھی تعبیر خود بھی آنسو بہا رہی تھی۔ فائقہ بیگم کی نظریں بار بار کچھ فاصلے پر بیٹھی اس لڑکی کی جانب اٹھیں جسے وہ دس سال کے بعد دیکھ رہی تھیں۔ وہ پلک تک بیٹھی خلاء میں گھور رہی تھی، چہرہ انتہائی سرخ تھا اور آنسوؤں کے چند مٹے مٹے نشان واضح تھے۔ آئی سی یو کے باہر اضطرابی کیفیت میں ٹہلتے شاہنواز صاحب نے ناپسندیدگی سے اس لڑکی کو دیکھا پھر سر جھٹک کر بیٹے کے لیے قرآنی آیات کا ورد کرنے لگے۔ ان کے ساتھ ٹہلتا ان کا داماد انہیں بیٹھنے کی تلقین کر چکا تھا مگر وہ نہ مانے۔ ارحم فائقہ بیگم کی حالت دیکھ کر ان کے لیے پانی لینے گیا تھا۔

کچھ دیر بعد تیز قدموں کی آواز گونجی۔ شمسی بوا اور پریشے پریشان سی مومی کی طرف لپکیں۔ یہ خبر ملتے ہی پریشے نے ڈرائیور کو کال کر کے بلا لیا تھا۔ وہ صبح تک کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔

''خالہ آپ ٹھیک ہیں نا اور عالیان بھائی۔'' پریشے کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بے ساختہ تھے اور جیسے اس کا ضبط کا پیالہ چھلک پڑا۔ چہرہ دونوں ہتھیلیوں میں چھپائی وہ کچھ اس طرح بلک بلک کر روتی چلی گئی کہ باقی نفوس اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ شاہنواز صاحب نے لب بھینچ لیے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ فائقہ بیگم کا دل گداز ہوا۔ کسی کی بھی پروا کیے بغیر وہ اٹھ کر مومی کے قریب گئیں جسے شمسی بوا نے ساتھ لگا رکھا تھا۔ پریشے اپنے آنسو صاف کرتی ابھی تک کھڑی تھی۔ فائقہ بیگم نے قریب بیٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ساتھ لپٹی دونوں کچھ اس شدت سے روئیں کہ باقی تینوں کی آنکھیں بھی بھیگتی چلی گئیں۔ ان کو اپنی تکلیف آدھی ہوتی محسوس ہوئی اور کیوں نہ ہوتی کہ ان کا دکھ ایک سا تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جسے ان کے بیٹے نے بہت چاہا تھا اور پھر ان کی اس سے کوئی ذاتی پرخاش نہ تھی۔ کل بھی حالات تھے جو ان کے درمیان آ کھڑے ہوئے تھے اور آج بھی حالات انہیں قریب لانے کا سبب بنے تھے۔

سرد مہری سے اپنی اہلیہ کے عمل کو دیکھتے شاہنواز صاحب خاموش رہے کہ یہ وقت روک ٹوک کا نہیں تھا۔

☆☆☆

فجر سے کچھ پہلے ہی آپریشن ختم ہوا تھا اور ڈاکٹر نے آ کر خوش خبری سنائی کہ عالیان اب خطرے سے باہر ہے۔ کچھ دیر میں اسے کمرے میں منتقل کر دیا جائے گا۔

دعا کر کے وہ جائے نماز لپیٹ رہی تھی جب پولیس کے اہلکار آ گئے۔ اے ایس پی نے شاہنواز صاحب سے ہاتھ ملایا۔

''سر آپ کی اجازت ہو تو ہم بیان لینا چاہتے ہیں۔''

''بیان ضرور لیجیے گا مگر ابھی اسے پریشان مت کریں۔ آپ دوپہر تک چکر لگائیے گا۔''

''بیان میں دوں گی۔ آپ میرا بیان لیجیے۔'' مومی پراعتمادی سے چلتی قریب آئی۔ وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

''یہ قاتلانہ حملہ میرے اوپر کیا گیا تھا جس کی لپیٹ میں عالیان شاہنواز آ گئے۔ بلکہ میرے منجدھار تک پولیس کو لے کر میری فیکٹری پہنچ چکے ہوں گے۔ جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔'' پھر تمام تفصیلات انہیں بتانے لگی ساتھ میں اس نے عاصم رضا کا نام بھی لیا جو رقم کے تقاضے کے لیے اس کو کافی عرصے سے دھمکا رہا تھا۔

ان کے جاتے ہی ارحم ہسپتال کی کینٹین سے سب کے لیے چائے اور سینڈوچز لے آیا۔ اس کے اصرار پر مومی نے آدھا سینڈوچ اٹھا لیا ورنہ دل تو کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ بوا کو صبح ہوتے ہی اس نے گھر بھیج دیا تھا۔ پریشے زبردستی رک گئی تھی۔ شاہنواز صاحب کو ان کی موجودگی کھل رہی تھی مگر وہ مصلحتاً خاموش تھے اور اب جبکہ وہ انہیں جانے کا کہنا بھی چاہ رہے تھے تو خود سے مخاطب کرنے میں ہچکی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کے پیشنٹ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے اور اب وہ ہوش میں ہیں۔ آپ لوگ ان سے مل سکتے ہیں۔'' نرس نے آ کر اطلاع دی۔ تشکر سے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے فائقہ بیگم اپنی جگہ سے بے ساختہ اٹھیں۔ شاہنواز صاحب ان کے منتظر کھڑے تھے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ مڑ کر مومی کو دیکھنے لگیں جو اس خبر پر مطمئن سی نظر آئی۔

''مومی گل تم بھی آؤ بیٹا۔'' ملائمت سے اسے دعوت دیتے ہوئے غالباً وہ شاہنواز صاحب کی موجودگی کو فراموش کر بیٹھی تھیں۔ تعبیر نے باپ کا سپاٹ چہرہ دیکھا البتہ ماتھے کی شکنیں واضح تھیں۔ ارحم اور پریشے کی نظریں ملیں جن میں حیرت و خوشی کا ملا جلا

ہڑ چھپا تھا۔ خود موی گویا ٹھٹک گئی۔ اس کے لبوں نے حرکت کرنے سے پہلے ہی شاہنواز صاحب بول پڑے۔

"یہ لڑکی میرے بیٹے کے کمرے میں ہرگز نہیں جائے گی۔"

ان کی جانب بڑھتے شخص کے قدم گویا زمین نے جکڑ لیے۔

"شاہنواز یہ عالیان کی بیوی ہے۔" فائقہ بیگم نے احتجاج کیا۔

"میں اس تعلق کو نہیں مانتا نہ ہی عنایت اللہ کی بیٹی میری بہو بن سکتی ہے۔" جتاتا ہوا اٹل لہجہ سختی لیے ہوئے تھا۔

یہ منظر دیکھتے شخص کی آنکھیں نم ہوئیں۔

موی کے اندر کی پراعتماد لڑکی بیدار ہوئی۔ دو قدم اٹھاتی وہ ان کے مقابل کھڑی ہوئی۔

"میں یہاں اس لیے ہوں کہ آپ کے بیٹے نے میری جان بچائی ہے۔ محسن ہے وہ میرا اور میں عنایت اللہ کی بیٹی ہوں۔ ہم دشمنوں کو تو بھول سکتے ہیں مگر محسنوں کو نہیں بھلاتے۔"

یہ سچ تھا کہ دس سال بعد عالیان کو دیکھ کر اس کے سرد جذبات میں کوئی تلاطم برپا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ پھر جب وہ بیمار ہوا تو اس کی قربت پا کر وہ پگھلنے لگی تھی۔ دل ہمک ہمک کر اس کی خواہش کرتا مگر وہ خود پر جبر کیے رہی۔ دل کو سمجھاتی رہی کہ اس کے متعلق سوچنا بھی اسے زیب نہیں دیتا اور اب بھی خدا گواہ تھا کہ ایک بار بھی اس کے ساتھ کی خواہش یا ایسا کوئی خیال تک اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ وہ سارے تعلق بحال کرنے کا سوچتی۔

"جہاں تک اس نکاح کی بات ہے تو میں خود بھی اس کے حق میں نہیں تھی اور نہ اس کو نبھانے کی خواہش ہے۔ اپنے خاندان کی بربادی اور تباہی کو بھولی نہیں ہوں میں۔ جس میں آپ کے گھرانے کا نام سرفہرست ہے۔" اس کے جتاتے انداز کو انہوں نے بغور دیکھا۔ "عالیان کو معاف کر دیا ہے میں نے۔ اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

"مجھے نہیں اگر یہ غلط فہمی ہے کہ تمہارے باپ کی فیکٹری میں آگ میں نے لگائی تھی تو یہ جھوٹ ہے۔ ایسی اوچھی اور گری ہوئی حرکت گھٹیا لوگ کیا کرتے ہیں۔ ہم نہ دھوکا دیتے ہیں نہ دھوکے کو پسند کرتے ہیں۔" وہ بھی کہہ گئے۔ موی نے سلگ کر ان کی طرف دیکھا۔

"تو آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ عنایت اللہ بے ایمان اور دھوکے باز تھے۔ تحقیق کی تھی آپ نے؟ نہیں آپ نے صرف سزا سنائی تھی۔"

اس شخص کو وہاں کھڑے رہنا مشکل لگا تھا۔

"میرا منیجر ثبوت کے بغیر مجھے اطلاع نہیں دیتا۔ آج بھی اس فائل کے ساتھ ثبوت کے طور پر اس میٹریل کی تصاویر اور چند حصے پڑے ہیں۔" شاہنواز صاحب بپھرے..... "اس لڑکی کا جواب طلبی کا سا انداز انہیں کھل رہا تھا۔

"میں نہیں مانتی آپ کے ثبوت تو جھوٹے ہو سکتے ہیں مگر میرا باپ دھوکے باز نہیں ہو سکتا۔" اس کا مضبوط لہجہ اور آنکھوں میں ہلکورے لیتے یقین نے سب کو خاموش کر دیا۔

"خدا کی قسم! عنایت اللہ دھوکے باز نہیں تھا۔" اس نم آواز پر سارے یک دم مڑے۔ وہ شخص چند قدم اٹھاتا آگے آیا۔

"میں تھا وہ دھوکے باز جس نے اپنے دوست سے دغا کی۔ اس سب کا ذمہ دار میں تھا۔" گیسو درد تھا اس کی بوڑھی آنکھوں میں۔

موی نے تھرا کر انہیں دیکھا۔ یہ سلیم انکل کیا کہہ رہے تھے اسے اپنی سماعت پر شک گزرا۔ وہاں موجود سارے نفوس دم سادھے کھڑے ان کے انکشافات سن رہے تھے۔

"میرا تعلق ایک پسماندہ گاؤں سے ہے۔ ہمارا گھرانہ شروع سے غربت کی چکی میں پستا آیا ہے۔ میرے دادا نے قرضے پر کچھ مربوں کی زمین

خریدی تھی مگر بدقسمتی کہ زمینیں تباہ ہوگئیں۔ جس کے سب انہیں وہ بیچنی پڑیں۔ مگر اس عرصے میں قرضہ سود کے باعث بڑھتا چلا گیا۔ ہماری فصلیں قرضے کے بوجھ تلے دب گئیں۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں مزدوری کر کے اپنی پڑھائی مکمل کرتا رہا پھر حکومتی امداد مل گئی تو پڑھ لکھ گیا۔ شہر میں نوکری کرنے لگا مگر قرضے کی تلوار ہنوز ہمارے سروں پر منڈلاتی رہی۔ جس کے ختم ہونے کی امید بھی دم توڑ گئی۔ میری عنایت اللہ سے گہری دوستی ہوگئی۔ وہ بھی گاؤں سے شہر آ کر پاؤں جما رہا تھا اور اپنی محنت اور ایمانداری کے بل بوتے پر جلد کامیاب ہوگیا۔ مجھے بھی اس نے ساتھ شامل کرلیا۔ وہ میرے تمام حالات سے بخوبی واقف تھا۔ میری تنخواہ بھی اچھی ہوگئی تو کچھ بوجھ ہٹ گیا۔ میرے چار بیٹے تھے جنہیں میں مشکلوں سے پڑھا رہا تھا۔ سب ٹھیک چل رہا تھا کہ عنایت اللہ کے کاروباری حریف شایان ٹریڈرز کے مالک کو عنایت اللہ کی بڑھتی ہوئی ساکھ چبھنے لگی۔ پھر جب شاہنواز صاحب اور چند بڑی کمپنیوں نے اسے چھوڑ کر ہمارا انتخاب کرنا شروع کیا تو وہ یقیناً تڑپ اٹھا۔ تبھی کاروباری حلقوں میں شاہنواز صاحب اور عنایت اللہ کی رشتہ داری کی خبر گرم تھی۔ اس وقت شایان ٹریڈرز نے میری مجبوری کو نشانہ بنایا۔ ان کا منیجر میرے گاؤں کا تھا وہ میرے حالات سے پوری طرح واقف تھا۔ انہوں نے مجھے پیشکش کی کہ میں اگر مال تبدیل کردوں تو وہ میرا سارا قرضہ اتار دیں گے۔''

میں نے بہت سوچا۔ یہ میرے لیے بہت مشکل فیصلہ تھا۔ ایک طرف دوست تھا تو دوسری طرف ایک نسل کی زندگیوں کا سوال تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ میری بیوی اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ پھر فیصلہ ہوگیا اور میں نے سوچ لیا کہ ایک بار قرضہ معاف ہوجائے تو اپنے یار کے قدموں میں بیٹھ جاؤں گا۔ شاہنواز صاحب سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ اور سب ٹھیک ہوجائے گا۔ مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ مہندی والے روز مال بھیجنے کا انتظام کر کے میں گاؤں روانہ ہوگیا۔ اس دن سارے معاملات طے ہوگئے اور ہمارا قرضہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ مگر میں یہاں پہنچا تو سب تباہ ہوچکا تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ خراب مال کی خبر اتنی جلدی پہنچ جائے گی۔ میرے حساب سے شادی کے بعد یہ کھاتا کھلنا تھا۔ مگر عنایت اللہ کو زندگی اور موت سے لڑتے دیکھ کر میرا وجود گویا شعلوں پر لوٹ گیا۔ تب بچا ہی کیا تھا کہ میں اقرار کرتا۔ میرا دوست میری وجہ سے موت کو گلے لگا بیٹھا۔ اسی روز فیکٹری میں آگ لگ گئی جو کہ شایان ٹریڈرز کی جانب سے آخری کیل ثابت ہوئی اور تحقیقات کی نوبت ہی نہ آسکی۔ سارا مال ساتھ ہی جل کر راکھ ہوگیا۔ سب نے شاہنواز صاحب کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا مگر میں پچھتاوؤں میں گھرا اپنے جرم کا اعتراف بھی نہ کرسکا۔ کرتا بھی کس سے۔ وہ تو منوں مٹی تلے جا سویا تھا جس کے اعتبار کا خون کیا تھا میں نے۔''

سلیم صاحب کے لفظوں میں نوحے بول رہے تھے۔ باقی سب کی آنکھیں بے یقینی سے کھلی تھیں۔ دس سال بعد کس راز سے پردہ اٹھا تھا۔ شاہنواز صاحب کی آنکھوں میں ندامت اتر آئی۔ نظریں اس لڑکی پر اٹھیں جس کا سب سے زیادہ نقصان ہوا تھا اور اس پر تو جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

''موی بیٹی کا نکاح رکوا کر عالیان سے کروانے کے پیچھے یہی مقصد تھا کہ میں اپنے گناہ کا کچھ تو کفارہ ادا کرسکوں۔'' وہ آنکھوں میں آنسو لیے ہاتھ جوڑتے موی کی جانب مڑے۔

''میں اس لائق تو نہیں مگر معافی کا طلب گار ہوں۔ کیا تم مجھے معاف کرسکتی ہو۔'' آنسو ٹوٹ کر پلکوں سے جدا ہوئے تو اس نے رخ پھیر لیا۔

''آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' چاہ کر بھی وہ لہجہ سخت نہ بنا سکی۔ جس شخص کو اس نے ہمیشہ باپ سمجھا اس کو دھتکارنا آسان نہیں تھا۔ جھکے کندھوں کے ساتھ، نم آنکھیں پونچھتے وہ جانے کے لیے

مڑ گئے۔ پر یشے تھک کر صوفے پر گر سی گئی۔ آنسو بے قابو ہو کر رخسار پر بہہ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر اکیلے رہنا چاہتی تھی اور سب نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ اب جانے کتنی دیر گزر گئی تھی یوں خود فراموشی کی حالت میں بیٹھے۔ آنکھیں خشک ہو گئیں مگر تکلیف اور اذیت تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

عالیان سے مل کر آتا حنان ٹھٹک گیا، نظریں کونے میں افسردہ سی بیٹھی موی گل پر تھیں۔ اسے پہچان کر وہ قریب جا کر کھنکارا۔ موی چونکی مگر وہ جس کیفیت کا شکار تھی سامنے کھڑے شخص کے لیے اس کی آنکھوں میں شناسائی نہ اتر سکی۔

''آپ موی گل ہیں نا۔'' حنان کے پوچھنے پر وہ سر ہلاتی کھڑی ہوئی۔

''میں حنان عالیان کا جگری دوست۔'' اس کے تعارف کراتے ہی وہ پہچان گئی۔

''معاف کیجیے گا میں.....''

''کوئی بات نہیں عرصہ بھی تو بہت گزر گیا ہے۔ آپ تو میرا نام تک بھول گئی ہوں گی۔'' وہ خاموش رہی۔ ''آپ کو یہاں دیکھ کر یہ یقین تو ہو گیا کہ آپ کو اس کی پروا ہے۔ پر اندر جانے پر ابھی بھی گریزاں ہیں۔'' نئے انکشافات سے بے خبر وہ اسے جانچتی نظروں سے دیکھتا بولا۔

''اور وہ دیوانہ۔'' حنان کے لب مسکرا اٹھے۔ موی نظریں جھکا گئی۔ ''ہر آنے والے کے لیے اس کی آنکھوں میں ایک ہی سوال ہے۔ آپ کہاں ہیں اور اس سے ملنے کیوں نہیں آئیں۔ صبح سے دس بار آنٹی سے آپ کی خیریت بھی دریافت کر چکا ہے۔'' اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی، نگاہیں خلاء میں اٹھیں۔ ''دس سال پہلے بھی یونہی موت اور زندگی کی جنگ لڑا تھا وہ۔''

موی نے بے اختیار نگاہیں اٹھائیں۔

''اس کا پچھتاوا نہیں جاتا تھا کہ اس نے ایک بے قصور لڑکی کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں اسے۔ اپنی کی گئی زیادتی وہ کبھی نہیں بھولتا۔'' گہرا سانس لیتا وہ بولا تو انداز دوستانہ تھا۔ ''آپ سے صرف یہ کہوں گا کہ اس نے بہت لمبا انتظار کیا ہے اپنے جرم کی پاداش میں اور اس مفاد پرست اور خود غرض دنیا میں کون کرتا ہے ایسا لاحاصل انتظار۔ آپ کا نصیب معجزاتی طور پر اس سے جڑ گیا ہے تو اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے میں آپ کا ہی فائدہ ہے اور ایک بزنس وومن منافع کی اچھی خاصی پرکھ رکھتی ہے۔'' آخر میں وہ پر مزاح انداز میں بولا۔ جواباً وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

''چلتا ہوں خوش رہیے۔'' نہایت عزت و احترام سے الوداع کہتا وہ مڑ گیا۔ جبکہ وہ ہونٹ کاٹتی اس کے لفظوں کی بازگشت سنتی رہی۔

کچھ فاصلہ طے کرتے ہی سامنے سے آتے ارحم اور پریشے حنان کی نظر بھیڑ ہو گئی۔ ارحم فوراً آگے بڑھ کر بغل گیر ہوا۔

''بیمار کی تیمارداری کرنے کے بجائے تم دونوں باہر پھر رہے ہو۔'' حنان شوخی سے بولا۔

''ہم انرجی ڈرنک پی کر آ رہے ہیں تاکہ اچھے طریقے سے تیمارداری کی جا سکے۔ باوجود اس کے کہ بھائی کو ہماری تیمارداری کی قطعاً ضرورت نہیں۔''

ارحم کے جواب پر حنان نے لمحے بھر کے لیے مڑ کر دیکھا پھر معنی خیز انداز میں بولا۔

''مبارک ہو کیونکہ جس خاص تیمارداری کی ضرورت تمہارے بھائی کو ہے وہ اس ذمہ داری کو نبھانے پر راضی ہے۔'' دونوں کی متذبذب نظریں اٹھیں اور موی کو عالیان کے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر وہ ساری بات سمجھ گئے۔

☆☆☆

''صبح بھی تم نے جوس پورا نہیں پیا۔ اب یہ سوپ تو پینا پڑے گا۔'' دوسرے ہی چمچے پر اس کے منع کرنے پر سوپ پلاتے ہوئے فائقہ بیگم نے پیار سے ڈپٹا۔

''بس ماما!'' اس نے بچوں کی طرح منہ بنایا۔
''پی لیں بھائی۔ ابھی تو خدمتیں کروانے کا موقع ملا ہے۔'' تعبیر شرارت سے بولی۔
''ماما اسی کو پلا دیں۔ اسے بہت شوق ہو رہا ہے خدمتیں کرانے کا۔'' اتنے عرصے بعد وہ جواباً اسے چھیڑ رہا تھا۔ تعبیر کو اپنے بھائی پر ڈھیروں پیار آیا۔
''چپ کر کے پیو۔'' فائقہ بیگم اسے بخشنے کو تیار نہ تھیں۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ تینوں نے مڑ کر دروازہ کھول کر اندر آتی موی گل کو دیکھا جس کے چہرے پر جھجک واضح تھی۔
''موی آجاؤ بیٹا۔'' فائقہ بیگم خوش دلی سے مسکرائیں۔
''طبیعت کیسی ہے آپ کی؟'' اپنی طرف دیکھتے عالیان سے پوچھا۔
''بہتر ہوں۔ تم ٹھیک ہو؟'' وہ محض سر ہلا گئی۔ نظریں جھک گئیں۔
''دیکھو ذرا کیسے بچوں کی طرح منتیں کروا رہا ہے۔'' فائقہ بیگم ہلکے پھلکے انداز میں بولیں۔
''میں کوشش کروں۔'' سادگی سے کہتی وہ ان کے قریب آئی۔ حیرت خوشی کے ملے جلے احساسات میں گھری وہ اسے سوپ کا پیالہ پکڑا گئیں۔
''تم اسے سوپ ختم کرواؤ ہم آتے ہیں۔'' تعبیر کو اشارہ کرتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔ ان کے جاتے ہی موی نے چمچے میں سوپ بھر کر عالیان کے منہ کی طرف بڑھایا، جس کی نگاہیں اس پر ٹھہر گئی تھیں۔
''کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔'' موی نے پلکیں اٹھائیں۔
''شک ہے تو چھو کر دیکھ لیں۔'' اس نے حقیقتاً بائیں ہاتھ بڑھا کر اس کی ہتھیلی چھوئی جس میں چمچہ تھامے وہ منتظر تھی۔
''اب پی لیں ورنہ آنٹی ناراض ہوں گی۔'' وہ خاموشی سے سوپ پینے لگا۔ جانچتی نظریں اس کے سنجیدہ چہرے پر تھیں۔ اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ اور وجود گہری افسردگی میں لپٹا محسوس ہوا۔
''کچھ ہوا ہے تو مجھے بتاؤ پلیز۔'' سوپ ختم ہوتے ہی وہ بے چینی سے بولا۔
کرب سے آنکھیں میچتی وہ تھکی ہوئی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ آنسو پھر سے آنکھوں میں جمع ہونا شروع ہو گئے اور وہ سلیم انکل کی زبانی سنی داستان دہرانے لگی۔ عالیان حیرت کی تصویر بنا تمام حقائق سنتا رہا۔

☆☆☆

روز دفتر جانے سے قبل وہ اس کے پاس چکر لگاتے۔ آج وہ کمرے میں اکیلے تھے تو عالیان نے جھجکتے ہوئے ان کی صورت دیکھی۔
''آج ڈاکٹر سے ملاقات کروں گا۔ کب تک ڈسچارج کریں گے تمہیں۔'' صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھے وہ چائے پی رہے تھے۔
''بابا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بہت دکھ پہنچایا اپنے فیصلوں سے اور آپ کو غلط سمجھ کر۔'' اتنے دنوں سے وہ جو بات کہنے کی ہمت کر رہا تھا آج اس نے کہہ ڈالی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے سنجیدگی سے بات شروع کی۔
''وقتی طور پر دکھ ہوا تھا۔ برا بھی لگا۔ پر اب سوچتا ہوں قدرت کے فیصلے درست ہوتے ہیں۔ ورنہ اس بچی کی ساتھ ہوئی زیادتی کا مداوا کیسے ہو پاتا۔ ماضی میں کچھ غلطیاں میری بھی تھیں جن کا اب شدت سے احساس ہوتا ہے۔ غصے اور جلد بازی میں کیے گئے فیصلے اکثر نقصان کا موجب بنتے ہیں کیونکہ ان میں جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس روز اگر میں عنایت اللہ کو موقع دیا ہوتا تو شاید وہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔ نہ وہ بھلا شخص یوں اذیت ناک موت کا شکار ہوتا اور نہ اس کا گھرانہ تباہ و برباد ہوتا۔'' شاہنواز صاحب کے لہجے میں گہری ندامت تھی۔
عالیان نے طویل سانس لیا، چہرے پر افسردگی پھیل گئی۔ کہنے کو جیسے کچھ بچا نہ تھا۔
''اب تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تو ہم اپنی

بہو کو گھر لے آئیں۔" اپنا اضطراب چھپاتے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔

"اس بچی نے ہم سب کو معاف کر کے بڑی اعلا ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں بھی اس کی خوشیاں لوٹانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" چائے ختم کر کے ڈسپوزیبل کپ میز پر دھرتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ موی گل کا ذکر انہوں نے اتنی نرمی سے کیا تھا کہ عالیان کو اچھا لگا۔ اگر وہ باپ کے دل میں جھانک سکتا تو جان لیتا کہ موی کی قدر ان کے دل میں بہت بڑھ گئی تھی جس نے ان کے ندامت بھرے دو جملے سن کر انہیں خوش دلی سے معاف کر دیا تھا۔ اور ان کے دل کا بوجھ اس کے اس عمل سے کسی قدر کم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آج عالیان کو ڈسچارج ہونا تھا اس لیے وہ دفتر سے واپسی پر ہسپتال آ گئی۔ باہر ارحم سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمرے کی طرف بڑھی۔

"آیئے بھابھی..... آیئے۔" اس کے لیے احترام سے دروازہ کھولتا وہ ایک طرف ہوا۔ موی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اندر کا ماحول خاصا خوشگوار تھا۔ وہ سلام کرتی فائقہ بیگم سے ملی۔ عالیان گود میں رکھے اخبار سے نظریں اٹھا کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔ جو تھکی تھکی سی اب فائقہ بیگم کے برابر بیٹھ چکی تھی۔

"طبیعت کیسی ہے؟" اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھی۔" بشاشت سے جواب دیا گیا۔

"بھابھی دیکھیے ذرا۔ آپ کی بھانجی اور میری بہن صاحبہ نے تو پکنک اسپاٹ سمجھ لیا ہے ہسپتال کو، کب سے بیٹھی گپیں لگائے جا رہی ہیں اور ساتھ میں یہ کھانا پینا بھی چل رہا ہے۔" طنزیہ انداز میں کہتے ارحم نے پرس اور جوس کے خالی ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تم کیوں جل رہے ہو ہماری دوستی سے۔" تعبیر حسب معمول مقابلے پر بولی جبکہ فائقہ بیگم اور موی مسکرا دیں۔ عالیان نے محظوظ ہوتے ہوئے اخبار پر توجہ مرکوز کی۔

"موی پریشے اتنی سویٹ ہے کہ ہماری فوراً دوستی ہو گئی بلکہ ہمارے شوق بھی کافی حد تک ایک جیسے ہیں۔" تعبیر محبت سے بولی۔

"اب تو بچوں کی بھی دوستی ہو گئی ہے۔ کہہ رہے ہیں پریشے کو ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"آپ کے بچے بھی آپ پر ہی گئے ہیں۔ بے تکلف ہونے میں لمحہ نہیں لگاتے۔" ارحم نے ہنستے ہوئے چوٹ کی۔ اس کی بیٹی پریشے کی گود میں چڑھی ہوئی تھی تو بیٹا جڑ کر بیٹھا تھا۔

"جو پیار کرتا ہے بچے اسی کی طرف جاتے ہیں۔" تعبیر نے جواباً کہا۔

"اب بھلے یہ محترمہ دل میں پیچ و تاب کھا رہی ہوں کہ کب یہ بچے جان چھوڑیں گے۔"

"جی نہیں۔" پریشے احتجاجاً بولی، خشمگیں نظروں سے اسے گھورا بھی۔

"ہر کوئی تمہاری طرح نہیں ہوتا۔" تعبیر کہاں چپ رہنے والی تھی۔

اتنے عرصے بعد بچوں کے کھلے چہرے دیکھ کر فائقہ بیگم خوش ہوتی موی کی جانب مڑیں۔

"موی میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" ان کے بولنے پر سب کی زبانوں کو بریک لگا ورنہ یہ لڑائی طول پکڑتی جاتی۔

"جی کہیے۔"

انہوں نے مسکرا کر ایک نظر عالیان کو دیکھا جس نے سر کو ہلکا سا خم دیا۔

"میں پریشے کو بھی اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت ہے۔" اس غیر متوقع بات پر موی حیران ہوئی۔ نظریں عالیان سے ملیں جو مسکرا رہا تھا۔ پھر پریشے کو دیکھا جو پہلے سٹپٹائی پھر اس کے چہرے پر پھیلتی سرخی اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر وہ ان کی جانب مڑی جو بات جاری رکھے ہوئے تھیں۔

"تم پریشے کی سرپرست ہو اس لیے میں

تمہاری مرضی جاننا چاہتی ہوں۔ تمہاری اجازت ہوگی تو ہم گھر آئیں گے اور کسی بڑا سے بھی بات کریں گے۔" ان کے لہجے کا مان اس کا دل شاد کر گیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جب مرضی آئیں۔" وہ مسکرائی تو فائقہ بیگم نے اسے ساتھ لگا لیا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹے کو لپٹا کر پیار کرنے لگیں۔ بیٹے نے کن انکھیوں سے ارحم کو دیکھا جو بے نیازی سے تعبیر کے بیٹے کو گود میں بٹھائے گدگدیاں کر رہا تھا۔

یقیناً اس کی مرضی سے یہ بات کی گئی ہوگی اور یہ سوچتے ہی اس کے دل میں بہت سے پھول کھل اٹھے۔

☆☆☆

اپنے اور ارحم کے رشتے پر خوش ہونے کے باوجود دل میں آس سی تھی کہ وہ کچھ تو کہے۔ رشتے پر خوشی کا اظہار کردے مگر جتنی بار بھی اس سے سامنا ہوا وہ بے نیاز رہا۔ ابھی وہ اسی الجھن میں تھی ارحم کا فون آ گیا۔

"کب سے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ تم بھی سوچتی ہوگی یہ میرے گھر والوں نے کیا نیا شوشا چھوڑ دیا ہے۔" نا سمجھی سے اس کی بات سنتی وہ ٹھٹکی۔ "عالیان بھائی جو خود سمجھتے آ رہے ہیں وہی انہوں نے ماما سے کہہ دیا اور اب یہی ہے کہ سب ہمارے رشتے کی بات کر رہے ہیں لیکن تم پریشان مت ہو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔" پریشے جیسے گنگ رہ گئی تھی۔ سارے خواب چھناکے سے ٹوٹے تھے۔

"ہیلو سن رہی ہو نا۔" اس کی خاموشی پر ارحم نے پکارا تو وہ بمشکل خود کو سنبھالتی بول پائی۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ میں نے بھی یہی کہنا تھا۔" اس نے جھٹ سے فون بند کیا۔ چہرہ شدت جذبات سے دہک اٹھا تھا۔ آنکھوں میں آئی نمی کو بے دردی سے رگڑتی وہ تپ اٹھی۔

"سمجھتا کیا ہے خود کو میں کون سا مری جا رہی ہوں اس سے شادی کرنے کے لیے — ہونہہ۔" غصے کی مد میں اس نے اپنے اوپر قابو پا لیا تھا کہ اسے اپنی عزت نفس بے حد عزیز تھی۔

اگلے دن اس کی بے چینی حد سے سوا ہوگئی جب فائقہ بیگم باقاعدہ کسی بڑا اور مونی سے روایتی انداز میں بات کرنے آ گئیں۔ ساتھ میں وہ انگوٹھی بھی لائی تھیں جو انہوں نے بڑی محبت سے اس کی انگلی میں پہنا دی۔ تعبیر کی شرارتی چھیڑ چھاڑ پر وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ جاتے جاتے فائقہ بیگم کہہ گئی تھیں کہ شاہنواز صاحب خود آئیں گے مونی کے سلسلے میں بات کرنے۔

اسے شدید غصہ آ رہا تھا کہ آخر عالیان بھائی اور خالہ کی شادی کے بجائے سب اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی اس نے ارحم کو فون کر کے فوراً گھر پہنچنے کا کہا اور اب وہ گرمی کی پروا کیے بغیر گیٹ کے پاس چکر لگا رہی تھی۔ اس کے آتے ہی پریشے نے غضب ناک انداز میں اسے گھورا۔

"کیا ہو گیا ہے۔ خون خوار بلی کی طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔"

"یہ کیا ہے۔" اس کی بات کو نظر انداز کرتے اس نے اپنے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی دکھا کر پوچھا۔

"انگوٹھی ہے اور کیا ہے۔ یہ دکھانے کے لیے تم نے مجھے اتنی ایمرجنسی میں بلایا ہے اور میں بھاگا چلا آیا کہ پتا نہیں کیا افتاد آن پڑی ہے۔" ارحم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"یہ ہماری ملکی منگنی کی انگوٹھی ہے جو آنٹی مجھے پہنا گئی ہیں اب چاہے تمہیں پروا نہ ہو مگر مجھے بہت پروا ہے۔ جھوٹی منگنی کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے مجھے۔"

"تم خوامخواہ بتنگڑ بنا رہی ہو ایک انگوٹھی ہی تو ہے۔ دو چار دن بعد لوٹا تو گھر والے خوش ہو جائیں گے۔" ارحم نے دل ہی دل میں محظوظ ہوتے ہوئے اسے مزید چھیڑا۔ نتیجتاً وہ اور آگ بگولا ہو گئی۔

"میں نے ٹھیکا نہیں اٹھایا ہوا سب کو خوش کرنے کا، وہ بھی جھوٹ موٹ کی منگنی کر کے۔ تم ابھی اسی وقت عالیان بھائی کو فون کرو اور انہیں ہمارے

ارے کے بارے میں بتاؤ تاکہ اس کا ڈراپ سین ہو سکے۔" وہ شکی انداز میں بولی۔ آج اسے بخشنے کے موڈ میں بالکل نہ تھی۔

"اب میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ کوئی لڑکی مجھے یوں منہ بھر کر انکار کر دے۔" مصنوعی افسوس سے اس آتش فشاں بنی لڑکی کو دیکھا۔ "اچھا خاصا ڈیشنگ ہوں۔ مس فضا تو یہی کہتی ہیں۔"

فضا کا نام سنتے ہی اس کو تو گویا بچھو لگ گئے۔

"پھر اس فضا سے ہی شادی کر لو۔ وہ خاصی انٹرسٹڈ ہے تم میں اور ویسے بھی تمہاری جس سے شادی ہوگی نا وہ سر پکڑ کر روئے گی۔"

"اچھا اور کیا خصوصیات ہوں گی اس میں، ذرا روشنی ڈالنا۔" ارحم نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"سر پھری اور انتہائی درجے کی احمق ہوگی تبھی تو تم سے شادی پر رضامند ہوگی۔ ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے جو تم جیسے جذبات سے عاری پتھر دل انسان سے شادی کرے جسے لڑکیوں کے نازک جذبات تک کی پروا نہیں ہوتی۔" دل کی بھڑاس نکالتی وہ لفظوں پر غور کیے بغیر بولتی چلی گئی۔

"ایک لڑکی ہے تو سہی اور یہ دونوں خصوصیات بھی اس میں موجود ہیں اور مجھے اچھی بھی بہت لگتی ہے۔" ارحم کے مزے سے کہنے پر وہ تھم سی گئی۔

"کون؟" لب بے ساختہ ہلے۔

"یہی جو میرے سامنے کھڑی ہے۔" شرارت سے اسے دیکھا جو پہلے تو نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہی پھر یک دم سٹپٹائی، دل کی دھڑکن بے ربط ہوئی۔

"اب کیا کروں تم سے باتیں سننے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جب تک دن میں دو تین بار تم سے عزت افزائی نہیں کروا لیتا میرا دن ہی نہیں گزرتا۔"

"یہ تم نے مجھے پرپوز کیا ہے۔" اس کے عجیب سے الفاظ پر وہ حیرت سے بولی۔

"اور کیسے کرتے ہیں۔"

"کوئی طریقہ ہوتا ہے پرپوز کرنے کا بھی۔"

"ہاں میں تو دن میں تین چار بار کرتا ہوں جیسے۔" ارحم نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بندہ کوئی بکے لے آتا ہے۔ کتنا شوق تھا مجھے کہ میرا منگیتر سرخ گلاب کا بکے لے کر آئے۔" اس نے منہ بنایا۔

"رکو۔" وہ جلدی سے اس کے لان سے سرخ گلاب توڑ لایا۔ پھر کھنکار کر اسے دیکھا جس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"مس پریشے فرہاد! کیا آپ ارحم شاہنواز کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھنا پسند فرمائیں گی۔"

"کیا۔" پریشے کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

"اوہو..... ری ٹیک کر لیتے ہیں۔ ہاں تو مس پریشے فرہاد کیا آپ شاہنواز صاحب کے ہونہار بقول ان کے نالائق بیٹے سے شادی کرنا چاہیں گی۔" اس کے شوخ انداز پر وہ ہنستی چلی گئی ساتھ میں اس نے پھول تھام لیا۔ ارحم بھی کھل کر مسکرا دیا۔ جانے یہ لڑکی کب اس کے دل میں یوں اتر گئی کہ اس کی ہمراہی کی خواہش شدت اختیار کر گئی تھی۔

☆☆☆

یہ وقت بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

صبح کا وقت تھا۔ سورج کی شعاعیں لکڑی کے بے رنگ دروازے پر پڑ رہی تھیں۔ اندر آؤ تو چھوٹا سا صحن تھا جس کے گھنے سایہ دار درخت کے نیچے دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ جن میں سے ایک پر وہ شکستہ سے بیٹھے تھے، ہاتھ میں تسبیح تھی جس کے دانے مسلسل گرائے جا رہے تھے۔ درمیان میں کچھ لمحوں کا وقفہ آتا جب وہ ہاتھ روک کر آنکھوں میں پھیلتی نمی کو صاف کرتے۔

کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھتی موی گل مضطرب سی دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ یہ در و دیوار اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ یہاں چند بار آ چکی تھی اور بچپن کے وہ مناظر کل سے اس کے ذہن کے پردے پر ابھرتے چلے جا رہے تھے۔ یہ سلیم صاحب کا آبائی گھر تھا اور آخری دفعہ وہ ان کی

والد کی علالت کے باعث ان سے ملنے آئے تھے اور رات میں ہی وہ وفات پا گئے تھے۔

یک دم وہ منظر آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب وہ اور باجی چارپائی پر بیٹھے ہوئے کھلے آسمان پر ستارے تلاش کر رہی تھیں اور قریبی چارپائی پر لیٹے وہ بزرگ اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ قریب رکھے موڑھوں پر عنایت اللہ اور سلیم صاحب مؤدب سے بیٹھے تھے۔

"پتر۔" ان کا روئے سخن عنایت اللہ کی جانب تھا۔

"اپنے بھرا دا خیال رکھیں۔ اے غلطی پہلے کردا اے تے معافی بعد اچ منگدا اے۔ کرن تو پہلے سوچدا نہیں اے۔"

"چاچا جی۔ تسی فکر نہ کرو۔ اے میرا بھرا اے میرا یار اے۔" ابا جی کی آواز پر اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر دیکھا۔ ابا جی نے اپنا ہاتھ سلیم انکل کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔

آنکھوں میں پھیلتی دھند نے اسے حال میں لا کھڑا کیا۔ اس نے آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے صاف کیں۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی ان کے گھر میں کھڑی تھی اور اس کی وجہ ان کی بیوی کی وفات تھی جس کا سن کر وہ سب جنازے میں شرکت کے لیے ان کے آبائی گاؤں آ گئے تھے۔ آج دوسرا دن تھا اور انہیں دوپہر تک روانہ ہونا تھا۔

قدم قدم چلتی موی گل چارپائی کے قریب آ رکی۔ آہٹ پر انہوں نے نگاہ اٹھائی پھر شرمساری کے باعث جھکا گئے۔ وہ جب سے آئی تھی ان سے ہم کلام نہ ہوئی تھی۔

"بی بی جان کا افسوس ہے مجھے۔" اس کی چپ ٹوٹی۔ انہوں نے افسردہ آہ بھری۔

"آخری وقت تک تمہارے پاس جانے کی ضد کرتی رہی۔ معافی مانگنا چاہتی تھی۔ مگر جانتی نہیں تھی کہ ہمارا گناہ معافی کے لائق نہیں۔ ہم سزا کے مستحق ہیں۔"

موی نے بے اختیار ان کو دیکھا جن کی بوڑھی آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو تھے جس میں انہیں باقی کی عمر بھی جلنا تھا۔ اور کیا تھا ان کے پاس، کیا پایا تھا انہوں نے اپنے بھائیوں جیسے دوستی کو دھوکا دے کر۔ آج وہ اپنے آبائی گھر میں اکیلے پڑے تھے۔ جس وہ اولاد جس کے مستقبل کے لیے اپنی دوستی تک داؤ پر لگا دی تھیں وہ اسے چھوڑ کر پردیس سدھار گئی تھی۔ بے حسی اور لاتعلقی اتنی تھی کہ وہ ماں کو کندھا دینے کے روادار بھی نہ تھے۔ اور سزا تو شاید بھی شروع ہو گئی تھی جب ان کی وجہ سے پہلے دوست دنیا چھوڑ گیا اور پھر جان سے پیارا بھانجا جوان کا سب سے فرماں بردار اور محبت کرنے والا بیٹا تھا۔ اور اب اس دکھ اور پچھتاوے کے ساتھ انہیں اس چھوٹے سے گھر میں تنہا ہی زندگی کے دن کاٹنے تھے۔ کوئی اذیت سی تھی جو موی کو اندر سے کاٹنے لگی۔ وہ گھبرا کر مڑی تو وہ بولے۔

"اپنے انکل کو سزا نہیں سناؤ گی۔" قدم زمین نے جکڑ لیے، آنکھیں بھیگنے لگیں تو وہ ان کی جانب مڑی۔

"میں موی گل ولد عنایت اللہ آپ کو معاف کرتی ہوں۔" حوصلے سے بولتی وہ انہیں دیکھ رہی تھی جو کچھ لمحوں کے لیے دنگ رہ گئے تھے اور ہکا بکا تو تحسن تک آتی پریشے بھی رہ گئی تھی۔ پھر وہ بھاگ کر موی سے لپٹ گئی۔ دونوں کے آنسو بہنے لگے۔ موی سے الگ ہوتی وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی جو اب سر ہاتھوں میں تھامے زار و قطار روئے چلے جا رہے تھے۔ ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی پریشے ان کے سینے سے لگ گئی۔ جو کچھ بھی ہوا مگر سچ یہ تھا کہ وہ ان سے نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے دادا تھے، اس کے باپ کا واحد رشتہ۔

موی نے آسمان کی جانب دیکھا۔ ایک سکون سا اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ مرحلہ کٹھن سہی مگر اس نے اپنی اعلا ظرفی سے اسے طے کر لیا تھا اور بے شک معاف کر دینا بڑا افضل عمل ہے۔

☆☆☆

ابھی جگنو نہیں روٹھے
ابھی آنسو نہیں ٹوٹے
ابھی سورج نہیں جاگا
ابھی تارے نہیں ڈوبے
ابھی مہتاب باقی ہے
ابھی اک خواب باقی ہے
ابھی منزل نہیں آئی
ابھی رستہ نہیں ٹھہرا
ابھی جنگل نہیں گزرا
ابھی دریا نہیں اترا
ابھی گرداب باقی ہے
ابھی اک خواب باقی ہے
ابھی طوفان نہیں ٹھہرا
ابھی آنکھوں میں جل تھل ہے
ابھی سینے میں ہلچل ہے
ابھی کھڑکی میں بارش ہے
ابھی کمرے میں بادل ہے
ابھی برفاب باقی ہے
ابھی اک خواب باقی ہے
ابھی قصہ ادھورا ہے
ابھی پوری کہانی ہے
ابھی سارا بڑھاپا ہے
ابھی آدھی جوانی ہے
ابھی اس پار جانا ہے
ابھی جھیلوں میں پانی ہے
ابھی رستے میں دلدل ہے
ابھی اک پیاس باقی ہے
ابھی اک خواب باقی ہے

کارڈ پر لکھی اس خوب صورت نظم کو پڑھتے اس کے لب مسکرا اٹھے۔ کارڈ کو واپس سنگار میز پر رکھتے، آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ آف وائٹ رنگ کی ساڑی کو چھوٹی میکسی جس پر ہلکے گلابی اور سنہری رنگوں کا مناسب صورت نگوں والا نیٹس کام کیا گیا تھا۔ اس کے ملیح سراپے پر خاصی جچ رہی تھی۔

ساتھ میں گولڈ کی خوب صورت ڈیزائن کی جیولری پہن رکھی تھی۔ چہرے پر پالر والی کے ماہر ہاتھوں سے کیا گیا میک اپ جس نے اس کے حسین نقوش کو کچھ اور دل کش بنا دیا تھا۔ روایتی انداز میں اوڑھے دوپٹے کو ہاتھ سے درست کرتی وہ مطمئن اور خوش نظر آ رہی تھی۔ واش روم کا دروازہ کھولتا عالیان باہر نکلا۔ سیاہ رنگ کی پینٹ کے اوپر اس نے سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ موی کو کمرے میں موجود دیکھ کر مسکرایا اور خود بھی اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ آئینے میں نظر آتے اس کے حسین روپ کو دیکھ کر کچھ لمحوں کے لیے وہ مبہوت ہوا پھر جھک کر برش اٹھا لیا اور اپنے بھیگے بالوں میں پھیرنے لگا لبوں پر شرارتی مسکراہٹ آ ٹھہری۔

''خاتون آپ کو پہلے کبھی دیکھا نہیں یہاں۔''
اس کے عکس کو دیکھتی وہ مسکرائی۔

''اس کمرے میں عالیان صاحب رہتے ہیں جو کل شام اپنی بیوی کو لے کر آئے ہیں پر شاید ان کی یادداشت کچھ کمزور ہو گئی ہے۔ اب دیکھ کر پہچانتے ہی نہیں۔'' حاضر جوابی سے بولتی وہ آئینے میں اسے سیاہ رنگ کا کوٹ پہنتے دیکھ رہی تھی۔

''اونہوں۔'' نرمی سے اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔

''بھول جانا ہماری سرشت میں نہیں کل سے یہ کمرہ اور میں حیرت سی اس اچھی لڑکی کو تکے جا رہے ہیں۔ پر ہمیں اپنی خوش نصیبی پر یقین ہی نہیں آ رہا۔'' اس کے گمبھیر لہجے پر موی کی پلکیں کچھ لمحے کے لیے جھکیں پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ اعتماد سے بولی۔

''آپ دونوں کو یقین دلانے کے لیے ہم اور لیٹ نہیں ہو سکتے۔ سب جا چکے ہیں اور اب ہمارا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔''

''تو کیا ہوا۔ تھوڑا انتظار کر لینے دو آخر ہم چیف گیسٹ ہیں۔ ہمارے ویسے کا ریسپشن ہے۔ لیٹ ہو جانے سے ہماری اہمیت میں کوئی فرق نہیں آئے

گا۔" اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسٹول پر بٹھاتے وہ خود دوسرا اسٹول کھینچ کر اس کے عین سامنے بیٹھ گیا۔

"عالیان یہ کیا بچپنا ہے۔" اسے فرصت سے خود کو دیکھتا پا کر وہ احتجاجاً بولی۔

"بیوی کو دیکھنا بچپنا نہیں محبت کہلاتا ہے۔" گویا معلومات میں اضافہ کیا گیا۔ بولتی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔

"یہی کرنا تھا تو اتنا بڑا ریسپشن دینے کی کیا ضرورت تھی۔"

"کیونکہ میں چاہتا تھا پورا شہر، ہمارے ولیمے میں شرکت کرے اور میں علی الاعلان سب کو بتاؤں کہ عنایت اللہ کی بیٹی موی گل میری بیوی ہے۔ وہ عنایت اللہ جن کی ایمانداری میں کھوٹ نہیں تھا بس وہ کچھ حاسدوں کی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔" اس کے مضبوط لہجے پر اس کی آنکھوں میں نمی جھلملائی تو عالیان نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ خود کو سنبھالتی وہ مسکرائی۔

"اب اور لیٹ مت کریں۔"

"کچھ دیر تو مجھے اپنے کمرے میں گزار لینے دو۔ کل سے یوں بھی ہم نے تمہارے گھر میں شفٹ ہو جانا ہے۔" وہ مصنوعی بے چارگی سے بولا۔ موی نے طے کیا تھا کہ جب تک ارحم اور پریشے کی شادی نہیں ہو جاتی وہ اس کے گھر میں رہیں گے۔

"سال کی ہی تو بات ہے۔"

"اس شرط میں کچھ ترمیم کر دو پلیز۔ ان بے چاروں پر بھی یہ ظلم نہ کرو۔" اس نے ان کی طرف داری کی۔

"اچھا میں سوچوں گی۔ ابھی مجھے میرا ولیمہ انجوائے کرنے دیں۔" وہ مسکرائی پھر کچھ خیال آنے پر جھجک کر اسے دیکھا۔

"عالیان وہ۔۔۔ بوا۔۔۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے موی۔ بوا کو ہمارے گھر میں بھی وہی عزت و احترام ملے گا جس کے ساتھ وہ تم لوگوں کے ہاں رہتی آئی ہیں۔" اس کی یقین دہانی پر اس کا دل شاد ہوا۔

"ولیمے کے بعد ہمیں ایک اور اہم کام کرنا ہے۔"

"وہ کیا۔" موی نے پوچھا۔

"اماں جی کے فرمودات پر ایک کتاب لکھنی ہے۔" اس کی آنکھوں اور لبوں پر کھیلتی شرارت پر موی نے مصنوعی ناراضی سے اسے گھورا۔

"مذاق اڑا رہے ہیں موی کی سادگی کا۔"

"بالکل نہیں۔ اس خالص اور سادہ سی موی کو بڑے پیار سے دل میں رکھا ہے ہم نے جناب۔"

"اور یہ والی موی۔" سرشاری سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے آ کر باقی کی جگہ بھی ہتھیالی ہے اور اب کسی کی گنجائش نہیں بچی۔" آہ بھرتے ہوئے اس نے بے بسی کا مظاہرہ کیا۔

"ماما جو کہہ رہی تھیں آپ اتنے سالوں سے خاموش رہنے لگے تھے۔ اب بتاؤں کی کتابو لنے لگے ہیں۔" اسے کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ بھی مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس پھر طے ہوا۔ واپس آتے ہی کتاب لکھنا شروع کرتے ہیں۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھی وہ شرارت سے باز نہ آیا۔

"اچھا ہے نا، ہمارے اور ارحم پریشے کے بچے بھی مستفید ہوں گے۔" اس کے جملے پر موی کی بے ساختہ ہنسی گاڑی میں گونجنے لگی تو گاڑی ڈرائیو کرتا عالیان اس کی خوشی کو محسوس کرتا سرشار ہو گیا۔

وقت کا کام گزرنا ہے، اچھا ہو یا برا بہر حال گزر ہی جاتا ہے۔ وہ دونوں بھی اپنے حوصلے اور ثابت قدمی کے باعث اپنی زندگی کے مشکل دور سے نکل آئے تھے اور اب انہیں یقین تھا کہ زندگی کے کینوس پر ابھرتے رنگ ان کا دامن انمول خوشیوں سے بھرنے والے تھے۔

☆☆☆

تمینہ مشتاق

میرے ہمراہ

سنہری گھر کے وسیع سرسبز لان میں ڈھلتی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی جب اس سالہ حنا نے اسے مخاطب کیا۔

"ارے واہ امی! آج آپ نے ہمیں چائے کے شغل میں شامل نہیں کیا۔" سنہری مسکرادی۔

"بس بیٹا آج اپنے ساتھ وقت گزارنے کا موڈ تھا۔"

"کیوں امی خیریت؟" حنا نے تجسس سے پوچھا۔

سنہری نے سامنے رکھی کیتلی سے چائے ایک کپ میں انڈیل کر اس کے آگے سرکادی۔

"وقت کی منڈیروں پر یادوں کے ٹمٹماتے چراغ کبھی کبھی نہ صرف روح میں ایک عجیب سی سرشاری بھر دیتے ہیں بلکہ شام کی چائے کا لطف بھی دوبالا کر دیتے ہیں۔" سنہری نے مسکرا کر اپنی بیٹی کو دیکھا دور افق پر ڈوبتا سورج گزرے وقت کی داستانیں بھی ساتھ لے کر ڈوب جاتا ہے۔

"مجھے بھی سنائیں یہ گزری داستان۔" حنا ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"وقت بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔" سنہری پھر گویا ہوئی۔ "ہر گزرتا لمحہ قیمتی ہے اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں کوئی اس کا مالک نہیں یہ کسی کی نہیں سنتا بس چپ چاپ دبے پاؤں گزرتا ہے اور اپنے پیچھے کئی قہقہے آہیں و سسکیاں چھوڑ جاتا ہے پھر یادیں زیست کے زخموں کو سیتی رہتی ہیں اور ایک دن ان یادوں کی یاد بھی یاد کم گشتہ بن کر زندگی کے ڈھلتے سورج کے ساتھ وجود کی خاک میں دفن ہو جاتی ہے۔"

"میں یہ سب سننا چاہتی ہوں امی! کیا پتا آپ کی سنہری یادیں میرا بھی قیمتی سرمایہ بن جائیں۔" حنا نے اصرار کیا۔

"ٹھیک ہے۔" سنہری نے حنا کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور ماضی کے جھروکے کھولے۔

☆☆☆

فرید ولا میں فرید احمد کی بڑی بیٹی نگہت کی آج مہندی تھی۔ سنہری نے جوتا چھپائی کی رسم میں اکلوتی اور لاڈلی سالی ہونے کے ناطے پچاس ہزار کی خطیر رقم کی جس پر بڑی لے دے کے بعد ہمشیرہ نے پچیس ہزار تک دے کر سب لڑکیوں سے جان چھڑائی تھی۔

فرید احمد ایک بہن اور دو بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور دو بیٹیوں کے باپ تھے نگہت کی شادی فرید ولا کی پہلی شادی تھی اس ہی لیے مہندی فنکشن میں سب نے خوب ہی ارمان نکالے تھے۔ شادی کے گھر میں آج کی گہما گہمی سے سب تھک ہار کر اپنے اپنے کمروں میں بستر جما چکے تھے۔ لیکن سنہری کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور ایک میسج ٹائپ کیا۔

"نیند نہیں آرہی!"

دوسری جانب سے فوراً جواب آیا۔

"میرے بازو پہ سر رکھو آجائے گی۔"

جواب پڑھ کر سنہری مسکرادی۔

"مجھے آپ یاد آرہے ہیں۔"

"تو مل لو۔" دوسری جانب سے محبت بھرا جواب آیا۔

"کیسے؟ کسی نے دیکھ لیا تو؟" سنہری نے اپنا خدشہ لکھ بھیجا۔

"تو..... ایسی کی تیسی سب کی، تم ہو ہی میری، یاد رکھو۔" پیار بھرا جواب آیا سنہری جواب پڑھ کر ہنس پڑی، موبائل کی اسکرین پھر جگمگائی۔

"باہر آؤ! میں کمرے کے باہر کھڑا ہوں۔"

سنہری کی تو جان ہی نکل گئی۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے برابر میں بے خبر سوئی نگہت آپی کو دیکھا اور دبے قدموں سے چلتے ہوئے دروازہ کھولا۔

اندھیرے میں سامنے کھڑے سائے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دونوں چھت کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

"حد ہے شرجیل!" سنہری کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ "کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"کون دیکھے گا؟ سب سو رہے ہیں گھوڑے بیچ کے..... اور میں ہوں تو کس بات کا ڈر ہے۔ کوئی کچھ بھی کرتا رہے مجھے پروا نہیں۔ میں سب کے سامنے

ایک دن اپنی سنہری کو لال جوڑے میں لے جاؤں گا۔" شرجیل نے اپنی بانہیں سنہری کے کاندھوں پر رکھ دیں۔

"توبہ! آپ سے تو کچھ کہنا غضب ہے۔ آپ کو پتا ہے اماں کی پھپھو سے نہیں بنتی وہ..... نہیں کریں گی آپ سے شادی۔"

"ارے..... تو ان سے کر بھی کون رہا ہے۔"

شرجیل ہنسا۔

"اف! حد ہے۔" سنہری ہنس پڑی اور شرجیل کی بانہیں تھام لیں۔ شرجیل کی آنکھوں میں اپنے لیے ستائش اسے صاف نظر آرہی تھی اس نے نظریں جھکالیں۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"سنہری!" شرجیل نے اس کے قریب آکر اسے دھیرے سے پکارا۔ سنہری کی دل کی دھڑکن تیز ہوگئیں، اس نے اپنی گھنی پلکیں اٹھا کر شرجیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اتنا ڈرتی ہو..... کیا میرے بنا رہ سکتی ہو؟"

"آہ!" سنہری کی سانس اٹک گئی۔ وہ بے اختیار شرجیل کی بانہوں میں سما گئی۔ دو آنسو اس کے سینے میں جذب ہوئے تو شرجیل نے تڑپ کر اسے خود سے جدا کیا۔

"ارے! ایک تو تم لڑکیوں کو رونے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اب میری جان لو گی کیا۔" اس نے اپنے ہاتھ سے سنہری کے آنسو صاف کیے۔ "میرے بن رہ نہیں سکتیں تو بہادر بنو سنہری! ہمیں اپنے لیے فیصلہ لینا ہوگا۔ بڑوں کی انا کی جنگ میں ہم بچوں کا کیا قصور ہے۔ خود کو مضبوط کرو اور میرا ساتھ دو۔"

"میں ہوں آپ کے ساتھ۔" سنہری نے شرجیل کے ہاتھ تھام لیے اور دونوں مسکرا دیے افق پر پورا چاند ان کی محبت کا گواہ تھا۔

☆☆☆

گھر میں شادی کا ہنگامہ ختم ہوا اور سب مہمانوں نے بھی اپنے اپنے گھر کی راہ لی نجمت اور سنہری میں محض تین سال کا فرق تھا سنہری کے لیے بھی رشتے آنے لگے تھے لیکن وہ بضد تھی کہ گریجویشن سے پہلے اس سے کوئی اس سلسلے میں بات نہ کرے، لیکن جب بڑے تایا جان سمیر کا رشتہ لے کر آئے تو گھر والوں کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہ بچی۔

سمیر، پی آئی اے میں انجینئر، پڑھا لکھا نوجوان تھا اور پھر بڑے تایا جان کو کون انکار کر سکتا تھا۔ وہ خاندان کے بڑے تھے رومیسہ نے لاڈلی بیٹی سنہری سے پوچھے بنا ہی رشتے کے لیے ہاں کر دی اور اس کے لاسٹ سمسٹر کے بعد شادی کی تاریخ بھی پکی کر دی گئی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ کسی کو بھی کچھ سوچنے کا موقع نہ ملا۔

سنہری کے لیے تو یہ خبر کسی قیامت سے کم نہیں تھی لیکن ماں باپ کی عزت کی خاطر اس نے ہونٹ سی لیے۔ مگر شرجیل کہاں چپ رہنے والا تھا۔

رنگ بیل مسلسل بج رہی تھی تیسری کال پر سمیر نے کال پک کی۔

"ہیلو!" سمیر کی آواز پر دوسری جانب سے گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔

"سالے بے شرم! سب کچھ جانتے ہوئے بھی تو نے اپنی بھابھی کو رشتہ بھجوایا۔" شرجیل نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ارے! تو مجھ سے کس نے پوچھا؟ مجھے تو الٹا بتایا گیا تھا کہ بیٹا آپ کی شادی طے کر دی گئی ہے تو بھی مجھے بول رہا ہے وہاں دیبا میری جان کو رو رہی ہے بتا میں کیا کروں۔"

"دیبا.....؟ کون بڑے ماموں کی بیٹی؟"

"جی بالکل بڑے چاچو کی بیٹی دیبا۔" سمیر نے تائید کی۔

"اف..... یعنی تم اور دیبا..... ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو؟" شرجیل کو اب بھی یقین نہ آیا۔

"ارے! صرف پسند نہیں عشق ہے لیکن کسی کو اس بات کی خبر نہیں ہے اور نہ پروا۔" سمیر کا لہجہ اداس ہوگیا۔

"تو تم بتا کیوں نہیں دیتے سب کو؟" اس بار شرجیل سنجیدہ تھا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے یار! امی کو پتا ہے لیکن پھر بھی تقریباً سب طے ہو چکا ہے، خاندان بھر میں میری ماں مٹھائیاں بانٹ چکی ہے۔ میں ان کے آگے کر بھی کیا سکتا ہوں، اب کسی بات کا کوئی فائدہ نہیں۔" سمیر نے افسردگی سے کہا

"تو اس کا مطلب تم دیبا کو اس کے حال پر چھوڑ دو گے۔" شرجیل نے پوچھا

"ہاں! شاید اس کے ساتھ بھی وہی ہو جائے گا جو اکثر محبت کرنے والوں کے ساتھ ہو جاتا ہے۔"

شرجیل کو سمیر کے اس بزدلانہ جواب کی امید نہیں تھی۔

"یہ کیا بکواس ہے یار! مرد بن تو ایسے کیسے کر سکتا ہے دیبا کے ساتھ؟ میں کم از کم سنہری کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ سمیر اس طرح چار زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔" شرجیل کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا۔" سمیر نے مختصر جواب دے کر کال کاٹ دی۔

شرجیل کا دماغ بھائیں بھائیں کر رہا تھا، اس نے بائیک کی چابی اٹھائی اور فرید ولا کی جانب دوڑا دی۔

لاؤنج سے شرجیل کی تیز تیز بولنے کی آواز پر سنہری اپنے کمرے سے نکلی اور تیزی سے نیچے کی سیڑھیاں اتر گئی۔

"میری بیٹی کے لیے کیا بہتر ہے میں تم سے بہتر جانتی ہوں۔ تمہاری ماں روبا کو جتنا میں نے بھگتا ہے، تم کیا چاہتے ہو میری بیٹی بھی سہے۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔"

رومیسہ کی باتیں سنہری ٹوٹے دل کے ساتھ ڈرائنگ روم کے دروازے کے ساتھ لگ کر سن رہی تھی۔ رومیسہ سے مایوس ہو کر شرجیل نے ماموں کے پاؤں تھام لیے۔

"خدا کے لیے ماموں جان! آپ تو کچھ بولیں۔ آپ نہیں جانتے سمیر بھی اس رشتے سے خوش نہیں ہے، وہ دیبا سے پیار کرتا ہے۔" شرجیل کی بات سن کر سنہری نے دل تھام لیا، ایک آہ اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی۔

"توبہ ہے لڑکے! کتنی دیدہ دلیری سے تم سمیر پر الزام لگا رہے ہو، تمہیں شرم آنی چاہیے۔" رومیسہ پھر چلائیں مگر شرجیل نے انھیں نظر انداز کیا۔

"ماموں پلیز، یہ سنہری کی زندگی کا سوال ہے بولیں کچھ....." لیکن فرید احمد نظریں جھکائے خاموش رہے۔

"ارے..... یہ کیا بولیں گے۔" رومیسہ تنک کر بولیں۔ "اب تم نکلو یہاں سے، اگلے ہفتے سنہری کی مایوں ہے آجانا بچے۔"

سنہری سے شرجیل کی اتنی ہتک برداشت نہ ہوئی اور وہ دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی۔

شرجیل ابھی بھی نم آنکھیں لیے اپنی محبت کی بھیک مانگنے فرید احمد کے قدموں میں بیٹھا انہیں امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بہت ہو گیا۔" سنہری کی آواز پر سب چونک گئے۔ "میں محبت کی مزید تذلیل برداشت نہیں کر سکتی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ "آپ چلے جائیں شرجیل! اور اب کبھی یہاں کا رخ مت کیجیے گا، میں آپ کو اپنی محبت کے بندھن سے آزاد کرتی ہوں۔"

سنہری کی بات پر شرجیل تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے کہا تھا تم میری ہو، میں نے وجود سے نہیں تمہاری ذات سے عشق کیا ہے۔ محبت اپنا راستہ اس ہی دل تک بناتی ہے جہاں اس کی دھڑکنوں کو قرار ہو۔ میں اب پوچھوں گا نہیں کہ مجھ سے شادی کرو گی، آج یہ بتانے آیا ہوں اگلے ہفتے برات لے کر آ رہا ہوں تیار رہنا۔ سب کے سامنے اٹھا لے جاؤں گا جس نے جو کرنا ہو کر لے۔"

شرجیل نے شعلہ بار آنکھوں سے رومیسہ کو دیکھا اور بائیک کی چابی اٹھا کر گھر سے نکل گیا۔

سنہری بے جان ہو کر زمین پر ڈھے گئی۔

☆☆☆

عید سنہری کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کل اس کی مایوں تھی، گھر سے جانے کے بعد شرجیل کی نہ کوئی کال آئی نہ میسج اور نہ ہی سنہری نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ آج اپنے موبائل پر دیبا کا نمبر دیکھ کر وہ چونک گئی۔

"ہیلو!" کال ریسیو کرنے پر دوسری جانب سے دیبا کی سسکیاں سنائیں دیں۔ سنہری جانتی تھی محبت کیسا روگ ہے نہ یہ جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔

"دیبا..... پلیز تم جانتی ہو ان سب میں میرا قصور نہیں ہے۔" سنہری نے تھکے لہجے میں کہا۔

"ہاں میں جانتی ہوں، قصور بس قسمت کا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ سمیر نے گھر والوں کے آگے ہار مان لی۔"

"تو کیا سمیر نے کوئی کوشش نہیں کی اپنی محبت کو بچانے کی؟" سنہری نے حیرت سے پوچھا

"کی تھی، تمہارا رشتہ بھیجنے سے پہلے تائی امی اور چچی جان کی بات ہوئی تھی جو سمیر نے سن لی تھی۔ چچی جان سے پھپھو پہلے ہی تمہارا رشتہ شرجیل کے لیے مانگ چکی تھیں جس پر چچی جان نے ان کی خوب بے عزتی کی اور پھر اگا فون انھوں نے تائی امی کو کیا اور تم تو جانتی ہو تائی امی بھی پھپھو سے کم بغض نہیں رکھتیں۔ سمیر نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن بس ہماری محبت بڑوں کی انا کے آگے ہار گئی۔ سمیر نے مجھے ساری بات بتا دی تھی کہ کوئی ہماری نہیں سنے گا۔"

"ہاں! یار تو ہم سب ہی گئے ہیں دیبا!" سنہری نے نم آنکھوں سے کہا۔ دونوں دیر تک اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہیں۔

☆☆☆

آج سنہری کی شادی تھی لیکن نگہت نے نوٹ کیا سنہری خاموش اور افسردہ ہے نہ ہی شرجیل نے اب تک کسی فنکشن میں دل کھول کر حصہ لیا تھا اور دیبا بھی بجھی بجھی تھی یہ اس کے لیے خلاف معمول بات تھی کیونکہ وہ سب کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی ان میں سے کوئی بھی نچلا نہیں بیٹھتا تھا۔ شرجیل، دیبا اور سنہری تو ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔

"کیا بات ہے شرجیل؟" نگہت نے برات آنے سے پہلے شرجیل کو پکڑ لیا۔ "دوست کی شادی پر اتنا غم، یہ بڑھی ہوئی شیو، یہ اترا ہوا منہ!" اس نے مسکرا کر شرجیل کو چھیڑا۔

"کون دوست!" شرجیل نے سنجیدگی سے نگہت کی آنکھوں میں دیکھا، وہ ایک لمحے کے لیے سہم گئی۔

"بھئی..... سنہری اور سمیر دونوں ہی تمہارے دوست ہیں۔"

"نہیں! سنہری میرا عشق ہے اور سمیر اب میرا رقیب ہے اور آپ سب محبت کی بربادی کے تماشائی ہیں۔" شرجیل نے بائیک کی چابی گھمائی اور نگہت کی آنکھوں میں حیرت چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سنہری دلہن کے لباس میں کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو حسرت سے دیکھ رہی تھی، ذہن نجانے کن سوچوں میں گم تھا۔

"یہ سب کیا ہے سنہری!" نگہت کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

"کیا..... میں سمجھی نہیں۔" سنہری نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"میں شرجیل کے بارے میں پوچھ رہی ہوں، اگر تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے تو گھر والوں کو کیوں نہیں بتایا؟"

"ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں آپی!" سنہری کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ "پھپھو سے امی کی جلن نے چار زندگیاں برباد کر دی ہیں۔ شرجیل کو سمیر کا دشمن بنا دیا ہے اور مجھے دیبا کا مجرم! سمیر اور شرجیل نے اپنی سی کوشش کر لی لیکن..... شاید میری قسمت میں کسی

اور کی پسند کا ناپسند بننا لکھا تھا۔"

سنہری نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔

"واہ! محبت پہ آزمائش آئی تو اسے قسمت کا نام دے کر ہار مان لی میری بہن نے۔" نگہت نے سنہری کے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے گلے سے لگالیا۔

سنہری پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کچھ دیر بعد نکاح نامہ دستخط کے لیے مجلہ عروسی میں لایا گیا، سنہری نے شرجیل کے خیالوں میں گم دستخط کیے، وہ زار و قطار روتی رہی۔

"تم صرف میری ہو۔" شرجیل کے الفاظ اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔ کب وہ رخصت ہو کر پہلے سے بک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئی، اسے پتا نہ چلا۔

وہ بھی سنوری پھولوں سے لدھے کمرے میں سر جھکائے تنہا بیٹھی تھی کہ کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سنہری اور بھی سمٹ کر بیٹھ گئی، اس نے سختی سے آنکھیں بند کرلیں۔

کوئی اس کے پاس بستر پر آبیٹھا۔ سنہری نے اپنے ہاتھوں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ کسی نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور ٹھوڑی کو ہاتھ سے ہلکا سا اوپر کی جانب اٹھایا۔ سنہری کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

"چشم بد دور....." شرجیل کی آواز پہ سنہری نے چونک کر آنکھیں کھولیں، شرجیل کو سامنے دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی

"آپ.....؟ آپ یہاں کیوں آئے ہیں شرجیل! پلیز چلے جائیں کوئی دیکھ لے گا۔"

سنہری پریشان ہوگئی۔

"جس کو دیکھنا ہے دیکھ لے، آج میں بھی سب کو دیکھ لوں گا۔"

شرجیل نے جوتے اتارے اور بستر پر دراز ہوگیا۔

"پلیز! اب میں کسی کی بیوی ہوں، آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔" سنہری روہانسی ہوگئی۔

"ہاں! تو آلینے دو اپنے شوہر کو، آج اس سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں..... ویسے کیا نام ہے تمہارے شوہر کا....." شرجیل نے آنکھیں گھمائیں۔

"یہ کیسا سوال ہے، آپ جانتے ہیں میری شادی سمیر سے ہوئی ہے۔" سنہری نے بے زاری سے کہا۔

"اچھا..... لیکن دستخط تو تم نے شرجیل کے نکاح نامے پر کیے ہیں۔" شرجیل نے اس کی آنکھوں کے سامنے نکاح نامہ لہرایا۔

"کیا.....؟" سنہری نے اس کے ہاتھ سے نکاح نامہ لے کر غور سے دیکھا۔ واقعی وہ شرجیل کے ہی نکاح میں آئی تھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"یہ..... یہ....." سنہری کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"اس دن، آپ جانے کے بعد تو میں نے دعائیں مانگنی چھوڑ دی تھیں۔ مجھے کیا پتا تھا اب بھی آپ کا دل میری محبت کے سجدے میں ہے۔"

شرجیل نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرادیا۔

"چھوٹے ماموں نے تمہاری اور نگہت آپی کی ساری باتیں سن لی تھیں اور پہلی بار وہ سب کے سامنے بولے اور خوب بولے۔ مجھے فوراً سمیر کی جگہ دولہا بنایا گیا اور تمہیں سرپرائز دینے کے لیے سب چھپایا گیا۔ تم نے نکاح نامے پہ دستخط کرتے ہوئے بھی نام پر غور نہیں کیا۔" شرجیل نے قہقہہ لگایا۔

سنہری اسے ہونقوں کی طرح دیکھ رہی تھی شرجیل کی آنکھوں کے حصار سے بچنے کے لیے اسے کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر شرجیل کی نگاہیں جمی تھیں اور تمام عالم عشق وجد میں تھا شرجیل نے اسے گلے لگالیا۔

"یقین کریں بیگم صاحبہ! اب آپ آفیشلی اس خوب صورت نوجوان کی تاحیات اکلوتی بیوی ہیں۔" سنہری نے پرسکون ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹی میں؟" شرجیل نے سنہری کی یادوں کا طلسم توڑ دیا۔

بیس سال بعد سفید بالوں اور آنکھوں پر عینک لگائے شرجیل کو دیکھ کر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

☆☆